اب تک
ظفر اقبال
تجدید • تقویم • تشکیل
تجاوز • توارد • تساہل
کلیاتِ غزل
جلد سوم

## کُلّیاتِ غزل

(جلد سوم)

## ظفر اقبال

معیاری اُردو زبان اور
دُرست املا کا محرک
اشاعتی ادارہ

MULTI MEDIA
AFFAIRS



آب تک: ظفر اقبال (کُلیات) جلد سوم

ISBN:969-8483-39-X

اہتمام:

ایچ اے شیرازی

میاں جاوید اقبال ارائیں

اشاعت اوّل: 2006ء

ٹائٹل: ریاظ

کمپوزنگ: اعظم علی شاد

مطبع: حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز

ناشر: ملٹی میڈیا افیئرز

قیمت: 700 : روپے

$: 40

£: 30

€: 35

MULTI MEDIA
AFFAIRS

21-Nand Street, Sham Nagar, Chowburji,
Lahore-54500, Pakistan.
Tel: (92-042) 7356454 Mobile: 0333-4222998
E-Mail:multimediaaffairs@hotmail.com

شمس الرحمٰن فاروقی کے نام

غالبؔ بہ فنِ گفتگو نازد بدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

یُوں تو ہم کچھ بھی نہ تھے مثلِ انار و مہتاب
جب ہمیں آگ دکھائی تو تماشا نکلا

# قرینہ



## تجدید

## تقویم

## تشکیل

## تجاوز

## توارد

میں بظاہری بس ادھورا ہوں 2168
بچا کھچا یہ دل اس پہ نثار کرتا ہے 2169
اُدا جو عکس تو اس میں کوئی اشارہ بھی تھا 2170
آنے کی اب نہ کچھ وہاں جانے کی بات ہے 2171
اندھیرے سے پہلے یا اُجالا ہونے والا تھا 2172
اتنا کچھ ہو کر بھی پہ گنجائش باقی رہ گئی تھی 2173
اس مکان و زماں کے تھے ہی نہیں 2174
بے اگرا اپنے آر پار میں کچھ 2175
یہ آنکھیں چوم سکتا ہوں کہ ماتھا چوم سکتا ہوں 2176
کچھ ہماری یاد ہو، اور کچھ تمہارا شور ہے 2177
کسی خواب نے ان آنکھوں سے اوجھل ہو جانا تھا 2178
اس پہ کوئی دعویٰ تو ہمارا بھی نہیں تھا 2179
یہ بھی کچھ کوئی پہ انداز دگر چاہتے ہو 2180
سپاہِ اہلِ دشمشیر ہے اللہ اکبر 2181
یہ بھی نہیں کہ ہم کو محبت نہیں ملی 2182
وہی رنگ دل ہے مگر، رنگِ دنیا کہاں رہ گیا ہے 2183
جھلکو ہے دیکھو کہ ستارہ ہے پھولوں میں 2184
وہ تو کریں گے طلب ہر گئے پل کا حساب 2185
بڑھتا ہوا اجرا ایک طرف سے اندھیرا ہوں 2186
کیا ہوئے آنسوؤں کے ہار پرونے والے 2187
خدا ہے بھی اگر تو ماورا کے کس طرف ہے 2188
وہ پھول ہو کہ شرارہ، وہ اِدھر سے آتا ہے 2189
تنی ہوئی کوئی چادر سی آ بچھا رکھی تھی 2190
بتاؤں کس طرح تصویر اس کے عکس عریاں کی 2191
بار بار اتر یہ حالت ہوتی ذاتی چاہیے 2192
میں یہ سوچتا ہوں سوار کوئی غبار میں نہیں رہ گیا 2193
نہیں داؤ کوئی بھی کارگر، کسی چال میں نہیں آرہا 2194
جگہ پاگلے تو اپنی رسائی میں نہیں تھا 2195
کوئی عیش، کوئی نشاط اب خبر سے نام کا نہیں رہ گیا 2196
رہے ہم آپ بھی اس کو بھی قیل و قال میں رکھا 2197

آنا جانا کہیں نہیں اپنا اب اور مگر دیکھو 2198
دیر کا سویا ہوا رنگ ہوا جاگ اٹھا 2199
مانگا نہیں سہارا انہیں نے 2200
یہ حضوری جو ہے علی صاحب 2206

## تساہل

○ انتساب 2208
دیواری در کچھ دور کے بغیر ہو 2209
فارغ ہوں دل سے، اور دعا کے بغیر تھا 2210
رہتے نہیں زیادہ وہ کم کے بغیر تم 2211
چلتا ہے سلسلہ سخن وقت کے بغیر کب 2212
اس مسئلے کو دیکھا حل کے بغیر کچھ 2213
بے حال ہیں جو حال زبوں کے بغیر ہم 2214
اہلِ وطن بھی ہوں تو وطن کے بغیر ہوں 2215
گرے پڑے ہوئے دن رات سے گزرتے ہوئے 2216
میں خلقِ ستم وجور سے گزرتے ہوئے 2217
ہوا سے تند صفت چال سے گزرتے ہوئے 2218
سکوں ملا کسی طوفان سے گزرتے ہوئے 2219
جلیں گے آ کے مری خاک سے گزرتے ہوئے 2220
کہیں کہیں روش و رنگ سے گزرتے ہوئے 2221
بہت رہا ہوں بڑے داؤ سے گزرتے ہوئے 2222
پتا چلا کوئی گرداب سے گزرتے ہوئے 2223
ابھی کہاں ہوں نئی آرام سے گزرتے ہوئے 2224
سہولت آئے گی دشوار سے گزرتے ہوئے 2225
ستارہ وار گزرتا نہیں دکھائی دیا 2226
وہ رنگ شور شرابا نہیں دکھائی دیا 2227
کوئی افسوں، کوئی جادو نہیں دکھائی دیا 2228
وہ چاند، اور وہ ہالہ نہیں دکھائی دیا 2229
یہی نہیں کہ کنارہ نہیں دکھائی دیا 2230
ہمارے ساتھ میں کاسہ نہیں دکھائی دیا 2231

کوئی اشارہ کنایہ نہیں دکھائی دیا 2232
کوئی چلن، کوئی چارہ نہیں دکھائی دیا 2233
سمجھ رہے ہیں کہ افلاک سے لگے ہوئے ہیں 2234
وہی تھے جو کبھی انجیل سے لگے ہوئے تھے 2235
ہمارے ساتھ وہ مجبور سے لگے ہوئے تھے 2236
بظاہر آپ جو سہو سے لگے ہوئے ہوں 2237
ہمارے دل پہ جو تاخیر سے لگے ہوئے ہیں 2238
ظفر کسی کے طلسمات سے لگے ہوئے ہو 2239
یہی نہیں کہ خدوخال سے لگی ہوئی ہے 2240
یہ ہم جو سلسلہ خواب سے لگے ہوئے ہیں 2241
جو مانتا ہے ترے نام سے لگا ہوا ہے 2242
تری ہی دی ہوئی تکرار سے لگا ہوا ہوں 2243
ہر شے آتی جاتی کر 2244
بیٹھا ڈھنڈ مچائی کر 2245
ساری گئی گنوائی کر 2246
خدمت کوئی بتایا کر 2247
خلقِ سخن کاوائی کر 2248
خوشبو کا ایک رنگ مہکتا ہے اور بس 2249
دل سے خیال سادہ گزرتا ہے اور بس 2250
چھلکتا ہے اور تہ گل کے برستا ہے اور بس 2251
دنیا میں آئے ہیں تو یہ دنیا ہے اور بس 2252
وہ بھی زیادہ وہ تر تو بتایا ہے اور بس 2253
اس رات کی رگوں سے گزارا ہے اور بس 2254
رنگ ایک دوسرے میں ملاتا ہوں اور بس 2255
منظر کوئی ہوا کا دکھاتے ہیں اور بس 2256
پانے سے پہلے ہی اسے کھوتا ہوں اور بس 2257
اپنے ہی آپ سے یہ جھگڑتی ہے اور بس 2258
کرتا ہے جو آپی کر 2259
ماسی کر یا ماسی کر 2260
پوری کریا آدھی کر 2261

تازی کریا باسی کر 2262
ہو سکتا ہوں، کہاں کر 2263
ہیئت کوشش میں تھا قرآن سارا 2264
اٹھا کر عشق میں نقصان سارا 2265
متاع لے گئے دیوان سارا 2266
کریڈٹ لے گئے تاوان سارا 2267
یہ سر میں شور، یہ خلجان سارا 2268
نکلتا ہی نہیں ارمان سارا 2269
اگر چہ مجھ سے خدر یافت ہو گئی دنیا 2270
جو مجھ سے پوچھتا کوئی تو ہے عجب دنیا 2271
جو کام اپنے ہیں اتنے ہیں تیز تر دنیا 2272
جو میرے ساتھ کوئی دن گزارتی دنیا 2273
ابھی تو دیکھ سکا ہوں یہ سرسری دنیا 2274
کہاں مرے لیے گھر اصطفیٰ پھرے دنیا 2275
مجھی رہے گی کہاں تک نہ یوں چھپا دنیا 2276
کھڑی ہے اپنے کسی اختیار پر دنیا 2277
عجب نہیں جو ابھی خواب ہے، ابھی دنیا 2278
کبھی کبھار جو ہوتی ہے ڈوبتی دنیا 2279
جہاں جو بکھری ہوئی ہے جہاں تہاں دنیا 2280
خوشبو سے گل بدن جو مرے اردگرد ہے 2281
کیسے کرے اثر جو مرے اردگرد ہے 2282
اتنی یہ بادِ نو جو مرے اردگرد ہے 2283
یہ بانہ ہوں جو مرے اردگرد ہے 2284
گردش میں کم زمیں جو مرے اردگرد ہے 2285
سب کچھ بہم کروں جو مرے اردگرد ہے 2286
طومار شش و کم جو مرے اردگرد ہے 2287
انبارِ این و آں جو مرے اردگرد ہے 2288
اٹکل یہ جا بجا جو مرے اردگرد ہے 2289
تاریک روشنی جو مرے اردگرد ہے 2290
نا آشنا ازل سے، ابد کے بغیر ہے 2291

☆

''ہمارے نزدیک ادیب کی قدر کا پیمانہ یہ ہے کہ جب تک اس کی تحریریں پڑھ کر لوگوں کو غصہ آئے گا، بے چینی ہوگی، شرم آئے گی، نفرت ہو گی یا محبت ہوگی، وہ زندہ رہے گا۔۔۔''

# خیال خلقی اور زُبان انتظاری کی شاعری

اگر کسی بڑے شاعر کے ہاں شہرت عام اور بقائے دوام کی تمنائیں مفقود ہوں تو اس امر کے مصدق ہونے میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ اُس کی شاعری زندگی کی ماہیت سے ہم آہنگ ہو چکی ہے۔ زندگی کہ جو عروج و زوال کے انواعی اقسامی تیوروں سے مزین دوامی سفر میں مشغول رہتو ہے۔ خالق شعر اگر معاملات شناخت و اعتراف سے بھی بے نیاز ہو تو عناصر کے ترتیبی ظہور یا اجزا پریشانی کے سجاو زمانی مکانی منطق سے آزاد فطرتی آئینہ بندی کے رہین ٹھہرتے ہیں۔ فطرت کی رنگ بدلتیاں اور زندگی کی اوج پستیاں طبع شاعر کے خصوصی وتیروں میں سرایت و شامل ہو کر اسے مسلسل بکھراؤ کو سمیٹنے کا ذوق عطاتی ہیں؟ اسے ''نشانِ نقشِ نظارہ یکسو'' بھی رکھتا ہے اور اسی اثنا میں وہ پریشان تماشا بھی رہتا ہے۔ یعنی خانہ خاموش میں اک فضول شور و غوغا۔ بعض لوگوں نے غزل میں بہت دھوم مچائیں اور کبھی اپنی راہ سے باہر نہ جا سکے! باہر سے تعمیر سر بلند رہی اور اندر سے اسی حساب مسمار! خس و خاشاک کو شعلہ رواں کی تمنا نے متحرک کر رکھا ہے۔ آب رواں کے بعد ظفر اقبال تیزی سے بہتے پانی سے فیض یاب ہو رہے ہیں کہ مثنوی مولانا روم کی دفتر سوم کی حکایت معنی خیز ہے کہ ایک بچھیرا اپنی ماں کے ساتھ پانی پی رہا تھا۔ قریب ہی لوگ سیٹیاں بجا رہے تھے، وہ ان کی آواز سے بدکتا تھا۔ ماں نے استفسار اتو اس نے جوابا کہ مجھے سیٹیاں ڈرا رہی ہیں۔ ماں بولی، دنیا کے آغاز سے فضول کام کرنے والے موجود ہیں۔ تُو اپنا کام کر کہ جو پانی تیزی سے بہتا چلا جا رہا ہے، صرف اس پر نظر رکھ!

ظفر اقبال نے زندگی کے آب رواں سے پانی پینا تھا، سو وہ پی رہا ہے۔ سیٹیاں بجاتے نقادوں سے وہ بدکتا تو ظفر اقبال نہ کہلاتا۔ اُسے معلوم تھا کہ پانی تیزی سے بہتا چلا جا رہا ہے، اسے صرف اس پر نظر رکھنی ہے۔ ''آب رواں، گلافتاب، رطب و یابس، غبار آلود سمتوں کا سُراغ، سرِ عام، عیب و ہنر، وہم و گماں، اطراف، ہے ہنومان، تفاوت، ترتیب اور تماشا'' میں شاعر کے تصوّرِ شعر و زُبان کو سمجھنے کے لیے اُن کے ان خیالات کو دیکھیے:

ہمارے شعر ہیں پر نہ کمل سکیں شاید
ڈرے ہوئے ہیں کچھ ایسے قبول عام سے ہم

☆

سخن سرائی تماشہ ہے شعر بندر ہے
شکم کی مار ہے شاعر نہیں چھندر ہے

☆

مری غزل مرے دوزخ کا ایک شعلہ ہے
کہ آگ پھانکتا ہوں آگ ہی اُگلتا ہوں

☆

ڑبانہ رکھتا ہوں منہ میں ظفر بجائے زباں
تمھیں کہو مرے آگے یہ خار و خس کیا ہے

☆

آب رواں کی شاعری کے بارے میں ظفر اقبال نے کہا ہے کہ انھوں نے ضمناً کچھ باتیں سمجھنے کی کوشش کی ہے۔

اُن کی اُلجھن رُوحانی بھی ہے اور سیاسی بھی۔ مسائل کے حل کے لیے ذات کے چیستاں کو حوالہ بنایا ہے۔ اُنھوں نے صعوبتوں کے دلچسپ سفر کے دھند لکے اور دُھندلاہٹیں اور ہواؤں پر لکھے اُلجھے سیدھے مناظر قارئین کے گوش گزار کیے۔ اس مجموعے میں دُھوپ، ریت، غبار، دھول اور آب کی مناسبتوں اور ہم جہتی استعاروں کے حوالے سے ظفر اقبال نے اپنی رمزوں بھری گہری شاعری کا لوہا منوایا۔ یعنی اُنھوں نے مصحفی کے مانند گل سُرخ پوش کو چمن میں پا کر رات کو سرو و سمن کے اندر شعلہ سا پھرتا دیکھا، دکھایا۔

گلافتاب کا ذیلی عنوان غالب کا ایک شعر ہے کہ اگر اور اک معنی کا سرو برگ نہیں ہے تو بھی

صورت کے نیرنگ کا تماشا تو قائم ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے اس مجموعے میں استعمال ہونے والی زبان کو کھچڑی زبان یا کریولکاری (creolisation افریقی۔ یوروپی زبان کے ملاپ سے تیار شدہ زبان) سے تعبیر کیا ہے۔ اسے انھوں نے زبان کے حدود وسیع کرنے کی کوشش کا نام دیا ہے۔ افتخار جالب نے گلافتاب کے معنوی اسالیب کو اساطیری منہاج کی پردہ زنگاری سے جلوہ قلق کا نام دیتے ہوئے اس کی تمثالوں کے باہم دگر پیوست اشتراکی حسی، صوتی، صوری معانی کو نمایاں کرتے ہوئے اس امر پر خصوصی توجہ دی ہے کہ زبان محض ذریعہ اظہار ہی نہیں ہے، خیالات و جذبات کی تشکیلی جنم بھومی بھی ہے۔

ظفر اقبال کی شعری طریقت میں استعاراتی اسلوب کی نیرنگیاں تلاش کرنی ضروری ہیں تا کہ عقدِ ثریا کی پہچان ممکن ہو اور دیکھنے والی آنکھ فلک منظر کو انتشار کا نام نہ دے سکے۔ تجرید، زبان اور مزاج کے باہمی عمل و ردِ عمل سے تخلیق پانے والا یہ شعری مجموعہ اپنی انفرادیت میں لاثانی ہے اور لاثانی رہے گا کہ اس کے بعد ظفر اقبال کو اس سے آگے کا سفر بہ قلم خود طے کرنا تھا۔ اس مجموعے میں وصل و ہجر کے روایتی مضمونوں پر غزل کی عمارت کھڑی نہیں کی گئی۔ تلازمات کی روایتی زنجیروں کو توڑنے کا کام بھی کیا گیا ہے، شعر تو کی اثر پذیری عروج پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے شعری گاڑی کو محض روایتی قافیوں کے پٹرول سے چلانے سے گریز کیا۔ ان کی نوک زبان پر لہو لفظ پھرتا ہے اور وہم و گماں میں بدن بات جھلملاتی ہے۔ عقل میں اختور کی بدولت شاعر سیدھے سادے اشعار کے دائرے سے باہر نکلا ہے۔ ظفر اقبال نے پانی پرانی منجمد ایشن کو پیٹنے کا جو کام کیا ہے، اس سے افکار کی نئی نئی چندنی کے آثار ہویدا ہوئے ہیں۔ اس کتاب کو ظفر اقبال نے اردو مستقبل کا خواب نامہ کہا ہے۔ پنجابی، انگریزی، بنگلہ اور اردو کا درمیانی فاصلہ کم کرتے کرتے لفظوں کی دشوریش اردو زبان کو نئی تازگی سے ہمکنار کر گئی ہے۔ بہ قول ڈاکٹر گوہر نوشاہی، اس کتاب کا اتحاد و تلازمہ "لفظ، وجود اور زمین" میں دیکھا جانا چاہیے۔ ژولیدہ فہم لسانی استعارے نے معنوی غتربود میں جو کردار ادا کیا ہے، اس مجموعے کی بدولت اس کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے۔ رطب و یابس کا آغاز غالب کے فارسی اشعار سے کیا گیا ہے کہ کاش تو غور کرے کہ یک قلم نقل معنی کے لیے کلک کا جلوہ دار درس رقم کرے گا۔ اندھی آنکھ ہاتھ میں آئینہ دعویٰ پکڑے گی اور شل ہاتھ شاعری کے حقیقی تزئین کار ثابت ہونے والے ہیں۔ لیکن تمنا، آرزو، خواہش، جذبہ، ماورائی

خیال، غیر منطقی فکر اور موضوعی جست وغیرہ کی موجودگی میں انھیں ایسی فکر کا داعی کہنا کہ جس میں سے ماورا اور ماورائیت کے اخراج کی شعوری کوشش کی گئی ہو، کسی بھی صورت روا نہ تھا۔ افتخار جالب کی اس فارمولیشن کو تمنا کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے، تاہم رطب و یابس کا آغاز نعت سے کر کے ظفر اقبال نے منطقی اثباتیت کی میکانکی منطق کی کھلے بندوں مخالفت کی ہے۔ یوں بھی شاعری منطقی اثباتیت کے عقلی دائرۂ کار سے باہر کی شے ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی نے ظفر اقبال کی شاعری میں موجود طنز کو اردو شاعری کی قدیم روایت سے جوڑا ہے اور پیراڈوکس کے حوالے سے متضاد و متخالف کی فنکارانہ یکجائی کو ان کے غیر تقلیدی خصوصی رنگ سے تعبیر کرتے ہوئے ان کی ادبی ساخت شکنی اور بول چال کی زبان کے نئے استعمال کو ان کا اوریجنل رنگ قرار دیا ہے۔ خیال خلقی اور زبان انتشاری کی شاعری۔

عہدِ جدید میں سیلابم اور ابسرڈ کو ملانے والی ادبی رووں نے زندگی کی ہمہ گیریت کو احاطہ تحریر میں لانے کا جو کٹھن کام کیا ہے، اس کی بدولت بلند کی بلند تری اور پست کی پست تری کے بے شمار جلوے شعر و ادب کی زینت بنے ہیں۔ کائناتی عروج و زوال کی زمینی آسمانی اوراق پر مرقومہ کہانی صاحب بصیرت کو فکر کی نئی منزلوں کی جانب لے جاتی ہے۔ وہ مروجہ اثبات سے گریزاں نفی کے رہوار پر سوار نئے اثباتی تناظر گرفت میں لیتا ہے۔ یوں تو ادبی دنیا میں سدرۃ المنتہا اور تحت الثرا کے مابین فکر و خیال کی گردشیں کئی رنگوں میں سامنے آ چکی ہیں اور تمنا کے دوسرے قدم کی تلاش اور ستاروں سے آگے کے جہانوں کی نشاندہی کے معاملات بھی نوک قلم کی زینت بن چکے ہیں لیکن جستہ جستہ منطق و تخیل کے ہاتھوں بہت کچھ پردۂ اخفا میں بھی رہ گیا ہے۔ جب کسی شاعر کے اندر زمین و آسمان شور کرنے لگیں، اسے ان کے گرد اڑتی نظر آئے، وہ کہنگی اور خستگی سے مملو دکھائی دیں، اپنی روز مریت میں وہ اسے سسکتے ہوئے تنگ، مجبور اور تھکے ہارے لگیں اور اپنے پاس سے گزرتی کائنات سے بے خبر نئے خلاؤں میں گم ہوتے چلے جائیں تو اس کا تشویش میں مبتلا ہونا ناگزیر ہے۔ یوں اچانک کئی سوالوں اور خدشوں میں گھرا شاعر زمینی آسمانی تناظر میں اشیا، انسان اور کائنات کی نئی تعبیروں کے تعاقب میں مصروف و مغروق نظر آنے لگتا ہے۔ خوابوں میں چلتے چلتے رک جانے والے زمین و آسماں خوابوں سے باہر چکرائے، بکھرائے، خوں نہائے، اونگھائے، شیر و شکر ہوئے ہیں۔ جھومتے متوالے یہ خلائی پیراک

فسادی، آفت کے پرکالے اور ان دیکھے بھالے بھی ہیں۔ یہ خاص ترکیب وترتیب کے حامل بے منزل سفر کے مسافر ہیں۔ زمینی آسمانی تناظر میں زمانی مکانی جستا جستی نے ظفر اقبال کو اپنے تمام معاصرین سے ممتاز و ممیز کر دیا ہے۔ انھیں جذبے اور خیال کی جستا جستی طولی عرضی مسافتیں مرغوب ہیں۔ سدرۃ المنتہا سے تحت الثریٰ کے درمیان گرداں ترفعیاتی لایعنیت کا پنڈولم زندگی اور انسان کی بوالعجبیوں کا آئینہ بنا ہے۔ جان مارمائیسرا اپنے مضمون Humor, Sublimity and Incongruity میں بوناونتورا کے حوالے سے لکھتا ہے:

> "Is there upon earth a more potent means
> than laughter to resist the mockeries of
> the world and of fate?"

پھر وہ رقم طراز ہے کہ کریٹیک آف ججمنٹ میں کانٹ نے قہقہے کو خوب صورت کی ذیلی قسم کہا ہے۔ اس تقسیم کے باوجود قہقہے کی مسرت کو فیکلٹیز کی ہم آہنگی میں لوکیٹ کرنے کے بجائے اس ''جسمانی مسرت'' میں دیکھتا چلا جاتا ہے جو ''جسم کے بنیادی اعمال کو بڑھاتا ہے۔'' یہاں قہقہے بارے کانٹ کا خیال فی الحقیقت برک کے نظریہ ارتفاع کی یاد دلاتا ہے۔ فی الحقیقت جب ہم مختلف ''ہنساتے احوالیوں'' کی میکانزم کو دیکھتے ہیں تو یہ باور کرتے ہیں کہ حسین اشیا کے وجدان میں پائی جانے والی بے ساختگی کی نمائش کے بجائے قہقہے میں غیر متوقع یا ابسرڈ کے خلاف ایک پُرشور کنفرنٹیشن ملتی ہے۔ مزاحیہ قہقہہ ان غیر متوقع حرکتوں کی مسرت انگیز تعبیر سے ممکن ہوتا ہے۔ غیر متوقع تزاعات کو اصول مسرت کی مناسبت سے ہم سے منسلک کرنے سے مزاح نویس بنیادی طور پر ایک ذوق سلیم سے منافی حال کو قہقہے کے موقعے میں منقلب کرتا ہے۔ یوں مزاحیہ قہقہہ ایک ایسے ارتقائی تجربے سے متعلق ہے جس میں بنیادی طور پر ایک ناخوشگوار ادراک ایک مسرت انگیز تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ تاہم جہاں ترفع حیرت اور توقیر کے احساسات سے مملو ہے، مزاحیہ قہقہہ برتری اور توہین کے غیر متواتر احساسات سے منسلک ہے۔ یہ فرق اس حقیقت کا نتیجہ ہے کہ ترفع کسی فرد کا اپنی معصیت کے ادراک کا موثر رسپونس ہے جب کہ مزاحیہ قہقہہ مدرکہ نامعصرت کا شاخسانہ ہے۔

کانٹ اس ترفع کو دنیا کی اشیا کے بجائے انسانی ذہن میں لوکیٹ کرتے ہوئے درست تھا۔ مزاح کے لیے بھی یہ صحیح ہے۔ نہ صرف یہ کہ ہم ان کی زیادہ عزت کرتے ہیں جو دنیا کو مزاحیہ یا ارتقائی انداز سے دیکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں بلکہ ہم خاص طور ان کی قدر و منزلت کرتے ہیں جو اس قسم کی تعبیروں کو پیشکش اور ابلاغ کی کوشش کرتے ہیں۔

گو ظفر اقبال کا اپنا عقیدہ یہ ہے کہ انھیں شاعری کے شایان شان پیرائے کی تلاش ہے اور اس ضمن وہ شعر کی نہ ہاتھ آنے والی تتلی کا بے سود تعاقب کرتے ہیں۔ ان کی تلاش و تشویش ہی ان کے شعر کہنے کا جواز ٹھہرتی ہے۔ بہرحال ایسا ہرگز نہیں ہے کہ ان کے تازہ مجموعے ہی کو حتمی مان کر ہم ان کے ماقبل کے کلام کو منسوخ و مسترد سمجھیں اور ''شعر لکھتا ہوں مٹانے کے لیے'' کو مان کر ان کے کیے کرائے پہ پانی پھیر دیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کی شعری تانوں کا پلٹاؤ گلافتاب اور رطب ویابس کے زمزموں سے فیض پاتا ہوا آبِ رواں کی طرف ہی ہوتا ہے۔ یہ بنیادی کتاب ان کی خیال آفرینیوں کا سرچشمہ ٹھہری ہے۔ ظہار آلود ستوں کا سراغ، سرِ عام، عیب و ہنر، وہم و گماں اور اطراف میں ظفر اقبال کی عرشی فرشی خیال تانوں کے پلٹاؤ آبِ رواں کی جانب نظر آئیں تو اس بات کا برملا اعتراف ضروری ہے کہ حقیقت و گماں کے شش جہتی پاتالی و افلاکی سفر میں ظفر اقبال کا اپنے فکری مرکز کی طرف رجوع کرنا بے مقصد آوارہ خرامی کی بدولت نہیں ہے۔ ان کے بیشتر خشک و تر میں بھی کوتاہی نہیں۔ وہ بھی نظیری کی طرح ہر نخل کی لکڑی کو کہ جو منبر نہیں بنتی، دار بنا دیتے ہیں اور بہ قول غالب، باغ کی زمین کا کوئی ذرہ بھی بیکار نہیں ہے۔ یہاں جادہ بھی لالے کے داغ کا فتیلہ ہے۔ سو سراج منیر نے اگر ان غزلوں کو جنھیں ظفر اقبال اپنی ناکام غزلیں کہتے ہیں، سیاسی معاملہ بندی کی غزلیں کہا ہے تو اس پر مہر تصدیق ثبت کی جا سکتی ہے کہ جعفر زٹلی سے لے کر امام دین تک طنز و مزاح کی شاعری سیاسی و سماجی مسائل کے اظہار کے تناظر میں موثر رہی ہے۔ براہ راست اظہار کی شاعری میں موضوع کو بنیاد بنایا جاتا ہے اور شعری صنعتوں سے زیادہ سروکار نہیں رکھا جاتا۔ یوں بہ قول ظفر اقبال ''بات دوٹوک ہو جاتی ہے اور خاصی حد تک عامیانہ۔ عرش اور فرش میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا''۔ ایسے میں اگر وہ عام لوگوں کے معیار پر آ کر اپنے عرش کو پاتال کرتے ہیں تو انھیں اس بات پر کامل یقین محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے لوگوں کی طبع رواں کو اپنی راہوں پر ڈال رکھا ہے۔ لیکن ان کا یہ کہنا درست نہیں کہ انھوں نے تصویر سخن سے اپنا آپ نکال لیا ہے۔ ان کا ہر شعر ان کے اساطیری حوالوں کا امین ہے۔ آبِ رواں

کے حوالے سے ان کا یہ شعر دیکھیے۔

پانی سا بہتا پھرتا تھا میں پانی کے ساتھ ظفر
کوئی بہت منہ زور لہر تھی جس نے مجھے اچھال دیا

یہاں ظفر اقبال کے دو مطبوعہ کلیات میں موجود بارہ شعری مجموعوں سے پانچ اشعار فی مجموعہ بہ طرز فال نکال کر ان کے شعری رنگوں کا سراغ لگاتے ہیں:

1- آبِ رواں

مہتاب میں نہ رہ گزر کہکشاں میں تھی
تھی جس کی جستجو مرے عجزِ بیاں میں تھی

-☆-

لب تک آئے گی مگر آ کے پلٹ جائے گی
ٹوٹا پھوٹا سہی یہ آہ بھی گھر رکھتی ہے

-☆-

ہے خود بھی کبھی موج کبھی منتظر موج
اور موج میں آ جائے تو ہے اک سمندر

-☆-

کچھ بھرے دریاؤں میں بھی تھی نہ ایسی کیفیت
جو بھنور پیدا ہوئے ہیں اس دلِ پایاب میں

-☆-

ظفر اقبال کے کلام میں جس نوع کے معنوی، صوتی اور صوتی معنوی ادراک کا احساس موجزن ہے اس میں دل و جان یعنی دلی اور لکھنؤ کے روزمرّوں اور محاوروں کے دُرست استعمال کے ساتھ ساتھ پنجابی صَرف و نحو کی گہرائیوں سے ان کے مُتکفّل استفادے کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ آبِ رواں میں اگرچہ مستعملات سے انحراف کا زیادہ سُراغ نہیں ملتا، تاہم چمنِ زیست میں کھلنے والے نت نئے پھولوں کی خوشبوئیں قارئین کے ذہنوں کو مُعطّر و تازہ کر چکی ہیں۔ رائج نظام کے خلاف غم و غصّہ کا اظہار ہر ذی شعور شاعر کی اُفتادِ طبع کا حصّہ ہے۔ علاوہ ازیں اچھے دنوں کے خواب دیکھنے سے بھی شاعر کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ڈبّے کے دودھ اور سرکاری تعلیم نے روایتی اطوار کی خُو سے بیگانہ کرنے کا جو کام کیا ہے، اس کے نتیجے میں مسلّمات سے نجات ملنے کے امکان پیدا ہوئے۔ زبان کے مسلّمات سے نجات پانے کے لیے آبِ رواں کی تراوت کو ترک کرنا لازمی ہو گیا تھا، سو صاحبِ الجم نے شاعری کے لیے جن مسلّمات کی ثنا خوانی کی تھی، ان سے نجات پانا ناگزیر تھا، سو نظم میں افتخار جالب اور ان کے رُفقا (انیس ناگی، عباس اطہر، تبسّم کاشمیری، سعادت سعید، اظہر غوری، فہیم جوزی، نسرین انجم بھٹی) نے ان کو متروک کرنے ہی میں عافیت جانی اور غزل میں ظفر اقبال نے ان کو درخورِ اعتنا نہ جانا۔ یعنی اُن کی بغاوت صاف، شستہ اور بامعنی الفاظ کے ساتھ ساتھ لطیف المفہوم اور آسانی سے سمجھ میں آنے والے اشعار پر محیط تھی۔ استعارات قریبہ نے جن عامیانہ مفاہیم کو فروغ دیا تھا، علامات بعیدہ نے ان کے مقابلے میں تخیل اور افکار کے زمینی آسمانی تخصصات کو آغوشے میں راحت حاصل۔ چُست بندشوں کی دائمی بندش کا بندوبست ہوا اور تفویضی شاعری سے گریز کو بنیادی اہمیت ملی۔ اب شاعری کے رنگین کینوس پر نقش و نگار بنانے کے زمانے قصّہ پارینہ ہونے لگے تھے۔ چشمِ خشک میں اضمحلال اور برگشتہ مژگاں میں سرکشی کی حکایات علکنے لگیں۔ میں، میں اور تُم میں ہم سب نظم و غزل کی کائنات بدلی۔ ان میں معاصر عروج و زوال کی حکایات رقم ہونے لگیں، اظہار بھی۔ ظفر اقبال کے شعری جنون کو اُن کی مُسلسل اور پے در پے شعری اختراعات نے انھیں شعری اور شعوری آزادی کے طلسمات سے آگاہ۔ ظفر اقبال اور افتخار جالب نے شعری تجربوں پر توجہ دی۔ یوں ترقی پسند، جدید اور نئی غزل کی حدّ و وُسعت آشنا ہوئیں۔ اس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ لسانی تشکیلاتی منطق کے ضمن میں افتخار جالب اور اُن کے رُفقا نے جو کردار ادا کیا ہے، اس کے پس منظر میں اُن کی مطالعاتی وسعتیں کارفرما ہیں۔ پروٹا گورس، دیما قراطیس، افلاطون، لاک، لائبنیز، برکلے، روسو ہرڈر، میکس ملر، کارنیپ، وٹ گن اسٹائن، لیوی اسٹراس، سوسن کے لینگر، ڈی سا سیر اور چومسکی کے نظریات جس نوع کی لسانی تفتیش کا سنگِ بنیاد رکھ چکے تھے، اس سے فرار ممکن نہ تھا۔ اُنھوں نے لسانی اور معنوی وسعتوں کے لیے جدید ترین نظریات کا دامن تھاما۔ اپنے ماحول کے پس منظر میں ان کی معنویتی توسیع کا کام انتہائی مُشکل تھا، وہ اس سے عہدہ برآ ہوئے۔ ظفر اقبال نے لسانی ردّ و بدل

سے پہلو تہی نہیں کی۔ نئے لسانی دشت میں آبِ رواں کی صوتیاتی جمالیت نے نئے معنوی گل و گلزار اور نخلستانوں کی راہیں ہموار کیں۔ انھوں نے اگرچہ لسانی تشکیل کی طرح نہیں سوچا، تاہم اُن کی غزلوں میں سوشو ر لسانی تجربے گہرے فکر و ادراک کے پس منظر کے بغیر بروئے کار نہیں آ سکتے تھے۔

## 2- گلافتاب

اک ڈھول سی جمی ہُوئی آنکھوں کے آس پاس
اک رنگ سا اُڑا ہُوا دل کے نواح میں

-☆-

زمیں کا ذائقہ لکھا ہے اپنی قسمت میں
چلے چلو کہ نہیں بحر بے کراں اُس کا

-☆-

آبِ صفا کی تہ میں چھر پیش کہنگی
سطح سے پہ نقش نوی عام ہر طرف

-☆-

کڑک بجلی بھڑک شعلہ دھڑک دھوپ
بدن بادل اُمڈ گھسارنے کا

-☆-

## 3- رطب و یابس

نہاں جو رنگ رواں تھا سکوتِ صحرا میں
اسی کا جلوہ سرِ ساحلِ صدا بھی ہُوا

-☆-

زہر ہوس ہے رواں عکس اُفق پر ابھی
زودے فلک پہ ابھی نیل نظر ہے الگ

-☆-

وہ تمنا ہوں کہ دل سے نہ گزر ہو جس کا
وہ تماشا ہوں کہ نظروں سے نہاں رہ جائے

-☆-

کب سے بدن شعر بنا رکھا ہے تشکیل
اس میں کوئی اب روح کا کانٹا بھی چبھو دے

-☆-

ہوتے تھے چور ہر دو فریق مقدمہ
کرسی پہ اب تو بیٹھ کے منصف بھی چور ہے

-☆-

## 4- غبار آلود سمتوں کا سُراغ

اس کی راہوں میں بکھر جائے یہ خاکسترِ چشم
اور اپنے لیے دیدار کا مطلب کیا ہے

-☆-

لیے تو چلتے وہ دیوار سنگ تک مجھ کو
میں چومتا اُسے اور اُس میں در بنا لیتا

-☆-

گھِرا تھا چاروں طرف دھوڑ کی قنات سامنے
تمام زمانہ کسی نقش تر بتر میں رہا

-☆-

ہم اُس کے ہاں صفِ اوّل میں بیٹھتے کیوں کر
کہ اپنے پاس خوشامد نہ جی حضوری تھی

-☆-

خواب کی تعبیر پر اصرار ہے جن کو ابھی
پہلے ان کو خواب سے بیدار ہونا چاہیے

-☆-

5- سرِ عام

لکھتا رہتا ہوں بہت کچھ مگر افسوس ہے یہ
بات جو اصل ہے تحریر نہیں ہو سکتی

-☆-

باہر کی سمت کھلتے ہیں کیوں کر گل و سمن
اندر کو پھیلتے ہیں بیابان کس طرح

-☆-

اُڑا کے لے گئی سب ضابطے وہ موجِ ہوس
ہوائے تند کے آگے یہ خار و خس کیا تھا

-☆-

مجھے یکسو بھی رکھتا ہے بنانِ نقشِ نظارہ
پریشانِ تماشا بھی اسی اثنا میں رہتا ہوں

-☆-

توجہ اپنی اہلِ آسماں پر بعد میں ہو گی
کہ پہلے میں نے آدم زاد کو تبدیل کرنا ہے

-☆-

6- عیب و ہنر

پیاس کا گرداب سا رہتا ہے میرے چار سُو
خواب صحرا ہوں سمندر سوچتا رہتا ہوں میں

-☆-

زندگی جیسی بھی ہے کرنی تو ہو گی بسر
ٹوٹ کے رونا بھی ہے، جھوم کے گانا بھی ہے

-☆-

بارِ معنی سے جھکی شاخِ سخن ٹوٹی تھی کیسی
کیا وہ لمحہ تھا، ظفرؔ، جس کو مکرر ڈھونڈتے ہیں

-☆-

سخن سرائی تھی ممکن سو ہم نے کر ڈالی
کہ شاعری تو سراسر بیاں سے باہر ہے

-☆-

7- وہم و گماں

یہ دام تو کسی نے بچھایا نہیں غلط
پھنستا نہیں ہے آپ سو طائر غلط سہی

-☆-

میں وہ روش ہوں ظفرؔ گلشنِ خیال و خبر کی
کہ جس پہ بھول گیا ہے کوئی گلاب لگانا

-☆-

رہتا ہے ٹوٹ کر بھی جو اپنے مقام پر
اک اور بھی ستارے کے اندر ستارہ ہے

-☆-

یہ وہ رَوِش خیال خام ہے جو رُک نہیں سکتا
کہ میں خود بھی اُسے دن رات جولانی میں رکھتا ہوں

-☆-

جہاں بھی سانس لینے کو میں رُکتا ہوں گھڑی بھر
وہیں ڈھول اور ڈھوئیں کا ایک چکر گھومتا ہے

-☆-

8- اطراف

مجھ کو تو یہ مُسافتِ صحرا بھی راس ہے
اس دھوپ اور پیاس میں دریا ہے ساتھ ساتھ

-☆-

سو رنگ بجھ جائیں گے بے رنگ کی جانب
اک بھیڑ چلی آئے گی تنہا کی طرف سے

-☆-

کھو جائیں گے پھر رات کی گہرائی میں وہ رنگ
کچھ دیر سرِ شام ہمارے میں رہیں گا

-☆-

میں اس کو رایگاں میں آپ ہی تبدیل کرتا
یہاں جو کچھ بھی ہوتا رایگانی کے بجائے

-☆-

کسی حساب سے میرا نہیں شمار کہیں
کسی کتاب میں ہوں اَن گنے طریقے سے

-☆-

9- جے ہنومان

لہو سا رستا ہے کہیں
یا باچھوں میں پان ہے

-☆-

سردی نے جب زور کیا
ہنومان نے پہنا کوٹ

-☆-

جو پہلے ہو چکا تن میں کئی بار
وہی سب کچھ دوبارہ ہو رہا ہے

-☆-

بعض پہ رعب تاج کا جھاڑا
بعض کو گرز سے ڈرا لائے

-☆-

آپ کے نوکر چاکر بھو کے بندر لوگ
آپ کی جانب آپ جھپٹنے والے ہیں

-☆-

10- تفاوت

خواب سے آگے بھی ہے خوابوں کا ہی اک سلسلہ
دیکھنے والوں کی خاطر کیسا کیسا خواب ہے

-☆-

منڈے میں تو بکتا ہے وہی مال کہ جس سے
پیدا ہو ، ظفر ، چشمِ خریدار میں جھلمل

-☆-

داستاں میں تو نہ تھا کردار ہی اپنا کوئی
ذکر کافی ہے جو پھر بھی حاشیے میں رہ گیا

-☆-

نوید ہو کہ شریفانِ شہر کے ہمراہ
کبھی چھپے ہوئے لوفر پتنگ اُڑاتے ہیں

-☆-

مرا نیا لفظ باندھنے کا جواز کیا ہے
اگر معانی وہی پرانے نکالتا ہوں

-☆-

## 11- ترتیب

مارے گئے ہم لوگ کہ تھے بے سروساماں
لُوٹے گئے باقی سر و ساماں کی بدولت

-☆-

کسی طلب کی نہیں تو تقی ہیں خاک بہ خاک
کسی یقیں کا گماں واہے کو ملتا ہے

-☆-

دشت میں صورت ایجاد اگر ہوں تو کہیں
شاخِ دریا پہ نشیمن بھی مجھے چاہیے ہے

-☆-

اگر سراب کو پانی سمجھ لیا جائے
یہ دشت ہی نہیں، دریا بھی تیرے سامنے ہے

-☆-

## 12- تماشا

درمیاں میں اک پرانی پیاس تھی اور دور دور
آبِ تازہ کے کئی تالاب تھے چاروں طرف

-☆-

پانی سا چمکتا ہوا صحرا میں بہت دور
اور خاک سی اُڑتی ہوئی دریا کی طرف سے

-☆-

یہ روشنی ہے کہ رنگوں کا ایک سیلِ رواں
طلسم زار ہے سورج، کرن تماشا ہے

-☆-

آسماں کو کھینچ لایا ہوں زمیں پر اور پھر
اس طرح سے اس زمیں کو آسماں کیسا کیا

-☆-

بارش بھی ان میں ہو گی پنہی اور برق بھی
چھانے کو ہیں سروں پہ گھٹائیں نئی نئی

-☆-

ظفر اقبال کے کلیات کی جلد سوم میں جو چھ مجموعے تجدید، تقویم، تشکیل، تجاوز، توارد، اور تساہل کے نام سے شائع ہو رہے ہیں، ان کا مجموعی جائزہ اس امر کا غماز ہے کہ شاعر نے جہاں اپنے عمومی طرزِ بیان کو وسعت آشنا کیا ہے، وہاں حسبِ سابق ہر مجموعے کی یکتائی اور انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔ انھیں اس بات کا شدید احساس ہے کہ غزل میں استعمال ہونے والے الفاظ کے سکّے کھوٹے ہو چکے ہیں اور قارئین کو زبان انتظاری کے مرحلے سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ شاعر بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ اس کی روکی ہوئی باتوں کے لیے بیان کے مناسب قرینے موجود نہیں تھے۔

اپنے ہر نئے مجموعے میں ظفر اقبال بیان انتظاری کے کشٹ سے گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس کو عمر بھر بیان سے تعبیر کیا ہے، وہ اصل میں رنگِ بیاں کے مُسلسل انتظار کی کیفیت کا اسم ہے۔ وہ فن کی مچان پر بیٹھے شیر شاعری کے مُنتظر تخلیق شعر کے کرب سے گزرتے رہنے کو احسن خیال کرتے ہیں۔ تجید کی تمہیدی غزلوں میں موضوعِ حمد کی نئی صورتیں چونکانے والی ہیں۔ اس موضوع کی روایتی اور جدید سُراغ بندی میں شاعر کا قلم یکساں پھُرتی سے رواں ہے۔ خیالات کے دھارے آبشار سماں ہیں۔ ہر شے میں منعکس ہستی ازمین و آسمان کا مالک ہر شے اُس کی جانب سے ہے۔ آنی جانی، دُنیا فانی، سب کی رام کہانی، کپڑا لتہ، دانہ پانی، شہری بارانی، گوری کالی، نئی پُرانی، سب کچھ خدا کی جانب سے ہے۔ اس مجموعے میں ظفر اقبال اپنے آپ کو سیلانی کہتے ہیں اور منفرد زور سیلانیت پر نازاں ہیں:

ساتواں تو مَیں ڈھونڈ آیا ہُوں
کون سے آسمان پر ہے تُو

☆

میرے ہونے میں نہ ہونا میرا
یہ بھی اِک اپنی رضا ہے تیری

☆

ویرانی ہے گُل بُوٹوں پر
اور اس باغ کا مالی تُو ہے

☆

حمد اُس کی لکھتا رہوں
شعر شعر روتا رہوں

☆

ظفر اندر سے اُچھلتی ہے یہ حمد
یہ سُنی ہے نہ کہی میرے خُدا

جدید میں ظفر اقبال نے اپنے نئے رنگ کے جمانے کی بات کی ہے اور ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ وہ ہر جا ہُوا رنگ اُڑانے والے ہیں۔

اُردو کی معنوی و فنی افادیت اور غیر افادیت کے ضمن میں نزاعی مباحث آج بھی جاری و ساری ہیں۔ کہیں کوئی شدت سے اس امر کا پرچارک ہے کہ غزل کو پرکھنے کے لیے صرف داخلی اور موضوعی معاییر سے سروکار رکھنا چاہیے۔ اسے سیاسی، سماجی اور عصری تقاضوں سے بالاتر رکھ کر اس کی آفاقی اور مُطلق اقدار پر زور دینا چاہیے۔ ظفر اقبال نے غزل کے فنی سانچے کے اندر رہ کر اس کے نئے امکانات کی تلاش کی ہے۔ وہ اس خیال کے شارح ہیں کہ غزل کے روایتی فنی اور جمالیاتی معیاروں پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ اُنھوں نے جن حوالوں سے غزل میں تبدیلی کا نعرہ بلند کیا، ان کے تناظر میں قدیم و جدید روشوں کے داعی نقادوں دونوں کو گہرے صدمات سے گزرنا پڑا ہے۔ غزل میں اُستادی شاگردی کی روایت والے گُل نگل دوست تو ظفر اقبال کی غزل سے پناہ کے طالب تھے ہی، کلیم الدین احمد کے نقشِ قدم پر چلنے والے نقادوں نے اسے نیم وحشی صنفِ سخن کی جگہ مُکمل وحشی کا نام دینے سے بھی گریز نہیں کیا۔ جدید نظم کو شعرا غزل میں در آنے والی ظفر اقبالیت سے تب نالاں ہوتے اگر وہ غزل ہی کو عہدِ کہنہ کی بیکار میراث سے تعبیر نہ کرتے۔

## تقویم

میری بجّی میں سمانے والا
میرے پانی سے اُبھرتا کوئی

☆

چلا ہُوا سا ہے جو کاروبار خواب ظفر
یہ نفع ہے کہ خسارہ ہے آؤ دیکھو تو

☆

آ سکتے نہیں اس عدم آباد سے واپس
ہر رات اُترتے ہُوئے غاروں میں ستارے

☆

اتنی رونق اور اتنا شور و شیون ہے مگر
لگ رہے ہیں کس قدر تنہا زمین و آسماں

-☆-

وقت سے پیچھے ماورا دن ہے
یہ نکلتا کہ ڈوبتا دن ہے

-☆-

ڈاکٹر مبشر حسن کی کتاب "شاہراہِ انقلاب" کے فن و ادب پر لکھے گئے باب میں اسی نوع کی انتہاپسندی کو بروئے کار لایا گیا تھا۔ اُردو غزل کے خارجی داخلی اور داخلی خارجی مزاج کی تفہیم کے لیے تاریخ و سیاست کے ساتھ ساتھ اُردو اور فارسی ادبیات میں موجود تصوّف اور فکر و فلسفہ کی ہمہ جہتی روایات سے آشنائی لازمی ہے۔ ظفر اقبال نے اپنی غزلوں میں زباں بندی، احوالِ عالم، در پردہ معاملے، ذاتی اظہار، کائناتی تحقیق، آشوبِ عہد، شعورِ زندگی، انسانی کم مائیگی، حیات اسیری، نحوستِ محرومی، احساسِ ذلّت و شکست، محکومی آثارِ چہ حاو، ہر نوع کی بربادی، سلطنت زوالی، غفلت و وقت ضیاعی، اخلاقی و مادی مُفلسی، ناجائز دولت، ظلم و استحصال و استیصال، بے دادگری، انصاف طلبی، مذہبی غیر رواداری، مادی و رُوحانی تضاد، نظامِ نو کی تلاش، کاروباری اخلاقیات وغیرہ کو خصوصی اہمیت دی ہے۔ ان کے مجموعے "تشکیل" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

مرا خیال ہے تدبیر کوئی اور ہی کر
ہجوم اب مری تلوار سے نہیں رُکتا

-☆-

پھر جھوٹ کی اس میں ہمیں کرنی ہے ملاوٹ
پھر راس نہیں آئے گی سچائی ہمارے

-☆-

پھونکے گا ایک رُوحِ نئی مجھ میں خوابِ عشق
اور وصل جاوداں مجھے فانی بنائے گا

-☆-

کیے بیٹھے ہیں سمجھوتہ سا اس کے ساتھ بھی اب
نہیں ہے اور ابھی کچھ دن جو منظر جانے والا

-☆-

اہلِ اُلفت سے الگ اہلِ غرض تھے کہ یہاں
کوئی کھونے کی طرف تھا کوئی پانے والا

-☆-

گزر کر دیکھ بھی آیا ہوں بازارِ تماشا سے
مری قیمت نہیں تھی رائگاں ہونے سے پہلے بھی

-☆-

قدیم و جدید شعرا نے آرزو شکنی، نادر گردی، مابعد الطبیعیاتی خیال آفرینی، آوارہ خیالی، محدود جہتی، محکومی و مستاجری، جبر و استحصال، ظلم و تشدد، اور بہت سے دیگر معاملات کو رمز و ایماو کنایہ کے وسیلے سے بھرپور طور پر پیش کیا ہے۔ ظفر اقبال کے کلام میں ان موضوعات پر بغیر کسی لگی لپٹی کے اظہارِ خیال ہوا ہے۔ اس امر سے پہلو تہی ممکن نہیں ہے کہ ہر عہد کے شاعروں کے ہاں کنایوں، استعاروں، اشاروں اور علامتوں میں ماحول کے آثار چہ حاو کی داستانیں اپنے عناصر سمیت منعکس ہوئی ہیں۔ ظفر اقبال کی غزلوں میں اشارے، استعارے اور علامتیں معنوی اعتبار سے رواں اور متحرک ہیں۔ اُنھوں نے پُرانے لفظوں کو اپنے عہد کی مخصوص صورتِ حال میں نئی معنویت تفویض کی ہے۔ شمع، چراغ، قفس، گریبان، دل، جان، چمن، خرابات، آسمان، مژگاں، پگڑی، زمیں، جنوں اور چشم کی علامتوں کی روایتی معنویت سے ظفر اقبال نے زیادہ سروکار نہیں رکھا۔

نکل جاتا رہوں گا جس طرف بھی جی میں آئی
یونہی تبدیلیٔ آب و ہوا کرتا رہوں گا

☆

ولدر درمیاں دلدارنے کا
تلخ تنہا الف انکارنے کا
قرق فقدان دونویں آگ عورت
جسم چادر تماشا نارنے کا
اُڑن بوسہ مُون جھی جڑن جان
اندھیر آنگن الف انوارنے کا
مُدلواں مسخرہ مسجد اچکن مست
تلذذ تجربہ بینارنے کا
وصل و نجار و ہی بھیڑیا بھوک
نپل نزدیکنے خونخوارنے کا
ظفر بے انت بڑباتاں جنگلو
بلن بے کارنے بے چارنے کا

ظفر اقبال اپنے مجموعے ''تواردؔ'' میں شاعری کو مرصّع سازی یا نگینہ جڑی کے بجائے شیشے کا ہنر قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

شاعری کام اتنا نازک ہے اگر سمجھے کوئی
یہ ہُنر شیشے کا ہے اور سر بسر شیشے کا ہے

ان دنوں جہاں زندگی کے ہر شعبے میں اقداری اور معیاری زوال کے مژدے سُنائے جا رہے ہیں، وہاں شاعرانِ عصرِ حاضر کو اس امر سے پُوری آگاہی ہونی چاہیے کہ ان کے نقلی غیر تخلیقی اور روایتی مال کو ادب کی منڈیوں میں بڑے پیمانے پر پذیرائی مل رہی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ دیسی اشیا پر میڈ ان جاپان ثبت کر کے اسے مہنگے داموں بیچنا ہمارے کاروباری اداروں کا عمومی وتیرہ ہے۔ پیش پا اُفتادہ خیالات کو نئے آہنگ اور شاعری میں ڈھال کر بامِ شہرت کو فتح کر لینے کا زعم رکھنے والے متشاعرانِ کرام کو اطلاع ملے کہ ان کی کتابیں برابر تُس تو کر سکتی ہیں لیکن ان میں ایسے مواد کا فقدان ہے جو اُنھیں تخلیقی دوام عطا کر سکتا ہے۔ اُنھیں چچوڑی ہوئی ہڈیوں کو چچوڑتے رہنے

میں ہی لذت و مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اپنے تئیں شاعری کی دیوی کو چاروں شانے چت گرانے کا دعویٰ کوئی چھوٹا دعویٰ نہیں ہے، تاہم یہ اس دیوی کا کمال ہے کہ وہ ان کے ہاتھوں سے نکل نکل جاتی ہے۔ مٹھیوں میں ہوا کو قابو کرنا امرِ محال ہے، لیکن اسی عمل میں لذت و سرشاری محسوس کرنا اُن کا حق ہے۔ بھلا ہم اُنھیں روکنے والے کون ہیں۔

ہاتھ نمناک ہیں، آلودہ ہیں، دُھندلی ہے نظر
ہاتھ سے آنکھ کے آنسو تو نہیں پُونچھے تھے

(میراجی)

یہ شاعر ایسے عمل کے بعد نحیف و نزار پڑے ہوتے ہیں اور ایک طرح کا احساسِ گناہ اُنھیں دربدری پر مجبوری کرتا ہے اور وہ کبھی ایک نقاد کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور کبھی دُوسرے کا کہ وہ ان کے گناہوں کو ثواب میں بدلنے کے لیے جواز فراہم کریں۔ ایسے شاعر انانیت کے سنگھاسنوں پر بیٹھنے کو اپنا اوّلین حق جانتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ باقی سب لوگ اُن کے ہم زبان ٹھہریں لیکن سب نے مسّرت حاصل کرنے کے اپنے اپنے ذریعے ڈھونڈ رکھے ہیں۔ حالی کے لیے شاعری رُوحانی مسّرت عطا کرنے کا وسیلہ تھی۔ ترقی پسندوں نے اسے انقلابی سرخوشی کے لیے وقف کیا۔ جدید شاعری کے علم برداروں نے اسے ترجمانی کا وسیلہ جانا اور نئے شاعروں نے اظہار کا۔ ٹیٹری صفت ہیں، آسمان کی جانب ٹانگیں پھیلائے، اُلٹے لیٹے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسے تھامنے والے وہی تو ہیں۔ دعوے، جواب دعوے کے گھسے پٹے انداز میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے کا جتن کر رہے ہیں۔ روایتی انسان کو اپنا ماڈل بنا کر جس قسم کی انسانی عظمت کی ثناخوانی میں مصروف رہتے ہیں، اس کا نتیجہ بے اثری کی صورت نکلتا ہے۔ یعنی زندگی میں تو ضمیر و شعور گروی پڑے ہوتے ہیں اور شعر میں انسانی عظمت و رفعت کی مُبالغہ آمیز تصویر کشی کی جاتی ہے۔ ایسی شاعری آفاقی شعور سے نابلد ہی رہتی ہے۔ ظفر اقبال لکھتے ہیں:

کسی کی دید کسی کی شنید میں ہوں کہیں
فضا پکارتا ہوں اور خلا گزرتا ہوں

☆

رنگ ہوں تو مجھ سے روشن ہو یہ دیوارِ چمن
سنگ ہوں تو اپنے ہی آئینہ خانے لے چلو

-☆-

نہ روک پائے تحیر کی تیز طغیانی
جو بند باندھنے آئے ثبات سے آگے

-☆-

جاری ہے کہکشاؤں کی بارات اس طرح
میلہ سا جیسے کوئی لگا ہو خلاؤں میں

-☆-

لتھڑے ہوئے سے لفظ معانی کے دائیں بائیں
بچھڑے ہوئے کنائے اشاروں کے درمیاں

-☆-

ظفر اقبال نے رومان کی ہتلا دینے والی کثرت وحسرت کو قریب نہیں پھٹکنے نہیں دیا۔ اس لیے وہ بے جا حسن بندی کا شکار ہونے اور عشق کم خرچ و بالا نشین کا حظ اٹھانے سے بچ گئے ہیں۔ اس بات سے اُردو ادب کا ہر قاری آگاہ ہے کہ اُردو شاعری میں غزل مرکزی اہمیت کی حامل صنف ہے۔ اس نے ہر دم متغیر عصری اقدار کو اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔ غزل کے مخالف نقادوں کا خیال ہے کہ یہ صنف نئے عہد کے تجربات اور فکری تقاضوں کو گرفت میں لینے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ آج ہمیں غزل کی صلاحیتوں اور امکانات کا جائزہ لینے کے ساتھ ساتھ اس نکتے پر توجہ دینی ہے کہ عہد جدید میں نئے غزل گو شاعروں نے اس صنف کے معنوی سانچوں میں ہیئت اضافے کیے ہیں۔ اُردو غزل کے من جملہ جدید شعرا نے ایک طرف تو غزل کے کلاسیکی ڈھانچے کو برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے تو دوسری طرف اس کے موضوعات میں رنگا رنگی پیدا کی ہے۔ ظفر اقبال کا نام ان نئے شاعروں میں سب سے اہم، یکتا اور منفرد ہے۔ اُن کے تمام مجموعوں کے اشعار فنی روانی اور بوقلمونی کی خوبیوں سے مملو ہیں۔ اُنھوں نے جہاں ایک طرف جذبات بیانی

کے لیے براہ راست اظہار اور سلیس انداز اختیار کر کے سہل ممتنع کو نئی تازگی بخشی ہے، وہاں دوسری
رف اپنی فکری تشکیلات کی پیش کش میں زبان کے پُر شکوہ استعمال اور متنوع ترکیب بندی سے
واجز کام لیا ہے۔ ان کے شعری مجموعے تساہل کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

عادت سی پڑ گئی ہے جدال و قتال کی
آرام سے ہیں امن و سکوں کے بغیر ہم

-☆-

پھر ہی پہنایا گیا دونوں کو ملبوسِ غبار
مدتوں پھرتے رہے عریاں زمین و آسمان

-☆-

کچھ کہنگی کے اپنے مسائل ہیں کیا بتائیں
اب شعر اس مشین میں پھنستا ہے اور بس

-☆-

یقیناً ہے کسی گرگٹ کی اولاد
بدل سکتا ہے وہ ہر آن سارا

-☆-

بزمِ ہوس میں اہلِ قناعت بھی تھے کئی
بیٹھے ہوئے تھے اور جگہ کے بغیر تھے

-☆-

دیومالاؤں میں رہتی ہے بری آمیزش
کبھی ہوتا ہوں اساطیر کے اوپر نیچے

-☆-

حالی، حسرت اور اقبال کی غزلوں میں قومی اور سماجی طرزِ احساس کی موجودگی سے انکار ممکن

نہیں ہے۔ ترقی پسند شعرا نے اس روایت کی نئے نظری رنگ سے آئینہ بندی کی۔ شکیب جلالی، اقبال ساجد نے پاکستان میں جدید غزل کو تمثالی عمومیت سے ہمکنار کیا اور ظفر اقبال نے دل دریا کی منہ زوروں جیسی گہرائیوں اور ساحلوں جیسی پہنائیوں کو لفظوں کی قیمتی پوشاکیں عطا کیں۔

ڈاکٹر عزیز الحق کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ "بدلتی ہوئی معاشرت کے ساتھ جب انسانی نفسیات بدلتی ہے اور سوچ اور جذبے کے نئے ڈھانچے تخلیق ہوتے ہیں تو نیا ادب پیدا ہوتا ہے کہ ادب کی اساس انسانی فکر و جذبے پہ ہوتی ہے۔ مدت ہوئی یہ اصولی بات تسلیم کی جا چکی ہے۔ ایسے میں اس کا دہرانا وقت کا زیاں ہے تو اس کو ثابت کرنے کے لیے شواہد فراہم کرنا ایک میکانکی فعل۔"

بدلتی ہوئی معاشرت کو ظفر اقبال نے نہ صرف بہ خوبی محسوس کیا ہے بلکہ اپنے قارئین کو بھی اس کا شدید احساس دلایا ہے۔ ہمارے شعر و ادب کی روایتی شخصیتیں تو زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد کے بمصداق کسی بھی تبدیلی کو خود پر اثر انداز نہیں ہونے دیتیں۔ پاکستانی معاشرت دھیرے دھیرے تبدیل ہوتے ہوئے عصوریت سے ہمکنار ہو رہی ہے، اس نے کیا صورت اختیار کرنی ہے۔ اسے شاعروں اور ادیبوں کی تخیلاتی جستوں میں تلاش کرنا ہوگا۔

ظفر اقبال کی شاعری میں قدیم و جدید کی کشمکش اپنے عروج پر نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنے لیے نئی زمین اور نئے آسمان کا تصوّر روا رکھا ہے۔ اس حوالے سے اگر وہ زبان کا روایتی استعمال ترک نہ کرتے تو اُن کی شاعری میں تبدیل ہوتے ہوئے ماحول کا انعکاس احتمالی رہتا۔ لسانی تلازمے اور نئے صوتی اور معنوی مدلولات نے اُن کے اسلوبِ بیان میں ندرت کو جنم دیا ہے۔ اس پر طرّہ یہ کہ انھوں نے بولتے لفظوں کے درمیان خاموش وقفوں کو پُر تاثیر انداز سے برت کر اس امر پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے کہ قدیم و جدید کے مابین سوہو و شوش عصوریت کی ہیولائی جمالیت کا اپنا مخصوص لطف ہے۔ ماضی اور مستقبل کے درمیان حال کے لمحات کے اوقاف اور ان کے معنوی اور صوتیاتی ہیولے، ایک حشر ساماں تجرید! کسی نہ کسی ٹھوس صورت کی متقاضی، لفظ در لفظ و قفے، تسلسل، تواتر، معاشرتی تبدیلیوں سے جنمے افکار و جذبات! نئی اقدار و اطوار کا احساس، نئے اسالیب کی تشکیل میں ممد و معاون! قارئین انجانی کشمکش میں مبتلا! معاشرتی انتشار کا شکار ہونے پر زبان ساتھ چھوڑ جائے تو کچھ بعید نہیں۔ یہ عصوری کشاکشی کشمکش! عشق و محبت کے پیمانے تبدیل ہو گئے ہیں۔ زندگی میں کاروباریت آ چکی ہے۔ اپنے مجموعے تجدید میں کہتے ہیں:

دل سے باہر قطار میں ہوں لگا
دستیاب اس دُکان پر ہے تُو

-☆-

شاہدِ گل باغ سے بازار میں آ چکا ہے۔ غالب کے خیال کا امکان حقیقت میں ڈھلا ہے۔ شاعر اس موجہ بادِ یاراں کی تلاش میں سرگرداں نظر ہی نہیں آتا، اس سے اپنا دیا بجھانے کا متمنی بھی ہے۔

روز ہنگامہ ہوا کا سرِ باغ
شہد کے شور نگر میں تیرے

-☆-

ظفر اقبال کے مجموعے تقویم کے یہ اشعار دیکھیے:

دھنسنے کے لیے ہم کو میسّر نہیں دلدل
اڑنے کے لیے کوئی غبارا نہیں ملتا

-☆-

سانپ مرضی سے اپنی نکلے گا
کھول بیٹھے تو ہیں پٹارا کام

-☆-

بھرے اندر سے جاتی ہے ہوا رستے بناتی
مَیں خود بھی آج اس میں سے گزرنا چاہتا ہوں

-☆-

غزل کے اس مابعد جدیدی رجحان کی بے کنار تخلیقیت میں علت و معلول کی قدیم روش متروکات میں شامل ہے۔ ان اشعار کو ڈی کوڈ کریں یا ڈی کنسٹرکٹ، وجود میں لا وجود اور لا وجود میں وجود کا شور خیال کی نئی قیامتوں کو اُبھار چکا ہے۔ تحیّر خیال سامنے ہے۔ اس پر تبصرہ غالب کا حصّہ ہے۔ تنہائی میں انجمن اور انجمن میں تنہائی کے معاملے، نفسیات، فلسفے اور ادب کا امتزاج،

سادہ زبانی میں فکری اور نفسی زاویے، فیتہ کہکشاں سے آسماں کی پیمائش کرنے کے بعد جب شاعر حرف اوّل کے ناپ کو داستان کی پیمائش کے لیے استعمال کرتا ہے تو زبان کی روایتی ساختیات کو دھچکا لگتا ہے۔ اب شاعری کو وہ در بچہ کھلتا دکھائی دیتا ہے جس میں متعدد تعبیریں چمک اٹھتی ہیں۔ منتشر ذہنی انتشاری کوائف سے کج ہوئی ہے، خیالات ایک غیر مختتم رشتے کے نقیب ٹھہرے ہیں۔ شعوری انتشار تخلیقات میں معنوی اودھم مچا رہا ہے۔ روایتی شاعر اس عمل سے نابلد فکر و خیال کی ان جہتوں سے کم یا نیم آشنا ہیں۔ غزل کی سحر کاریوں سے واقف ہونے کے لیے ظفر اقبال کے شعری مجموعوں کا مطالعہ مشعلِ راہ ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر سعادت سعید

-☆-

# غزل تنقید

نوا کے زیر و زبر توجہ نوا ہی تو ہے
خلا کے جس بھی طرف دیکھیے خلا ہی تو ہے

لرز گئی ہے جو آنکھوں کے آئنوں میں کہیں
کٹے پھٹے ہوئے اندر کی انتہا ہی تو ہے

کہ میں ظفر ہی تو ہوں، وہم ہو تو ہو اس کو
مرے لبوں پہ لکھا تھا، وہ بارہا ہی تو ہے

میں اس کو ہاتھ لگانے کی سوت مر جاتا
مجھے یہ تھا کہ ابھی ساتھ چل رہا ہی تو ہے

ہوا کا ٹوٹا ہوا عکس کانپتا ہے ابھی
جہاں سے برگ تماشا گزر گیا ہی تو ہے

صدا کے موڑ سے آگے ہے خشت وشوں کی چمک
میں چپ رہوں کہ پلٹ جاؤں راستہ ہی تو ہے

ہم سیاہ سے ہے جسم آج بھی سرسبز
نم نگاہ نے اس کو مٹا دیا ہی تو ہے

ملے گی خاک تو آنکھوں میں ڈالنے کے لیے
اُتر نہ جائیں یہیں، ساحل سزا ہی تو ہے

ابھی سے برف کی بنیاد ہل رہی ہے ظفر
سفید گھاس کے گھر سے دھواں اٹھا ہی تو ہے

'گُلافتاب' (1966ء) کی نو اشعار پر مشتمل یہ غزل ظفر اقبال کے مخصوص تخلیقی طریقۂ کار کی نمایندہ ہے۔ ظفر اقبال کے تنقید نگاروں نے 'گُلافتاب' کی غزلوں میں تجرید اور زبان کی ہیئت کا ذکر بہ تکرار کیا ہے، یعنی ظفر شعر کے لیے مضمون کے انتخاب میں اُن تصورات کو ترجیح دیتا ہے جو حواس کے حوالے سے گرفت میں نہیں آتے، مگر اس کے ساتھ ہی تجرید کے اظہار کے لیے پیکروں کی ایسی زبان خلق کرتا ہے، جو خود اس زبان کو محسوس کی جا سکنے والی شے میں تبدیل کر دے۔ مزید یہ کہ ظفر اقبال نے دال (Signifier) کے روایتی مدلول (Signified) بھی تبدیل کر دیے ہیں، جس سے ایسی تخلیقی زبان وجود میں آ گئی ہے جو اپنے لسانی روابط پر پہلے سے موجود کسی منقطے یا فیصلے کی پابند نہیں رہی۔ اسی طرح اس تبدیلی سے لفظ کے صرف نئے مفاہیم کی جہتیں نہیں کھلیں، بلکہ اُن کی نوعیت (Category) بھی تبدیل ہوئی۔ اسما صفات ہو گئیں اور صفت، فعل کی جگہ نظم ہوئی۔ روایتی قواعد سے انحراف کے سبب ظفر اقبال کے کلام میں مفہوم کی کوئی متعین جہت بھی نہ رہی۔ بعض مرتبہ قاری شعر میں بیان کردہ صورتِ حال کو صرف محسوس کر سکتا ہے، روایتی نثر کے قواعد میں بیان نہیں کر سکتا۔

مثلاً زیرِ تجزیہ غزل کے مطلعے میں خود تخلیقی زبان ایک تجریدی تجربے میں تبدیل ہو گئی ہے ''نوا'' اگرچہ مجرد آواز کے لیے بھی آتا ہے، مگر شاعری میں آواز کے ساتھ ہی 'سُر'، 'نغمہ' یا لحن کے لیے بھی نظم ہوتا رہا ہے۔ اس نوا کے زیر و زبر میں اعراب کے مفہوم کے علاوہ، سمتوں (اوپر، نیچے) کا اشارہ بھی شامل ہے اور زیر و زبر میں تہ و بالا (Subvert) ہونے کا تصوّر بھی موجود ہے۔ اب مفہوم کی ایک جہت تو زبان کے تہ و بالا ہونے کے نوحے کی ہے، گویا زبان Subvert ہو کر خود اپنے نوحے میں تبدیل ہو گئی ہے اور اپنے روایتی مرکز سے ہٹ جانے کا یہ نوحہ ہی اس کے قائم ہونے کی دلیل ہے۔ دُوسری جہت اس کے غیر حوالہ جاتی ہونے کی ہے کہ اس زبان کا کوئی مدلول نہیں۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں یعنی صرف صُورت ہے، یہ خود اپنے نظام کے علاوہ کسی اور حوالے یا شے سے مربُوط نہیں۔ اُس کے چاروں طرف یہ جو بھی ہے وہ بھی زبان ہی ہے اور وہ اسے تہ و بالا کرتا رہتا ہے۔ شعر میں جو زبان کا حوالہ خود زبان ہے، وہ بھی کوئی سادہ سی بات نہیں، بلکہ 'نوحے' کے حوالے سے ایک کیفیت سے مربوط ہے گویا زبان کے ہونے کا ثبوت ہی اس کے نوحے میں ہے۔ زبان کی تصدیق کے لیے خود زبان کی شہادت کا یہ تصوّر ظفر اقبال کے تنقید نگاروں کی نظر میں

نہ آیا ہوتا ورنہ انھیں تصوّرِ لسان کی جدیدیت کے بعد آنے والی منزل کا نقشہ ذرا صاف دکھائی دیتا۔

شعر کے دوسرے مصرع میں جو منطق بیان ہُوئی ہے، اُس کی وضاحت ظفر نے بعد کے ایک شعر میں کی ہے:

یہ بھی ہے موجودگی کی ایک شکل
ہر طرف جو یہ خلا موجود ہے

نفی سے اثبات برآمد کرنے کی یہ منطق مابعد جدید تصورِ زبان کی بنیادی صفات میں ہے۔ لیکن شعرِ زیرِ تجزیہ میں دونوں مصرعوں کا مفہوم پُوری طرح ایک دوسرے کے مساوی نہیں۔ دوسرے مصرع کی تمثیل میں خلا کی صفت کو ہی اس کی شہادت یا گواہی تصوّر کیا گیا ہے، جب کہ پہلے مصرع میں نوا کی ایک کیفیت 'نوحہ نوا' کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے مصرع کے جو جہات ہیں، دوسرے مصرع کی مثال اُن سب کا احاطہ نہیں کرتی۔

غزل کے دوسرے شعر کا مضمون ایک مخصوص نوع کی وجودیت سے متاثر شعرا کے یہاں عام ہے، لیکن شعر میں چوں کہ کوئی ضمیر ناظم نہیں ہُوئی، اس لیے شعر کسی شخص سے منسوب نہ رہا اور اُس کی طرفیں کھل گئی ہیں۔ یہ ظفر اقبال کا عام انداز ہے۔ شعر میں اس سوال کا کہ "کس کی آنکھوں میں کٹے پھٹے ہوئے باطن کی چمک ہے"؟ کوئی جواب موجود نہیں۔ یہ شعر کے راوی کی آنکھیں بھی ہو سکتی ہیں یا کسی اور شخص کی یا پھر پُوری آبادی کی آنکھوں سے اُس کا باطن چھلکتا ہے۔ بہرحال مفہوم یہ کہ آنکھیں خواہ کسی کی ہوں، فرد کا باطن شکستہ ہے اور یہ شکستگی آنکھوں سے عیاں ہے۔ "چمک گیا"، "چھلک گیا"، "جھک گیا" کے بجائے "لرز گئی" کہہ کر شاعر نے واقعے سے ایک کیفیت بھی مربوط کر دی ہے۔ 'لرزنے' میں خوف کا جو عنصر ہے، وہ پیشِ نظر رہے تو وجودی داخلی شکست و ریخت اور اُس سے پیدا ہونے والا کائناتی خوف، وجودی تجربے کی کئی جہتوں کا احاطہ کر لیتے ہیں۔

تیسرے شعر میں 'باردا' ظفر کا بنایا ہُوا لفظ ہے جو بارد بہ معنی سرد کی صوتی شکل ہے۔ اس لفظ کی تعبیرات کے تعیّن میں 'گلافتاب' کے کئی اشعار سے مدد ملتی ہے:

بچی ہُوئی باغ باردا میں گلِ خزاں کی بہار دیکھو!



کیا کیا سراب دیکھتا ہوں دُور سے ظفر
میں باردا کے مہرِ منوّر کی دھوپ میں

☆

بے عکس باردا کے دھندلکوں میں اے ظفر
اُڑتے ہیں آفتاب کے انوار کس لیے

'گلافتاب' میں ایک پُوری غزل 'باردا' کی ردیف میں ہے۔ اُس کے اکثر اشعار سے بھی سرد کے اس مفہوم کو تقویت ملتی ہے۔

شعر میں 'لب' کلام کے لیے بھی ہیں اور لمس کے لیے بھی۔ اگر لب کلام کے لیے ہوں تو اب کلام میں جذبے کی وہ حدّت نہیں رہی جس سے محبوب کے نزدیک ظفر کی شناخت متعیّن ہوتی تھی اور اگر لمس کے لیے ہوں تو اب اُن لبوں پر وہ ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے کہ ظفر اپنی اصل کا صرف ایک واہمہ معلوم ہوتا ہے۔ بے اختیاری کی یہ منزل جہاں جذبوں کی حدّت اس درجہ سرد پڑ جائے کہ وجود واہمہ معلوم ہونے لگے، ایک افسوس ناک وجودی صُورتِ حال ہے۔

دوسرے اور تیسرے شعر میں جدیدیت کے قدرے روایتی مضامین کے علی الرغم، چوتھے شعر کے پہلے مصرع کی تخلیقی زبان، صُورتِ حال کو خاصا نیا اور معنی خیز بنا دیتی ہے۔ جنس سے موت کا رشتہ عہدِ رومانیت کی یادگار ہے لیکن اس مصرع "میں اس کو ہاتھ لگانے کی موت مر جاتا" میں جنسی رغبت اور معاشرتی حدود سے انکار کی انتہائی شکل بہت کم الفاظ میں بیان ہُوئی ہے۔ مزید یہ کہ شعر میں صُورتِ حال کی تبدیلی کی اطلاع براہِ راست نہیں، بلکہ ضمیر 'میں' کے اس اعتماد کے ذریعے دی جا رہی ہے کہ اسے "ہاتھ لگانا" اور رومانی مفہوم میں اس موت سے ہم کنار ہونا، جو ایک عرصے تک ہر شاعر کا مقصود و منتہیٰ رہا ہے، اُس کے قبضۂ قدرت میں تھا، مگر اُس نے ایسا اس لیے نہیں کیا کہ یہ شاعر کے نزدیک ہم سفری کی لذت کے مقابلے میں ایک ثانوی / ضمنی بات تھی۔ مگر اچانک یہ ہُوا کہ اب وہ اس جذباتی سفر میں ایک دوسرے سے کم از کم اس فاصلے پر تو ہیں ہی کہ وہ اُسے ہاتھ لگانے کی موت نہیں مر سکتا۔ شعرا کی طرح وصال کی آرزو کرنے کے بجائے شاعر اس صُورتِ حال پر مطمئن ہے کہ اس جذباتی سفر میں اُس کے ساتھ ہے، رہا اُسے چھونا یا اُس کے لمس کی لذت سے سرشار ہونا، تو اس کی کوئی عجلت نہیں۔ شعر کے مفہوم کی ایک غیر روایتی جہت یہ بھی ہے

کہ جذباتی تعلّق کی انتہائی منزل پر دونوں کا ایک ساتھ ہونا ممکن بھی نہیں کہ شاعر یا اُس کے لمس کی لذت سے مر جائے یا محبوب اُسے اُس منزل سے پہلے ہی چھوڑ دے اور وہ روایتی منزل کے انتہائی سرے پر تنہا رہ جائے۔

غزل کا پانچواں شعر الفاظ کو نئے تخلیقی رابطوں میں منسلک کرنے کی صلاحیت کا نہایت عمدہ نمونہ ہے۔ شعر کا مضمون ایک عام پیکر سے بنایا گیا ہے کہ تیز ہوا میں، شجر سے ٹوٹ کر پتّے گرتے ہیں۔ یہاں دُنیا سے برگ تماشا ٹوٹ کر گرتا ہے، گویا جہاں ایک شجر اور یہ پورا منظر ایک پتّے سے زیادہ نہیں، اُس کا تیز ہوا میں ٹوٹ کر گرنا، ایک پوری تہذیبی بساط کے اُلٹ جانے کے مترادف ہے۔ یہ ایک بڑا زیاں اور نمایاں تہذیبی نشانیوں کے مٹ جانے کی نہایت المناک صورت حال ہے۔ ردیف ایک شدید تاریخی بحران کو معمولی سے واقعے کے طور پر بیان کرنے میں شاعر کی مُعاون ہے کہ شاعر خود اس تہذیبی بساط کے اُلٹ جانے کو برگ تماشا کے گزرنے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ قافیہ میں ''گزرنے'' کا لفظ نہایت ہوشیاری سے نظم ہُوا ہے۔ عام محاورے میں گزرنا، مر جانے یا ختم ہو جانے کے لیے آتا ہے اور جہاں سے تماشے کا گزرنا ایک حتمی واقعہ ہے جس کی باز آمد ممکن نہیں۔

شعر میں 'ہوا' ایک کثیر المفاہیم لفظ ہے۔ 'ہوا' کا ایک مفہوم خواہش نفس اور اُس کے متعلقات ہیں۔ دُنیا کے کسی منظر/تہذیبی نشانات یا ظفر اقبال کی زبان میں برگ تماشا، کے گزر جانے کے باوجود خواہش کا عکس اب بھی فضا میں لرزتا ہے۔ ہوا و ہوس میں سیرابی نہیں ہوتی، اس لیے تماشا ٹوٹ کر بکھر بھی جائے تو خواہش نفس ٹوٹے ہُوئے عکس کی صورت اب بھی ناآسودہ ہی رہے گی۔

'ہوا' کے مفہوم میں 'فنا' کی تعبیر بھی شامل ہے، سراج اورنگ آبادی کے مشہور مصرع:

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا

میں 'ہوا' کی تعبیر میں فنا موجود ہے۔ اسی طرح میر نے:

بُوئے گل و رنگ گل ہوتے ہیں ہوا دونوں

میں 'ہوا ہونا' فنا ہونے کے لیے نظم کیا ہے۔ 'ہوا' میں فنا کی تعبیر (Connotation) شامل ہونے کے سبب شعر سے مفہوم کی یہ جہت بھی برآمد ہوتی ہے کہ دُنیا پر فنا طاری ہے اور اب صرف فنا کا عکس ہے کہ فضا میں کانپتا ہے۔ یہ بات بھی قابل توجّہ ہے کہ دُنیا کو وقت کے حوالے سے

روانی یا حرکت کا کوئی پیکر (مثلاً دریا، سمندر وغیرہ) منتخب کرنے کے بجائے ظفر اقبال نے درخت کا جامد استعارہ نظم کیا ہے اور یہاں واقع ہونے والی ناگزیر تبدیلیوں کو تیز آندھی میں پتّوں کے ٹوٹ کر بکھرنے کے بے حد معنی خیز پیکر میں بیان کیا ہے۔ عام روش سے مختلف ایک بنیادی استعارہ کے مختلف اجزا کو ایک دُوسرے سے مربُوط کرنے کی یہ انتہائی عمدہ مثال ہے۔ پھر ''ہوا کے عکس'' کی تجرید اور برگ تماشا کے ٹوٹنے کا ٹھوس پیکر اس طرح ایک دُوسرے کے مقابل قائم کیا گیا ہے کہ شعر، معنی کی کئی ممکنہ جہات پر کھل جاتا ہے۔

غزل کے چھٹے شعر میں پیکر پھر بیئت غیر معمولی ہے۔ صدا کو راستہ کہنا اور پھر اس راستے میں ایک موڑ کے بعد سنگ ساری اور خوں باری کی منزل رکھنا، بے حد غیر روایتی طرز اظہار ہے۔ اگرچہ مضمون یہی ہے کہ بولنے والا سنگسار ہوتا یا خون میں نہاتا ہے۔ دُوسرے مصرع کی کشمکش نے اس صورت حال میں بشر کے خلقی خوف کو بالکل نمایاں کر دیا ہے کہ چُپ رہنا یا صدا کے اس موڑ سے واپس پلٹ آنا، جس کے آگے قتل و خون کا مرحلہ شروع ہوتا ہے، اپنے تحفّظ کے لیے آدمی کی فطری خواہش کا اظہار ہے، لیکن شعر کی ردیف نے پھر اسے غیر معمولی بنا دیا ہے۔ ہماری شعری روایت میں بولنے اور یہاں ردیف میں ''راستہ ہی تو ہے'' کہہ کر اس امکان کو قوی تر کہا جا رہا ہے کہ صدا کے اُس موڑ سے پلٹ جانا بھی ممکن ہے، جس کے آگے خشت و خوں کی چمک ہے۔ یہ اس نئے Pragmatic آدمی کی کشمکش ہے، جو ہماری شعری روایت کے مثالی آدمی سے مختلف اور اپنی بشری کمزوریوں سے پُوری طرح آگاہ ہے۔

جدید تر فلسفہ لسان میں، زبان کو ایک غیر حوالہ جاتی اکائی تصوّر کیا جاتا ہے، یعنی زبان خود اپنے علاوہ کسی شے یا اپنے نظام سے باہر کسی تصور کی نمائندگی نہیں کرتی۔ خود زیر تجزیہ غزل کے مطلعے میں یہی بات کہی گئی ہے۔ اس طرح صدا کا سفر خود اپنا راستہ بھی ہے اور اپنی منزل بھی۔ اس لیے اظہار کے اس نظام سے باہر قدم رکھنا، خود کو ایک یکسر مختلف صورت حال کے حوالے کرنا ہے۔ البتہ شعر میں ظفر اقبال سے مخصوص شوخی بھی موجود ہے: چُپ رہنا ممکن، بلکہ بعض صورتوں میں بہتر ہے، مگر صدا کی راہ پر پلٹ آنے کی کوئی منزل نہیں آتی۔

ساتویں شعر کا مضمون بھی اگرچہ نیا نہیں، لیکن اس کی لفظیات اور طرز اظہار ظفر اقبال سے مخصوص ہے۔ گناہ و ثواب کے تشبیہی تخالف کا متوازی جوڑا سیاہ و سفید ہے، گویا سیاہی گناہ کا نشان

اور ایسا زہر ہے، جو جسم میں سرایت کر جائے تو رُوح کو مضمحل یا مُردہ کر دے۔ شعر کے راوی کا جسم اسی سمِ سیاہ سے شاداب ہے کہ یہ خواہش روح یا جذبوں کے اتصال کی نہیں، بلکہ جسم کی ہے۔ محبت کے مادّی پہلو اور خالص جسمانیت کا یہ ایک غیر معمولی اظہار ہے۔ اور اس کی امتیازی صفت اُس وقت اور نمایاں ہو جاتی ہے، جب دُوسرے مصرع سے محبوب کا سامنے نہ ہونے کا پیکر اُبھرتا ہے۔ محبوب کا نقش آنکھوں کے نم نے مٹا دیا، لیکن اُس کا تصوّر جو شاعر کے نزدیک سمِ سیاہ کی صفت رکھتا ہے، اُس کے بدن کو سرسبز و شاداب کرتا ہے۔ ایک مختلف طریقے سے یہ مضمون ظفر نے ایک اور جگہ نظم کیا ہے:

اے ظفر وہ یار تھا کیسا کہ اُس کے نین نقش
خُون میں شامل تھے، آنکھوں کے لیے نایاب تھے

شعر میں استبعادی صُورتِ حال دو سطحوں پر نظم ہُوئی ہے۔ اوّل تو خود محبوب سامنے موجود نہیں، مگر اُس کی غیر موجودگی میں بھی ہوس کی حِدّت کم نہیں ہوتی اور ہوس یا مادّی وجود کی چاہت، جسے ظفر سمِ سیاہ کہتا ہے اپنی حِدّت سے اُسے مضمحل کرنے کے بجائے سرسبز کرتی ہے۔ یہ نمِ نگاہ اور سمِ سیاہ کی صفت ہے جس سے شعر کا راوی شاداب ہوا:

نمِ نگاہ تھی کیا شے، سمِ سراب ہے کیا
وہ زرق برق تھی کیسی یہ آب و تاب ہے کیا

آٹھویں شعر کے 'ساحلِ سزا' میں خشکی اور تری دونوں کا تصوّر موجود ہے کہ ساحل دریا کا ہوگا اور خشک ہوگا۔ مزید یہ کہ ساحل کا مُضاف الیہٗ 'سزا' لگا کر ظفر نے خود دریا کے مفہوم وقت اور اس کے ساتھ ہی اعمال کے نتائج کے مذہبی تصوّر کو نمایاں کر دیا۔ وقت کا بہاؤ اب اُس منزل تک آ گیا ہے، جہاں سزا، جزا کے تصوّرات ٹھوس شکل اختیار کرنے والے ہیں۔ "ملے گی خاک تو ـــ" میں مفہوم کے دو امکانات بہ یک وقت موجود ہیں، گویا آنکھیں اب تک جو کچھ دیکھتی رہی ہیں، اُس کے مقابلے میں آنکھوں میں خاک ڈالنا کہیں موزوں تر ہوگا یا آنکھوں نے اب تک کچھ نہیں دیکھا۔ اب ساحلِ سزا پر آنکھوں کو خاک تو ملے گی کہ ان بے منظروں کو کچھ تو نصیب ہوگا۔ اس مفہوم کا ایک لطیف پہلو یہ بھی ہے کہ آنکھوں نے جو کچھ دیکھا یا دوسری صُورت میں اگر کچھ نہیں دیکھا، تو یہ دونوں صُورتیں خود سزا کی حیثیت رکھتی ہیں اور اتنی سخت سزا کے مقابلے میں آنکھوں میں خاک

کہیں زم تر اور قابلِ ترجیح صُورت ہوگی کہ ساحلِ سزا پر اُترنے کی خواہش خود راوی کی ہے۔

آنکھوں میں دُھول کا مضمون ظفر اقبال نے مختلف طریقوں سے بہت تخلیقی سطح پر نظم کیا ہے:

آنکھیں اَٹی ہُوئی کسی ساحل کی ریت سے
منظر کُھلا ہُوا کسی دریا کے پار کا

اک دُھول سی جمی ہُوئی آنکھوں کے آس پاس
اک رنگ سا اُڑا ہُوا، دل کے نواح میں

شعر زیرِ تجزیہ کی ردیف نے پھر ایک غیر معمولی کیفیت کو معمول کی شے بنا دیا ہے۔ 'ساحلِ سزا پر اُترنا' ایک فیصلہ کن مرحلہ ہے اور اسے اس طرح بیان کرنا، گویا یہ عام سی بات ہے، ظفر اقبال کا امتیاز ہے۔

مقطعے میں برف کا Signifier ظفر کے یہاں ایک سے زیادہ تعبیرات کا حامل ہے، جن میں سب سے نمایاں جسم کی سفیدی مگر جنس کی خنکی ہے۔ اس مفہوم میں برف کا لفظ اُن کی کئی جگہ نظم ہُوا ہے:

بات کیا چلتی اندھیرا تھا بہت الفاظ میں
پوچھتے کس رنگ اُس کے عکس ہی برفاب تھے

اس سفید برفاب جسم پر بالوں کے رفتہ رفتہ سیاہی مائل ہونے کے لیے "سفید گھاس کے گھر سے دُھواں اُٹھنے" کا پیکر نہ صرف یہ کہ بہت مکمّل ہے، بلکہ اس کیفیت کے قائم کرنے میں معاون ہو رہا ہے۔ جس کا ذکر شعر کے پہلے مصرع میں ہے۔ برف (یعنی سفید مگر حرارتِ جنس سے عاری جسم) کی بنیاد، اس دُھوئیں کے ساتھ ہی جلنے لگتی ہے۔ برف اور آگ کے تضاد کو ظفر نے برف اور دُھوئیں کے باہمی ربط میں تبدیل کر دیا ہے اور اب اس دُھوئیں کی نمو کے ساتھ، برف کی کیفیت میں تبدیلی ہو رہی ہے۔ مصرعِ اُولیٰ میں 'ابھی' کے اضافے سے ایک تو کم عمری میں ہی جنسی خواہش کے رفتہ رفتہ بیدار ہونے کا اشارہ پیدا ہوتا ہے اور دوسرے مستقبل میں اس خواہش سے پیدا ہونے والی شدید کیفیت کی طرف اشارہ بھی ہو گیا ہے۔ جنس کے متعلق ظفر کا مادّی و جسمانی رویّہ اُن کے تنقید نگاروں کے درمیان بحث کا موضوع رہا ہے۔ ظفر نے عہدِ حاضر کے آدمی کی کیفیات کو اسی مادّی سطح پر برتا ہے جس پر یہ جدید آدمی زندگی گزار رہا ہے۔ اس لیے جنس کے مادّی تجربوں یا اعضا کے استعاراتی بیان کی کسی سطح اُس کے اشعار میں بہت نمایاں ہے۔

زیرِ تجزیہ غزل ظفر اقبال کے تخلیقی امتیازات کے کئی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔ خصوصاً لفظ کے نئے روابط کی دریافت، زبان کی حسی کیفیت، غزل کی شعری روایت سے استفادہ کی تخلیقی سطح اور مضامین کی معاصر معنویت کے مختلف جہات اس غزل میں ملتزم ہوئے ہیں، جن سے ظفر اقبال کی پہچان قائم ہوتی ہے۔

-☆-

قاضی افضال حسین
صدر شعبہ اُردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
(ماخوذ از ''غزل تنقید'' مرتبہ: اسلوب احمد انصاری)

دل کی گنتی نہ یگانوں میں نہ بیگانوں میں
لیکن اُس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

## محمد حنیف رامے کی یاد میں

کوشش تو بہت ہم بھی کیا کرتے ہیں، لیکن
حق بات ہے یہ، کام تمھارا ہے زبردست

میں پیمبر نہیں، یگانہ سہی
اس سے کیا کسر شان میں آئی
مرزا یاس یگانہ چنگیزی

کھیت پہ ہے نہ تھان پہ ہے تُو
کس انوکھی اُڑان پہ ہے تُو

ساتواں تو میں ڈھونڈ آیا ہوں
کون سے آسمان پہ ہے تُو

حمد کرتے ہیں رات دن گونگے
توتلوں کی زبان پہ ہے تُو

میں کسی دن مکر بھی سکتا ہوں
خوش جو میرے بیان پہ ہے تُو

جسم جلنے لگا جدائی میں
اک مصیبت سی جان پہ ہے تُو

سر پہ دنیا کے سائبان ترا
اور، کہیں سائبان پہ ہے تُو

جس نشاں پہ بھی میں پہنچتا ہوں
اُس سے اگلے نشان پہ ہے تُو

دل سے باہر قطار میں ہوں لگا
دستیاب اس دکان پہ ہے تُو

کس طرح تجھ سے بچ کے جائے ظفر
راستے میں مچان پہ ہے تُو

☆

ابر پر، کوہسار میں ہے تُو
ہر شمار و قطار میں ہے تُو

مجھ سے مایوس ہو چکا ہے بہت
یا مرے انتظار میں ہے تُو

تجھ سے کوئی جگہ نہیں خالی
اک نئے انتشار میں ہے تُو

یوں کہیں بھی نہیں قرار تجھے
اور، پھر بھی قرار میں ہے تُو

صاف مجھ کو نظر نہیں آتا
کس طرح کے غبار میں ہے تُو

میں جو دریا نہیں کیا ہے عبور
آر میں ہے کہ پار میں ہے تُو

کر چکا ہوں سفر کی تیاری
کون سے رہگزار میں ہے تُو

میرے تیر و تبر ہوئے بے کار
ایسے پختہ حصار میں ہے تُو

دم بخود ہے چمن میں آ کے ظفر
پھول میں ہے کہ خار میں ہے تُو

☆

زخم کے اندمال میں ہے تُو
کِسی خواب و خیال میں ہے تُو

کبھی میرے کمال میں تُو تھا
اب مرے ہی زوال میں ہے تُو

مَیں ہی تیری مدد کو آؤں گا
کب سے میرے وبال میں ہے تُو

وہ بظاہر تو ہے بہُت بے حال
جس کی بھی دیکھ بھال میں ہے تُو

کُشت و خُوں تیرے نام پر ہے یہاں
ہر جدال و قتال میں ہے تُو

کِس طرف کو نکل کے جائے گا
اب تو میرے ہی جال میں ہے تُو

مَیں ہُوں کیا اور مری جسارت کیا
کہ مری ہر مجال میں ہے تُو

کبھی میرے بیانِ شوق میں ہے
کبھی عرضِ ملال میں ہے تُو

چاہتا ہے کوئی جواب ظفرؔ
معرضِ ہر سوال میں ہے تُو

☆



شورِ دریائے خواب تُجھ سے ہے
سایۂ آفتاب تُجھ سے ہے

تُو ہی موضوعِ گفتگو ہے تمام
ہر سوال و جواب تُجھ سے ہے

مَیں نے برباد کر لیا خُود کو
میرا حال خراب تُجھ سے ہے

وہ کسی اور سے نہیں ممکن
جو عذاب و ثواب تُجھ سے ہے

کوئی جلدی نہیں مُجھے کہ ابھی
میرا باقی حساب تُجھ سے ہے

سب کو چھوڑا ترے سہارے پر
خیمۂ بے طناب تُجھ سے ہے

غُصّہ ہے تیری اِتنی دُوری پر
غم کوئی ہم رکاب تُجھ سے ہے

مست رکھتی ہے کیا مہک اُس کی
داغِ دِل کا گُلاب تُجھ سے ہے

جس قدر ہے ظفرؔ کے ہونے کا
یہ حضور و غیاب تُجھ سے ہے

☆

میرا رنگِ کلام تجھ سے ہے
گم شدہ سا یہ نام تجھ سے ہے

حمد یوں ہی نہیں کیا کرتا
کوئی مجھ کو بھی کام تجھ سے ہے

اور کوئی شناخت اِن کی نہیں
یہ دریچہ ، یہ بام تجھ سے ہے

شور ہے دل میں ہر گھڑی ، ہر وقت
اور ، یہ رونق تمام تجھ سے ہے

میری ترجیح اوّلیں رہنا
یہ گزارش مدام تجھ سے ہے

جس کی قسمت میں بھی اسیری ہو
دانہ تجھ سے ہے ، دام تجھ سے ہے

اس ہوس کا خمار تیرے طفیل
اس ہوا کا خرام تجھ سے ہے

گریۂ ہجر کے ہیں سب اوقات
صبح تجھ سے ہے ، شام تجھ سے ہے

کیوں نہ ٹھہرے اُمیدوار ظفرؔ
رحمتِ خاص عام تجھ سے ہے

☆

اپنی چِتا سناؤں گا تجھ کو
اور بھی آزماؤں گا تجھ کو

تُو کہ جو بن چکا ہے سارا ہی
اور بھی کچھ بناؤں گا تجھ کو

مسندِ خواب ہے تری خاطر
کبھی اس پر بٹھاؤں گا تجھ کو

گم کروں گا خُماروں میں تجھے
کبھی کھو کر ہی پاؤں گا تجھ کو

تُو بھی حیران ہو کے رہ جائے
بات ایسی بتاؤں گا تجھ کو

مَیں کروں گا تری حفاظت بھی
پہلے خود سے بچاؤں گا تجھ کو

کبھی اوڑھوں گا کھیس کی صورت
کبھی نیچے بچھاؤں گا تجھ کو

خود بھی آباد ہو رہوں گا وہیں
ایسی بستی بساؤں گا تجھ کو

چھپ چھپا کر ظفرؔ سے مَیں اک رات
کبھی ملنے بھی آؤں گا تجھ کو

☆

کچھ اس طرح کا یہ فسانہ ہے تجھ سے
سُنانا ہے تجھ کو، چھپانا ہے تجھ سے

رکی سانس کی آس اک تیرے دم پر
یہ ہنگامۂ آب و دانہ ہے تجھ سے

میں اپنے زمانے کو خود سہہ رہا ہوں
میرے بعد اگلا زمانہ ہے تجھ سے

کبھی دُوبدُو بھی ملاقات ہو گی
تعلق ابھی غائبانہ ہے تجھ سے

کبھی بھیج اس رُوئے زیبا کی تصویر
یہی ایک تحفہ منگانا ہے تجھ سے

ہٹائے ہیں اب تک بہت سارے پردے
ابھی ایک پردہ ہٹانا ہے تجھ سے

کہاں ہے تُو اے موجۂ باد و باراں
دیا میں نے اپنا بجھانا ہے تجھ سے

میں ہتھیار اب ڈال ہی دوں کسی دن
نیا روز کوئی بہانہ ہے تجھ سے

ابھی تو شروعات ہیں عاشقی کی
ظفر نے ابھی دل لگانا ہے تجھ سے

☆

کبھی دن سے باہر، کبھی رات میں تُو
بکھرا ہے کچھ ایسے طلسمات میں تُو

کسی شب گُزر گریۂ گرم سے بھی
کسی شام آ میری برسات میں تُو

سُنا تو کر ایک آدھ شیون ہمارا
ہُوا کر نہ شامل کسی بات میں تُو

شمار اور ہی کوئی تیرا ہے، ورنہ
یہ قلت میں ہے اور نہ بہتات میں تُو

کہاں تک یہ زیر و زبر چل رہا ہے
مسلّم سا ہے اپنے درجات میں تُو

بہت دُور جا کر تجھے ڈھونڈنا کیا
خصائل میں ہے، اور، عادات میں تُو

تجھے دُوسروں کی کہاں کوئی فرصت
ابھی مست ہے اپنی ہی ذات میں تُو

کبھی ہے ستاروں کے جرگے میں شامل
کبھی کہکشاؤں کی بارات میں تُو

بہار آفریں ہو رہے گا، ظفر، خود
اگر جھانک لے اُس کے باغات میں تُو

☆

جھجکتے ہے ہرگز نہ ڈرنے سے تُو
ملے گا مجھے جست بھرنے سے تُو

نظر آئے گا صاف بہتا ہُوا
کہیں لہر بن کر اُبھرنے سے تُو

ترا سلسلہ ہی کوئی اور ہے
نہ جینے سے ہے اور نہ مرنے سے تُو

بلندی پہ ہو جائے گا فائز اور
کہیں میرے اندر اُترنے سے تُو

ابھی تیرا ہونا نہیں کھل سکا
کہ چلنے سے ہے یا ٹھہرنے سے تُو

کوئی اور کیا ہو گا صُورت پذیر
اُبلتا ہے جس طرح جھرنے سے تُو

سبھی کام تیرے ہیں، پھر کس لیے
خفا ہے کوئی کام کرنے سے تُو

وہ کیا حُسن ہو گا کہ غافل نہیں
کسی لمحے بننے سنورنے سے تُو

کھلیں کیسے پانی کے معنی، ظفر
کہ ڈرتا بھی ہے پانو دھرنے سے تُو

☆

شام تُو ہے مری، سحر تُو ہے
میں نہیں ہُوں کہیں اگر تُو ہے

میری خاموشیوں کا تُو ہم راز
میری آواز میں اثر تُو ہے

کسی افواہ کی وضاحت سی
کسی اخبار میں خبر تُو ہے

کائنات ایک سرد و گرم کہیں
ایک دُنیائے خشک و تر تُو ہے

دھوپ ہے کوئی کڑکڑاتی ہُوئی
دُور تک سایۂ شجر تُو ہے

اس مکاں کا نہیں مکیں، لیکن
پھر بھی اک نازِ بام و در تُو ہے

تجھ سے بھرپُور ہیں زمان و مکاں
ہے یہاں، اور، کس قدر تُو ہے

میں اسی راستے سے جاتا ہُوں
منزلِ دل کی رہگزر تُو ہے

ہے ظفر تو برائے نام یہاں
تُو ہی تُو، اور سربسر تُو ہے

☆

نام تُو ہے مرا، نسب تُو ہے
اور کچھ بھی نہیں ہے، سب تُو ہے

کچھ سمجھ ہی تری نہیں آئی
قصۂ مختصر، عجب تُو ہے

چلو، مَیں بھی یہی سمجھ لُوں گا
سب سمجھتے ہیں میرا رب تُو ہے

کب نہیں تُو، مجھے یہ بتلائیں
مجھ سے کیا پُوچھتے ہیں کب تُو ہے

تیرا ہونا ہی کم نہیں ہے یہاں
اور کیا چاہیے ہے جب تُو ہے

جو بھی شے ہے ترے سبب سے ہے
یعنی ہر چیز کا سبب تُو ہے

روز ہوتی ہے تیری افزائش
کہیں پہلے سے زائد اب تُو ہے

یہ الگ بات ہے نہ ہو پُوری
کچھ تمنا ہے، کچھ طلب تُو ہے

طرز اُس کا ہے کوئی خاص، ظفر
اور، اپنا ہی کوئی ڈھب تُو ہے

-☆-

یُوں سفر کا ہے استعارہ تُو
یا سمندر ہے یا ستارہ تُو

اپنے ہی خواب کی حدِ فاصل
اپنے ہی بحر کا کنارا تُو

ہم فسادی، فریب کاروں سے
کر رہا ہے بہت گزارہ تُو

پھر تری بے رُخی پہ مرتے ہیں
اپنا معشوق ہے دوبارہ تُو

سب مظاہر ہیں جابجا تیرے
ہمیں لگتا ہے پارہ پارہ تُو

کبھی پرہیز مجھ سے ہو نہ سکا
مَیں ہُوں بیمار، میرا چارہ تُو

نقش کیا کیا تھے، یاد ہی نہیں کچھ
ہے وہ بھولا ہُوا نظارہ تُو

خاص کر جوشِ دل بڑھانے کو
رہ گیا ہے بس ایک نعرہ تُو

سبز بتّی کا منتظر ہے ظفر
کب کرے گا کوئی اشارہ تُو

-☆-

وہم تیرا ہے گماں تیرا ہے
اور، یہ سارا جہاں تیرا ہے

بود و باش اس میں نہیں کیوں تیری
یہ جو آباد مکاں تیرا ہے

بے نشاں بھی ہے، مگر کیا کہئے
ہر نشانی میں نشاں تیرا ہے

عزت افزائی مری اور ہو کیا
بات میری ہے، بیاں تیرا ہے

من کا مندر ہے اجالا تجھ سے
دیپ تیرے ہیں، دھواں تیرا ہے

یہی رسوا ہے زمانے بھر میں
یہی دل مرتبہ داں تیرا ہے

آبِ انکار ہے جاگیر تری
اور، کراں تا بہ کراں تیرا ہے

تجھ سے باغی بھی ہے خلقت، لیکن
پھر بھی ہر پیر و جواں تیرا ہے

بندہ ظاہر میں ہی تیرا ہے ظفر
اصل میں ورنہ کہاں تیرا ہے

☆

میرے ہر سمت ہوا ہے تیری
اور، ہوس دل میں جدا ہے تیری

کاٹتا ہوں میں جسے شام و سحر
سوچنا ایک سزا ہے تیری

ناز نخرے ہیں کئی اس سے سوا
کائنات ایک ادا ہے تیری

جو نہیں تو نے دیا عاجز کو
وہ بھی سمجھیں تو عطا ہے تیری

لفظ کے بھید ہیں تیرے اندر
اور، طبیعت بھی رسا ہے تیری

دھوپ تیری ہے مرے صحرا میں
میرے گلشن میں صبا ہے تیری

میرے ہونے میں نہ ہونا میرا
یہ بھی اک اپنی رضا ہے تیری

کیسے ہوتا ہے گزارہ تیرا
کہ بدن ہے نہ قبا ہے تیری

بچ نہ پائے گی ظفر سے دنیا
یہ بھی اک طرفہ بلا ہے تیری

☆

قید ہو کر ہی قفس میں تیرے
مَیں بھی آخر ہُوا بس میں تیرے

مَیں لگا ہی نہیں پاؤں گا حساب
ہفتہ و ماہ و برس میں تیرے

خوشبوئیں جمع سبھی پھولوں کی
عطر سارے ہیں نفس میں تیرے

داستاں دیو و پری میں یکسر
تذکرے جن و انس میں تیرے

تُو ہی اطراف و جوانب کا امیں
ہے کوئی پیش نہ پس میں تیرے

تجھی چھونے کی نہیں گنجائش
موت ہوگی کوئی مس میں تیرے

ذرّۂ خاک میں جلووں کا ظہور
ہیں قرینے وہی خس میں تیرے

روز ہنگامہ ہوا کا سرِ باغ
شہد کے شور مگس میں تیرے

ہو ظفرؔ کا بھی شمار اور قطار
ہے یہ دو چار نہ دس میں تیرے

☆

یہ جہاں طرفہ بنایا تُو نے
کیا تماشا سا دکھایا تُو نے

مہرباں ہو کے بنائی ہر چیز
دھوپ چھوڑی ہے نہ سایا تُو نے

دی جہاں پانیوں کو خاموشی
شور بھی ایک اُٹھایا تُو نے

ساتھ ہی سات گرائے پردے
ایک پردہ جو ہٹایا تُو نے

عُمر اتنی مُجھے درکار نہ تھی
کیا کیا ہے یہ خدایا، تُو نے

ہمیں اس دہر میں بھیجا دے کر
واپسی کا بھی کرایہ تُو نے

آئے ہیں تیرے ارادے سے یہاں
چل پڑیں گے جو بُلایا تُو نے

ہم سے کوئی بھی نہیں ہو پایا
کام جو جو بھی بتایا تُو نے

کام تھے اور ظفرؔ کو لیکن
کیسے دھندے پہ لگایا تُو نے

☆

سانس تیرے لیے ، سر تیرے لیے
میری ہر شے ہے مگر تیرے لیے

دل میں ہونا ہے سفیدی باقی
کہ بنایا ہے یہ گھر تیرے لیے

تُو نے بخشا تھا جو ارحم ہو کر
آج سے ہے یہ ہنر تیرے لیے

تُو نظر آئے نہ آئے ، لیکن
ہے بچایا یہ نظر تیرے لیے

سر میں رہتی ہے عجب طغیانی
دل میں اُٹھتے ہیں بھنور تیرے لیے

تُو اُنہی پر کبھی ظاہر ہوتا
جو ہُوئے خانہ بدر تیرے لیے

کیا ندامت بھی تُجھے ہوگی قبُول
خجھ لاتا ہو اگر تیرے لیے

مَیں لبِ خشک ہی لایا ہُوں فقط
اور ، یہ دیدۂ تر تیرے لیے

اب نمازی ہے ظفر سا کافر
ہے نئی ایک خبر تیرے لیے

☆

نُور ظہور کا ہالہ تُو
تاریکی میں اُجالا تُو

کہاں چھپا ہے اب جا کر
اپنا دیکھا بھالا تُو

کیا کُچھ کرتا رہتا ہے
ہم سے بالا بالا تُو

اپنے خزانے لُوٹیں آپ
کھول دلوں کا تالہ تُو

تازہ کر دیتا ہے نظر
ایسا نیا نرالا تُو

کاروباروں میں سب نفع
نقصانوں میں ازالہ تُو

عیب چھپائے ہر ہر کے
پردے پوش دوشالہ تُو

بخشش کی برسات بھی ہے
رحمت کا پرنالہ تُو

نہیں ظفر کی کوئی بساط
اس کا حرف حوالہ تُو

☆

مسکینوں کے سہارے تم
اور، سارے کے سارے تم

ہمیں تمھارے نہیں ہوئے
لیکن صرف ہمارے تم

ہم اندر باہر تاریک
نور ہی نور نظارے تم

آنکھیں ہیں تاریک فلک
اور، آنکھوں کے تارے تم

اور کسی سے نہیں اُمید
پہنچو لگتے چارے تم

نقد ہمارے پاس نہیں
ملتے نہیں اُدھارے تم

نام ہی لیں تو آئے مزہ
ایسے تلگو کرارے تم

عید پڑی ہے مشکل سے
آؤ خواب کنارے تم

سودا بکتا نہیں، ظفر
کیسے ہو بنجارے تم

☆



پگلے ہو اور بچے تم
اور، ہو سب سے اچھے تم

باپ نہیں، بیٹے بھی نہیں
اور، نہ تائے چچے تم

بہلا سکیں عبادت سے
نہیں ہو ایسے بچے تم

اوروں کے بھی ہو معشوق
اور، ہمیں بھی جچے تم

بوڑھوں کو دیتے ہو سبق
کہیں پڑھاؤ بچے تم

اُسی بلندی سے آ کر
ہم جیسوں میں رچے تم

تمھیں بھی دھوکا دیتے ہیں
لے جاتے ہو چچے تم

تھرتھری رہتی تھی خلقت
بھانبڑ بن کے مچے تم

ظفر، خدا مانا کہ نہیں
اتنا ناچ تو نچے تم

☆

ہمیں تھما کر کاسے تم
دیتے رہے دلاسے تم

ہم کرتوت کریں گے کیا
رہے جو آسے پاسے تم

دریا ہو اتنے بھرپور
رکھنا اور نہ پیاسے تم

ہم لنگڑے، لولے، معذور
باتیں کرو ہوا سے تم

اور، اعمال ہمارے پہ
لگتے ہوئے خفا سے تم

گھایل کرتے ہو سب کو
اپنی اسی ادا سے تم

موقع ہے، کچھ عرض کریں
مہربان ہو خاصے تم

گلی گلی میں بچوں کو
بانٹتے پھرو پتاسے تم

پکڑے ہی جاؤ گے، ظفر
اک دن ہاسے ہاسے تم

☆

کتنے ہو، کیسے ہو تم
کوئی نہیں جیسے ہو تم

تبدیلی نہیں آئی کچھ
ویسے کے ویسے ہو تم

کوئی مثال نہیں ملتی
جو کہہ دیں ایسے ہو تم

کر لیں جو بھی خریداری
پاؤ تھی، اور پیسے ہو تم

رکھیں گے تعویذ بنا
قیمتی اک شے سے ہو تم

کانوں میں رس گھولتی ہے
کوئی عجب لے سے ہو تم

مست ہیں پے بغیر ہی سب
ایک ایسی نے سے ہو تم

غور بھی کرتے ہیں بے شک
پہلے ہی طے سے ہو تم

جانتے ہیں سب تمھیں، ظفر
جو ایسے تیسے ہو تم

☆

آنی جانی تجھ سے ہے
دُنیا فانی تجھ سے ہے

بات زبانی تجھ سے ہے
مطلعِ ثانی تجھ سے ہے

قصّہ کوتہ ، یہ ساری
رام کہانی تجھ سے ہے

کپڑا لتّہ تیرے طفیل
دانہ پانی تجھ سے ہے

ہندوستانی تیرا رُوپ
پاکستانی تجھ سے ہے

واجپائی ہے تیرا داس
اور ، اڈوانی تجھ سے ہے

وہ نہری تیرے کارن
یہ بارانی تجھ سے ہے

تیرے بدولت گوری کالی
نئی پُرانی تجھ سے ہے

کہیں ظفر کو روک ، بھلا
یہ سیلانی تجھ سے ہے

-☆-

باطن تُو ، ظاہر بھی تُو
اوّل بھی ، آخر بھی تُو

تُو ہی زیارت ہے سب کی
اور ، اپنا زائر بھی تُو

قاسم بھی تُو ہی ٹھہرا
جمع کرے خاطر بھی تو

کچھ کا کچھ کر دے پل میں
ایک ایسا ساحر بھی تُو

سب جیسا اور سب سے الگ
عام بھی ہے ، نادر بھی تُو

تیرا نہیں حساب کتاب
کم بھی تُو ، وافر بھی تُو

شعر شعور بھی سب تیرا
سب سے بڑا شاعر بھی تُو

آزمائشوں میں بھی رکھے
ہر شے پہ قادر بھی تُو

دیتا نہیں سُجھائی ، ظفر
اور ، یہاں ناظر بھی تُو

-☆-

پردہ حُرمت اُتارا تُو نے
رکھا بھرم ہمارا تُو نے

گنجایش نہیں اور کسی کی
ایسا پانو پسارا تُو نے

کیا ہے دھوکا کھا کے ہمارا
اعتبار دوبارہ تُو نے

ہم نے کر دی سُنی اَن سُنی
سو سو بار پُکارا تُو نے

آنکھیں پتھرا گئیں ہماری
روک رکھا نظارہ تُو نے

دل کے خس وخاشاک میں پھینکا
ایسا کوئی شرارہ تُو نے

قطرے قطرے کو ترسا کر
کھول دیا فوّارہ تُو نے

ہم تو کسی قابل ہی نہیں تھے
بوجھ اُٹھایا سارا تُو نے

اِنتظار ہی رہا ظفؔر کو
کیا نہ کبھی اِشارہ تُو نے

-☆-

دن اور رات ہیں تیرے
سب اوقات ہیں تیرے

گھاس پھُونس سے لے کر
پھُول پات ہیں تیرے

کسی نے مُنہ نہ لگایا
اب ہم ساتھ ہیں تیرے

کھیل تھا یہی ہمارا
جیت مات ہیں تیرے

سائبان کی صُورت
سر پہ ہاتھ ہیں تیرے

آبادی کے علاوہ
شاملات ہیں تیرے

تُو سُورج ہے، اور، ہم
سب ذرّات ہیں تیرے

وہی ہمارے بھی ہیں
جو حالات ہیں تیرے

اب تو ظفؔر جیسے ہی
باقیات ہیں تیرے

-☆-

جی اور جان ہمارے
اے بھگوان ہمارے

تیری حفاظت میں ہیں
سب سامان ہمارے

راہ کٹھن ہے کتنی
گاڑی بان ہمارے

تیری اردل میں ہیں
مولا خان ہمارے

لپٹے ہوئے ہیں کب سے
دسترخوان ہمارے

کھول کسی دن آ کر
روشن دان ہمارے

پانی پانی کرتے
سوکھے دھان ہمارے

آنکھیں ڈری ڈری سی
دل حیران ہمارے

اچھا کیا ، ظفر ، نے
کھولے کان ہمارے

☆

جو بھی کام تمھارے ہیں
سب انعام تمھارے ہیں

کیا کہیے ، بندے کتنے
بے آرام تمھارے ہیں

جتنا بھی کر لیں آغاز
سب انجام تمھارے ہیں

آسمان اور دھرتی پر
پھیلے دام تمھارے ہیں

ہیں آزاد طبیعت بھی
اور ، غلام تمھارے ہیں

کہنے کی حد تک تو ہم
صبح و شام تمھارے ہیں

پچھتاووں کے اثاثے بھی
سارے نام تمھارے ہیں

سہتے ہیں سینے پر جو
دکھ الزام تمھارے ہیں

حمد بھی اس کی ہے ظفر
اور ، کلام تمھارے ہیں

☆

دل میں گماں سب تیرا ہے
نام و نشاں سب تیرا ہے

کاروبار ہمارے ہیں
سود و زیاں سب تیرا ہے

اس میں بود و باش تو کر
اب یہ مکاں سب تیرا ہے

اس پہ رکھا کر ہاتھ اپنا
قریۂ جاں سب تیرا ہے

اگر مگر کے ساتھ ہی ساتھ
چون و چناں سب تیرا ہے

دل کچھ دیر کو ہے میرا
بعدازاں سب تیرا ہے

میرا بھی کہتے ہیں اسے
شور فغاں سب تیرا ہے

میرا کچھ بھی نہیں یہاں
یعنی یہاں سب تیرا ہے

ہے توفیق ظفر کی ، بس
اور ، بیاں سب تیرا ہے

☆

تُو ہے صبح سویرے میں
اور ، آنکھوں کے اندھیرے میں

اب تو کوئی فرق نہیں
تیرے میں اور میرے میں

دن کی محنت میں ہے تُو
تُو ہی رین بسیرے میں

کب مہمان کرو اپنا
آؤں تمھارے ڈیرے میں

کب تک رہنا ہے آزاد
آ جاؤں گا گھیرے میں

سارا زور ہوا کا تھا
اُڑتے ہوئے بکھیرے میں

فرق ذرا سا ہے باقی
شیرو میں اور شیرے میں

مجھے ثواب یہاں پہنچا
مسجد بنی ہے بھیرے میں

قابو آ جاؤں گا ، ظفر
میں پہلے ہی پھیرے میں

☆

اپنے چاند ستارے ہوں گے
جس دن آپ ہمارے ہوں گے

مٹ جائے گا فاصلہ سارا
جب اللہ کو پیارے ہوں گے

مُلاقات ہو گی ایسے میں
سب ہوں گے اور سارے ہوں گے

کام آئیں گے وہی لمحے جو
تیرے ساتھ گزارے ہوں گے

سب کچھ سامنے آ جائے گا
جتنے کاج سنوارے ہوں گے

میل ہمارے آپ کے آخر
شاید خواب کنارے ہوں گے

بعد میں ہو سکتی ہے مُعافی
پہلے خُوب نتارے ہوں گے

سب سے پیچھے، سب سے آخر
ہم جیسے بے چارے ہوں گے

ہم بھی، ظفر، ڈرتے ہیں، وہاں پر
جو احوال تمہارے ہوں گے

☆

اپنے خواب دکھایا کر
دل سے دُور نہ جایا کر

پیاس بہت ہے، پانی دے
دھوپ بہت ہے، سایا کر

ہمیں تو جانا ہے اک دن
تُو بھی آیا جایا کر

ہم سے کوئی سُنا کر بول
کوئی بات بتایا کر

چھوڑ ڈرانا دھمکانا
پیار سے پاس بٹھایا کر

مانتے ہیں سردار تجھے
تُو بھی ہمیں رعایا کر

سب کچھ تیرا ہے، تُو بھی
خُوب پیا اور کھایا کر

سارے بولتے رہتے ہیں
تُو بھی کچھ فرمایا کر

سُن لے گا وہ بھی، ظفر
رویا کر اور گایا کر

☆

اعلیٰ تُو ہے ، عالی تُو ہے
مُلکِ سخن کا والی تُو ہے

ویرانی ہے گُل بُوٹوں پر
اور ، اس باغ کا مالی تُو ہے

چور اب کسے بنائیں اپنا
کرتا تو رکھوالی تُو ہے

کھڑے کھڑے بُت بن گئے سارے
جس نے سیٹ سنبھالی ، تُو ہے

نام ترا بُھولے ہیں ، ورنہ
صُورت دیکھی بھالی تُو ہے

پھر آواز کہاں سے آئے
ایک ہاتھ کی تالی تُو ہے

کائنات ہے تیرے اندر
کائنات سے خالی تُو ہے

کہیں نہیں ہے تیرے جیسا
کوئی چیز نرالی تُو ہے

اصل ، ظفر ، کہتا ہے خُود کو
نقلی تُو ہے ، جعلی تُو ہے

-☆-

دل کا راج دُلارا تُو ہے
اور ، آنکھوں کا تارا تُو ہے

ہم ہی نہیں تُمھارے ، ورنہ
پُورم پُور ہمارا تُو ہے

کڑوا مُنہ ہی لیے پھرتے ہیں
اور ، امرت کی دھارا تُو ہے

باقی سب آدھے پونے ہیں
اور ، سارے کا سارا تُو ہے

بند آنکھوں سے دیکھوں تُجھ کو
وہ مستُور نظارا تُو ہے

سُوکھ رہی پُھلواڑی اپنی
رحمت کا فوّارہ تُو ہے

پریم پتر پہنچائے سب کو
گلی گلی ہرکارہ تُو ہے

جلتی دُھوپ کے ہمسائے میں
میرا شام کنارہ تُو ہے

فارغ ہے بچّوں بالوں سے
میری طرح کُنوارا تُو ہے

-☆-

دل کی بے آرامی تُو ہے
اک تشویش دوامی تُو ہے

شیر و شکر کیسا ہے سب میں
خاصی تُو ہے، عامی تُو ہے

مجھے اور درکار نہیں کچھ
میرا خواب تمامی تُو ہے

پانو نہیں ٹکتے ہیں زمیں پر
جب سے میرا حامی تُو ہے

میری ہر خصلت ہے تُجھ سے
خُوبی تُو ہے، خامی تُو ہے

فانی ٹھہرایا ہے مُجھ کو
اور، دوام انجامی تُو ہے

جب بھی کاٹوں گا تیری
موٹی خُوب اسامی تُو ہے

کبھی الیکشن ہی لڑ لیتا
اچھا بھلا عوامی تُو ہے

اور، ظفر، کیا تُجھے چاہیے
کامیاب ناکامی تُو ہے

-☆-



پُھول ہیں تیرے، پات ہیں تیرے
یہ سارے باغات ہیں تیرے

جہاں تہاں تیری ہے رسائی
کتنے لمبے ہاتھ ہیں تیرے

جب سے ساتھ ہمارے تُو ہے
تب سے ہم بھی ساتھ ہیں تیرے

ہم نے ساتھ نبھانا ہے اب
جیسے بھی حالات ہیں تیرے

ہم سے مت ناراض ہُوا کر
پیارے، ہم تو ناتھ ہیں تیرے

میری سوچ بھی جا نہیں سکتی
جہاں جہاں اثرات ہیں تیرے

میری عرض گزاری اِتنی
باقی فرمودات ہیں تیرے

میری خطائیں بھی نہیں اِتنی
جتنے احسانات ہیں تیرے

بچ کر ظفر کہاں جا سکتا
نئے نئے آلات ہیں تیرے

-☆-

بخشش کافی دے مولا
مجھے مُعافی دے مولا

توبہ کر لوں جی بھر کے
عُمر اضافی دے مولا

ٹانکا پڑا بھی کر پاؤں
فن سرّافی دے مولا

عدل مجھے درکار نہیں
لطف الطافی دے مولا

خالص مہر کی ڈال نظر
جو ہے صافی ، دے مولا

جنت اگر نہیں منظور
گھر اعرافی دے مولا

چکر لگیں ترے گھر کے
طرز طوافی دے مولا

ساری دُنیا آئے نظر
آنکھ اطرافی دے مولا

بچّہ ہے ، بھوکا ہے ظفر
اس کو ٹافی دے مولا

☆

بھوکا ہے دل ، بھات چاہیے
اور ، کُچھ اُس کے ساتھ چاہیے

دن درکار ہے مزدوری کو
نیند آتی ہے ، رات چاہیے

سب کُچھ ہے موجُود و مُیسّر
صرف اب تیری ذات چاہیے

فضل چاہیے ہر دم تیرا
اور ، اُس کی بہتات چاہیے

پُوری دید اگر نہیں ممکن
اِک تھوڑی سی جھات چاہیے

دعویٰ کوئی نہیں ہے اپنا
اندھے کو خیرات چاہیے

دُنیاداری کے اس کھیل میں
مجھے مُکمّل مات چاہیے

پانو تلے یہ زمیں کافی ہے
سر پہ تیرا ہاتھ چاہیے

جس سے ظفر نکلے نہیں باہر
اپنی اُسے اوقات چاہیے

☆

آدھا کر یا سارا کر
کچھ تو کام ہمارا کر

موقع پھر اک دے ہم کو
یہ احسان دوبارہ کر

دخل ہمارا کِتنا تھا
تُو ہی بیٹھ نتارا کر

ہاتھ سے نکلا جاتا ہُوں
آ ، اور کوئی چارہ کر

لوگ سمجھ ہی جائیں گے
تُو کوئی بھی اشارہ کر

ہم جتنے بھی ہیں بدکار
تُو ہم سے نہ کنارہ کر

جھلمل سی اک لگی رہے
میری سوچ ستارہ کر

ہم جیسے بھی ہیں ، مولا
صابر ہے تو گزارہ کر

سُن لے گا وہ بھی ، ظفر
بیٹھا عرض گزارا کر

-☆-

جا سکتے ہو ، آ سکتے ہو
بگڑے کام بنا سکتے ہو

اُوجھڑ خُدائی کے ہو تُم ہی
سارا بوجھ اُٹھا سکتے ہو

دو جانُوں مرے کاندھوں پر
کیسے تُرت بِٹھا سکتے ہو

جنّت کے رنگیں دعووں سے
سب کا دل بہلا سکتے ہو

چاہو تو چپکے سے کان میں
کوئی بات بتا سکتے ہو

جانتے ہو احوال سبھی کا
اپنا بھید چھپا سکتے ہو

کائنات کے اندر باہر
یُوں خُود کو پھیلا سکتے ہو

تُم سے پہلے یہاں کون تھا
کیا اتنا بتلا سکتے ہو

بات ، ظفر ، سُن لی ہے تُمھاری
سوچیں گے ، اب جا سکتے ہو

-☆-

دُنیا تیری گورکھ دھندا
کچھ بھی سمجھ نہیں پائے بندہ

روز صفائی ستھرائی کو
جسموں پر پھرتا ہے رندہ

تیرے جادو گھر میں آ کر
ہے آنکھوں والا بھی اندھا

تجھ کو جان کے آخر ہم نے
ڈالا آپ گلے میں پھندا

حاجتمندوں کی صورت میں
مانگنے آ جاتے ہو چندہ

کیا بچتا ہے خدائی میں سے
کر لو اور بھی کوئی دھندا

اب تو ڈیٹ کرو بزنس کو
کب سے جھیل رہے ہو مندہ

ہم بھی اُدھر کو ہی جائیں گے
گئے جدھر گلزاری نندہ

شعر صاف ہوتے ہیں ظفر کے
لیکن خود بندہ ہے گندہ

☆

پکڑو بھی ہمارا پلہ
مفت بنے پھرتے ہو اللہ

بچے تمھارے ساتھ کھیلتے
پاس ہمارے گیند نہ بلاّ

دعویٰ ہے جو محبت کا تو
بھیجو کوئی انگوٹھی چھلاّ

مر مر کر ہی پہنچیں شاید
تم رہتے ہو عرشِ معلیٰ

جنت کے میووں کے بجائے
بھجواؤ تھوڑا سا غلّہ

تم چالاک گڈریے اپنے
اور ، ہم ہیں بھیڑوں کا گلّہ

ہیں ہم ہی کمزور زیادہ
ہم پر ہی بولو گے ہلّہ

عشق میں یہ حالت ہے ، جیسے
ڈوبا ہوا دہی میں بھلاّ

چھینی ہے تسبیح ظفر سے
اب نیچے سے کھینچ مصلیٰ

☆

رہا پیڑ پر پھول نہ پتا
یہی تھا اپنا کپڑا لتا

جلد بہت مضبوط تھی ، لیکن
اندر سے نکل آیا ستا

یاد ہے باقی سب کچھ میں سے
ایک تمھارا نام البتہ

جمع جوڑ کرتا رہتا ہوں
تمھیں بھی چاہیے ہو گا بھتا

ذرا ہاتھ ہلکا ہی رکھنا
سہہ جاؤں گا ٹھنڈا تتا

وعدے اپنے کرتا پورے
کہیں بتا نہیں دیتا وعتا

تھے ہتھیار اُس پاس تو سارے
میں ہی لڑتا رہا نہتا

جو ہو گا دیکھا جائے گا
میں تیار ہوں ، پھینکو پتا

چھیڑ نہ بیٹھیں کہیں ظفر کو
ہے وہ ایک بھِڑوں کا چھتا

-☆-

عشق خدا میں پھنسے ہیں
پورے پورے دھنسے ہیں

زہد و عبادت کے سوا
اور بہت مخمصے ہیں

ہل جُل سکتے ہی نہیں
کیا فرے پر کسے ہیں

اِس سوراخ سے ایک بار
پہلے بھی ہم ڈسے ہیں

آتے نہیں ہیں جو نظر
کیوں آنکھوں میں بسے ہیں

یوں کچے بھی نہیں پھل
تھوڑا تھوڑا رسے ہیں

آئی جوانی خدا پہ
پھوٹ رہے کیا مسے ہیں

حج پہ سب کے ساتھ ہی
بھیڑبھاڑ میں ٹھسے ہیں

اُس کے آگے تو ، ظفر
بالکل ہی بے بسے ہیں

-☆-

اللہ صاحب کھرے ہیں
اور ، ہمیشہ ہرے ہیں

شہ رگ سے نزدیک بھی
ہو کر اتنا پرے ہیں

پاس ہمیں بھلا نہیں
بہت گناہوں بھرے ہیں

دل ہی جلنے لگا تھا
نفل پڑھے تو ٹھرے ہیں

حُوریں ہیں اور مولوی
جنت میں گل چھرے ہیں

سوچ کہیں ہے اور ہی
سر سجدے میں دھرے ہیں

خوفِ خدا بھی ہے بہت
بیوی سے بھی ڈرے ہیں

شاہ جی یہیں پہ تھے ابھی
اور ، ابھی ست کھرے ہیں

وہ تو زندہ ہے ، ظفر
ہم ہی اُس پہ مرے ہیں

☆

روئے ہوئے ہو ، گائے ہوئے ہو
کیا کیا سوانگ رچائے ہوئے ہو

گھونگھٹ نہیں اُٹھاتے ہو تُم
اپنوں سے شرمائے ہوئے ہو

جبّار و قہّار بھی ہو تُم
پھر بھی ہم کو بھائے ہوئے ہو

مسجد کی دیوار ہے سانجھی
یُوں اپنے ہمسائے ہوئے ہو

کھوج میں لگی ہُوئی ہے دُنیا
کھوئے ہوئے ہو ، پائے ہوئے ہو

ذوق و شوق ہو کبھی سراسر
اور ، کبھی اُکتائے ہوئے ہو

اپنی بہت بڑی اُلجھن میں
خلقت کو اُلجھائے ہوئے ہو

کائنات کے اندر باہر
پھیلے ہو اور چھائے ہوئے ہو

آس پاس رہتے ہو ظفر کے
کتنی بھی کترائے ہوئے ہو

☆

نامعلوم میں پڑے ہوئے ہو
اور، معلوم سے بڑے ہوئے ہو

کائنات کے اس کنگن میں
کیا موتی سا جڑے ہوئے ہو

کوئی رعایت بھی کرنا تھی
بات پہ اپنی اڑے ہوئے ہو

کوئی کچھ بھی نہیں کہہ سکتا
بیٹھے ہو یا کھڑے ہوئے ہو

اتنی دانش آئی کہاں سے
کس کالج کے پڑھے ہوئے ہو

یہ مینا کاری ہے کیسی
کس صرّاف کے گھڑے ہوئے ہو

تمھیں الگ بھی نہیں کر سکتا
دل کے اُوپر مڑھے ہوئے ہو

وہاں پہنچنا ہے ناممکن
جس چوبارے چڑھے ہوئے ہو

بات بھی سُنتے نہیں ظفرؔ کی
شاید اُس سے لڑے ہوئے ہو

☆

یاد تری جب آ جاتی ہے
دل میں آگ لگا جاتی ہے

صبح کوئی تیری بھیجی ہوئی
چڑیا مجھے جگا جاتی ہے

ملاقات کی خواہش دھوپ میں
بادل بن کر چھا جاتی ہے

خاموشی سی آتے جاتے
باجا کوئی بجا جاتی ہے

تیری رضا ہی مجھ سے ہمیشہ
سارے کام کرا جاتی ہے

کسی ہوا کی لہر سی آ کر
کمرے کو مہکا جاتی ہے

کوئی کرن سی تیری اکثر
محفل کو گرما جاتی ہے

کبھی تو اِن تاریک آنکھوں میں
بجلی سی لہرا جاتی ہے

اب تو کچھ برسوں سے ظفرؔ کا
سارا سخن مٹا جاتی ہے

☆

یُوں تو میری زُبان پہ ہو تُم
کون سے آسمان پہ ہو تُم

کسی عنوانِ دل نشیں کی طرح
ثبت اِس داستان پہ ہو تُم

مُنحرف ہو گئے ہو ، یا قایم
اپنے پہلے بیان پہ ہو تُم

کوئی پل چین ہی نہیں پڑتا
اِک مُصیبت سی جان پہ ہو تُم

جیسے میرا شکار کرنے کو
روز و شب کی مچان پہ ہو تُم

کبھی واپس بھی آؤ گے کہ نہیں
کِس طرح کی اُڑان پہ ہو تُم

کھینچ رکھا ہے چھوڑنے کے لیے
تیر ہوں اور کمان پہ ہو تُم

غاصب آ کر ہُوئے ہو میرے بھی
حاکم اپنے جہان پہ ہو تُم

بے نشاں ہو کے بھی ، ظفر ، جیسے
کسی اپنے نشان پہ ہو تُم

☆☆☆

ہر اک طرح کا ہُنر آزمانے والے ہو
قدیم ہو کے بھی میرے زمانے والے ہو

ظہورِ وقت سے پہلے کے ہو یہاں موجود
نہ آنے والے کہیں سے نہ جانے والے ہو

کسی کے سامنے آتے نہیں ہو قرنوں سے
سُنا ہے اب یہ تکلف اُٹھانے والے ہو

ہمیں تو آج بھی منظور ہو بہر صُورت
نئے نویلے ہو یا وہ پُرانے والے ہو

یہ جو بھی ردّ و بدل ہے ، تُمھی کو زیبا ہے
بنانے والے ہو چاہے مٹانے والے ہو

تُمھاری ہو سکے تعریف کِس طرح ممکن
کہ میرے جیسوں کے بھی ناز اُٹھانے والے ہو

ہو زندگی ہی سراسر کہ ایک بار یہاں
مجھے تو موت کے مُنھ سے بچانے والے ہو

سو ، ہم بھی سب سے بڑا پیر مانتے ہیں تُمھیں
کہ تُم ہی سب سے بڑے آستانے والے ہو

جمانے والے ہو اپنا ہی کوئی رنگ ، ظفر
کہ ہر جما ہُوا پہلا اُڑانے والے ہو

☆☆☆

پچھلی بات ہمارے پر ہے
اب انصاف تمہارے پر ہے

اور، انصاف کا تانا بانا
عفو کے ایک اشارے پر ہے

میری شام نظر تو اب تک
تیرے صبح ستارے پر ہے

عید ہماری پاس تمہارے
تھوڑا وقت گزارے پر ہے

اس کی نگاہ کرم، کیا کہنا
آدھے پر بھی، سارے پر ہے

چوری چھپے بھی آنکھ ہماری
اس کے نرم نظارے پر ہے

تھکا ہوا یہ دل، یہ مسافر
بیٹھا درد کنارے پر ہے

آخر دار و مدار اپنا اب
اک تیرے ہی سہارے پر ہے

ابھی ظفر کڑوا منہ لے کر
بیٹھا شہد کے دھارے پر ہے

☆

وارے ہوتے جائیں
نیارے ہوتے جائیں

کام تمہارے ہاتھوں
سارے ہوتے جائیں

آئیں اور اللہ کو
پیارے ہوتے جائیں

آئے ہیں تو اس کے
دوارے ہوتے جائیں

اس کی طرف بھی اک دن
ہارے ہوتے جائیں

اندر مشکل ہے تو
باہرے ہوتے جائیں

شامیں ہوئیں اندھیری
تارے ہوتے جائیں

بیماری کم ہو گی
چارے ہوتے جائیں

جلسہ جے ظفر کا
نعرے ہوتے جائیں

☆

دم ہے رُکا ہوا، اللہ جی
بھیجیں نئی ہوا، اللہ جی

مارے گا نفسِ امّارہ
پیچھے پڑی بلا، اللہ جی

مجھے زیادہ رحم چاہیے
میں نے ظلم کیا، اللہ جی

میرے اندر ہی اندر سے
اُٹھے کوئی صدا، اللہ جی

میں ہی معافی کے قابل ہوں
مجھ سے جرم ہوا، اللہ جی

گُم ہوں کئی زمانوں سے میں
بتلائیں جو پتا، اللہ جی

یہ بھی آپ ہی کا مظہر ہے
چاروں سمت خلا، اللہ جی

میری سانس کا آنا جانا
حمد ہو، اور، ثنا، اللہ جی

تُرت جواب آیا ہے ظفر کو
اس نے تھا جو کہا، اللہ جی

☆

بندے تو ہم عام سے ہیں
لیکن، تیرے نام سے ہیں

لنگر بھی جاری ہے تیرا
آئے ہم بھی کام سے ہیں

پھنس سکتے ہیں کیا ہم بھی
بچھے ہوئے جو دام سے ہیں

کُچھ جاگے ہیں محبت میں
کُچھ رنج، آلام سے ہیں

جس دن سے جانا ہے تُجھے
لوگ بہت آرام سے ہیں

وُہی کنائے دریچوں سے
وُہی اشارے بام سے ہیں

رات بھی کٹنے والی ہے
ہم بھی منتظر شام سے ہیں

تیری مخموری تھی جنھیں
مست ایک ہی جام سے ہیں

جلسہ کوئی کرائیں، ظفر
آپ تو خاص عوام سے ہیں

☆

آنکھ مِلانے سے ڈرتا ہُوں
پاس بھی آنے سے ڈرتا ہُوں

آج کا نہیں ہے یہ ڈر کوئی
ایک زمانے سے ڈرتا ہُوں

باتیں لوگ بنا سکتے ہیں
آنے جانے سے ڈرتا ہُوں

تُجھے کہاں لے جاؤں گا مَیں
تُجھ کو پانے سے ڈرتا ہُوں

فردِ عمل ہی کُچھ ایسی ہے
جسے دکھانے سے ڈرتا ہُوں

پکڑا جاؤں گا اس پر بھی
بات بتانے سے ڈرتا ہُوں

ناپ تول جو پاس ہے تیرے
اُس پیمانے سے ڈرتا ہُوں

بہت آزاد پھرا ہُوں، دِل کے
بندی خانے سے ڈرتا ہُوں

شرمندہ ہُوں، ظفر، اور اُس کو
مُنہ دِکھلانے سے ڈرتا ہُوں

☆

روئے پھر بھی، گایا پھر بھی
اپنے کام نہ آیا پھر بھی

جانتے تھے انجام بھی اس کا
ہم نے ظلم کمایا پھر بھی

جی بھر کے نافرمانی کی
ہم کو صبر نہ آیا پھر بھی

مانگتے مانگتے جاں کی امانت
دے دی عُمر بقایا پھر بھی

تپتی دُھوپ سزا ہو جیسے
ڈھونڈ رہے ہیں سایا پھر بھی

ہم بچنے کے قابل کب تھے
اُس نے ہمیں بچایا پھر بھی

سامنے آئی سچّی صُورت
جُھوٹا نقش جمایا پھر بھی

دِل سے کام بھی خُوب نکالے
اس مسجد کو ڈھایا پھر بھی

پینترے بدلے بہت ظفر نے
اور، نہ بدلی کایا پھر بھی

☆

آدھے، سارے لگتے ہو
کچھ تو ہمارے لگتے ہو

کبھی منافع کی صورت
کبھی خسارے لگتے ہو

جو پہلے دن لگے تھے
وہی دوبارے لگتے ہو

کبھی ہو شامل موجوں میں
کبھی کنارے لگتے ہو

بیچ رہے ہو سودا سا
کچھ بنجارے لگتے ہو

یہاں بھی لگتے ہو، جیسے
بلخ بخارے لگتے ہو

ہر درد اور بیماری میں
امرت دھارے لگتے ہو

شکل نہیں دیکھی اب تک
پھر بھی پیارے لگتے ہو

نقد نہیں لگتے ہو، ظفر
صرف اُدھارے لگتے ہو

-☆-

حال بتایا ہی نہیں
تم نے پوچھا ہی نہیں

جس پہ چلتے رہے ہیں
کوئی رستا ہی نہیں

ایسی ہے اُس کی کشش
کوئی بچے گا ہی نہیں

آتا وہ کس طرح پاس
کبھی پکارا ہی نہیں

تم تھے میرے ہم نشیں
میں نے دیکھا ہی نہیں

کوئی فن، کوئی ہنر
ہم کو آتا ہی نہیں

عام معافی جب ملی
میں اُس دن تھا ہی نہیں

پھرتے رہے کھلے یہاں
اُس نے باندھا ہی نہیں

اپنا ہے جھنجٹ ظفر
اُس کا جھگڑا ہی نہیں

-☆-

کچھ نہیں ہر سُو رہے گا
باقی بس تُو رہے گا

چڑھا ہُوا پاتال سے
دل میں آنسو رہے گا

ہر غنچے ، ہر پھول میں
بن کر خوشبو رہے گا

دشت میں مجنوں رہا تو
بن میں آہو رہے گا

تُو ہی ، جب تک جیوں میں
دست و بازو رہے گا

گڑا ہوا اس جان میں
کوئی چاقو رہے گا

میرے اور اُس میں کوئی
فرق سر مُو رہے گا

عکس اُڑیں گے ہر طرف
آئینہ رُو رہے گا

جیسا بُدھو تھا ظفر
ویسا بُدھو رہے گا

☆

آنسو عرش لوارتے
تجھ کو رہے پکارتے

وہ بھی اپنی دُھن میں ہے
ہم بھی دم نہیں مارتے

اتنا دم خم ہی نہ تھا
عرش سے اُسے اُتارتے

رہے فضول تلاش میں
گھر ہی کوئی اُسارتے

من و سلویٰ کی جگہ
اپنی دال بگھارتے

پیتے دھو کر پانو وہ
اُس کی زُلف سنوارتے

پھینک دیا رختِ سفر
کچھ تو بوجھ سہارتے

رہتے بے شک راہ میں
تیری سمت سدھارتے

خود کو مِٹا کر ہی ، ظفر
اُس کا نقش اُبھارتے

☆

حمد اُس کی لکھتا رہوں
شعر شعر روتا رہوں

اُس کا ہونا بہت ہے
نہیں رہوں میں یا رہوں

کبھی تو سُن لے گا ہی وہ
اپنی سی کہتا رہوں

وُہی جگائے گا مُجھے
غفلت میں سویا رہوں

کسی جگہ مِل جائے گا
گھر سے تو نکلا رہوں

کُچھ تو لے ہی مروں گا
پیچھے اگر پڑا رہوں

ملے نہ ملے جواب کُچھ
وہاں سوالی جا رہوں

کب تک بچتا جائے گا
آئی پہ آیا رہوں

ایک برابر ہے، ظفر
مر جاؤں، زندہ رہوں

☆

... بیزار ستایا میں نے
تیرا نغمہ گایا میں نے

مُوجھ تو کر نہیں پایا
کافی زور لگایا میں نے

اُس کا وزن اُٹھا کیا سکتا
اپنا بوجھ گرایا میں نے

گیا، مگر آنے جانے کا
مانگا نہیں کرایہ میں نے

اور خداؤں سے مِل جُل کر
اُس کو خُوب ستایا میں نے

دمڑی اُس کے نام پہ دے کر
رکھی رقم بقایا میں نے

ساری رات جگایا اُس کو
قِصّہ بہت بڑھایا میں نے

زندہ دِل تھا، کھاتا پیتا
مار دیا ہمسایہ میں نے

نامۂ اعمال اُسے، ظفر، پھر
پیچھے سے پکڑایا میں نے

☆

غور دوبارہ ہو سکتا ہے
ابھی گزارہ ہو سکتا ہے

جان نکالنے والا ہم کو
جان سے پیارا ہو سکتا ہے

کوشش تو کرنی ہی چاہیے
بحر کنارہ ہو سکتا ہے

کریں تو یہ نفسِ امارہ
پارہ پارہ ہو سکتا ہے

ابھی معافی مل سکتی ہے
اور ، ستارہ ہو سکتا ہے

نئی نئی بیماری دل ہے
اس کا چارہ ہو سکتا ہے

وا ہے توبہ کا دروازہ
کام ہمارا ہو سکتا ہے

تھوڑا تھوڑا سا کیا ہونا
سارا سارا ہو سکتا ہے

ابھی ، ظفر ، اُمید نہ ہارو
ابھی اشارہ ہو سکتا ہے

-☆-

بڑی [illegible] کی کڑی ہے
رحمت اس سے بڑی ہے

شور قیامت ہے شروع
اپنی اپنی پڑی ہے

اشکِ ندامت ہے رواں
یہ رحمت کی گھڑی ہے

کیسے بخشے جاؤ گے
طعنہ ہے اور تڑی ہے

بیڑی لگی ہے پاؤں میں
ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے

اپنے ہاتھوں ہی یہاں
قسمت اپنی سڑی ہے

زندہ لاش اپنی کہیں
پچھتاوے میں گڑی ہے

شاپنگ کرنے آئے ہیں
ریڑھی ہے یا پھڑی ہے

کچھ بھی نہیں رہا ، ظفر
بکلی ہوئی رڑی ہے

-☆-

جو بھی تماشا کیا ہے
نقصان اپنا کیا ہے

اُس کے آگے جھکے ہم
یہ بھی ڈراما کیا ہے

خود سے فارغ ہوئے تو
اُس کا چرچا کیا ہے

بُرا ہو یا اچھا، مگر
کام ہمیشہ کیا ہے

توبہ کر کے بھی وہی
کام دوبارہ کیا ہے

بیٹھے بیٹھے ایک دم
جھگڑا اتنا کیا ہے

انحراف اُس ذات سے
کیسا کیسا کیا ہے

جینے کا کرتے رہے
مرنے کا کیا کیا ہے

حال اپنا ہم نے، ظفر
خود ہی پتلا کیا ہے

-☆-

دامن نہیں ہمارا صاف
کسی بہانے کریں مُعاف

جاڑے کی کرنی تھی فکر
کہیں اُدھار نہ ملا لحاف

جنت مانگ نہیں سکتے
کہیں عنایت ہو اعراف

کہیں نہیں جا سکتے ہیں
تنگ ہوئے ہم پر اطراف

اس عالم میں کہاں سے ہم
آئینہ لائیں شفاف

باقی سب خیریت ہے
ٹھیک ہوں اپنے شین اور قاف

اب کچھ بھی نہیں کر سکتے
ہونے کو ہے اب اتلاف

آخر اس شخصیت میں
کچھ تو ہوتے وصف اوصاف

مرنے پر بھی تم نے، ظفر
چھوڑی نہیں ہے لاف گزاف

-☆-

اُس کو پکڑا پیر ہے
اب تو میاں اخیر ہے

آگے اُس کے رکھیں گے
جو اپنی تحریر ہے

حال دُہائی کریں گے
آگے جو تقدیر ہے

کہیں گھاؤ تلوار کا
کہیں ترازُو تیر ہے

ہاتھ بھی ہیں دونوں بندھے
پانو میں بھی زنجیر ہے

دیکھو عبرت سے اِسے
ایک نیا نخچیر ہے

کہو، حساب کتاب میں
اب کتنی تاخیر ہے

چھوٹے چھوٹے جُرم پر
بڑی بڑی تعزیر ہے

کھڑا ہے کُچھ ایسے ظفر
جیسے بے تقصیر ہے

☆

جُرم سے کُچھ انکار ہے
اور، کُچھ کُچھ اقرار ہے

بہُت بدن پر کپکپی
کافی تیز بُخار ہے

سودا نقدونقد لو
سارا بند اُدھار ہے

پڑے اگر اُس کی نظر
پھر تو بیڑا پار ہے

آگ ہے اندر ہی لگی
باہر ٹھنڈا ٹھار ہے

بچتا ہے اِنصاف سے
رحمت ہی درکار ہے

آپ حفاظت کرے گا
خُود وہ پہرے دار ہے

دوزخ میں لے جائے گا
سر پر جو طومار ہے

پائے وہیں دوا، ظفر
جو اُس کا بیمار ہے

☆

کبھی بہانہ کرے گا
کبھی روانہ کرے گا

خالی کر کے زندگی
پُر پیمانہ کرے گا

جو نیت ہے آپ کی
وہی زمانہ کرے گا

دشمن داری کر چکا
اب یارانہ کرے گا

ہو گا کچھ کام آپ ہی
کچھ دیوانہ کرے گا

یہ سب کو معلوم ہے
کیا مستانہ کرے گا

سوچو ذرا ، بہشت میں
کیا مولانا کرے گا

ہوتا تھا ہر ماہ جو
اب روزانہ کرے گا

اپنی حقیقت کو ظفر
خود افسانہ کرے گا

☆

کچھ نہیں اپنے پاس
لیکن نہیں نراس

جنت میں تو بھیج
کھا لیں گے ہم گھاس

چھوٹے نہیں ہیں پران
ٹوٹی نہیں ہے آس

شہر سے تنگ پڑے تو
لے لیں گے بن باس

ہم ہی عام ہوئے
تھے جو اُس کے خاص

شاید آ ہی جائے
دوزخ ہم کو راس

آٹا نہیں ہنا
پیسا بہت خراس

خوف اُس کا دوچند
قایم نہیں حواس

کیا ہے آپ ، ظفر
اپنا ستیاناس

☆

تیرے بھجن ہی گائے
پھر بھی ہُوا انیائے

تھے ہم اُسی کے داس
اُس کو کون بتائے

سُنی نہ اُس نے بات
مر گئے ہائے ہائے

پہچانا نہیں اُس نے
جس کے پانو دبائے

بخشے جائیں گے سب
اُس کے چاچے تائے

ہوتے سوتے اُس کے
رہے جگت پہ چھائے

کام نکالے اپنا
رہتا ہمیں لڑائے

صورت کیسے دیکھیں
پردہ کوئی ہٹائے

بھیجیں کاش ظفر کو
جنت کے ہمسائے

☆

ایسی طرز نکالی میں نے
حمد ہی نئی بنا لی میں نے

گٹھڑی کالے کرتوتوں کی
سر پہ تُرت اُٹھا لی میں نے

چھوڑ ہی دی تھوڑا سا چل کر
راہ وہ دیکھی بھالی میں نے

آنکھوں سے ہی چھوئی چاٹی
اُس روضے کی جالی میں نے

توبہ و استغفار کی خاطر
تھوڑی عُمر بچا لی میں نے

موت ہُوئی تھی حملہ آور
وار دے دیا خالی میں نے

چھوڑی نہیں تھی اپنے وقت میں
کوئی بھی گوری کالی میں نے

آخر اُس کے در پہ آ کر
خود کو کیا سوالی میں نے

اور، ظفر، کیسا جا پکڑا
فضل و کرم کا والی میں نے

☆

پڑے تمھارے پیٹے
ہم قسمت کے ہیٹے

جائیں گے اُس دُنیا میں
اِس دُنیا کے بیٹے

لڑکیوں سے بھی بدتر
لڑکے جیٹھ پلیٹھے

جنت میں بھی جا کر
کھائیں گے حلوے میٹھے

دھوئیں گُناہ کی چادر
پیس لائے ہیں ریٹھے

چین پڑا نہیں پھر بھی
بار رہے پلسیٹے

بولنا پڑ گئی عربی
ہم پنجابی ٹھیٹھے

آؤ بھگت کیا ہوتی
گئے تھے ہم بے ڈھیٹے

کیا ظفر نے تا ، تا
اُس نے سمجھا ٹے ٹے

☆

حشر کو ہاہاکار پڑے گی
کافی لمبی مار پڑے گی

ملنا ہے جا عرش پہ اُس کو
راہ میں سو دیوار پڑے گی

چل سو چل ہی پھر تو ہو گی
پہلی پہلی بار پڑے گی

لیٹ جائیں گے بے سُدھ ہو کر
رُوح وہاں بیمار پڑے گی

سارے سیدھے ہو جائیں گے
اور ہمیں بیکار پڑے گی

پھر اللہ دے اور بندہ لے
کچھ تو جاتے سار پڑے گی

لگتا ہے اِس مار دھاڑ میں
لمبی ہی بیگار پڑے گی

ٹھیک ہی سُنا ہُوا تھا ہم نے
یہ گھاٹی دُشوار پڑے گی

اندازہ ہے گلے ظفر کے
یا ناری ، یا نار پڑے گی

☆

درِ زنداں نہ کھلا میرے خدا
نہ کوئی تازہ ہوا، میرے خدا

یاد اب تُو بھی نہیں آتا ہے
اب تو یہ حال ہُوا، میرے خُدا

کیا مرے ساتھ ہُوئی، دوست مرے
اور، کیا مَیں نے کیا، میرے خدا

میری آنکھیں نہیں، کشکول ہیں یہ
در پہ آیا ہوں کھڑا، میرے خُدا

یہ تعلق نہیں منظور مجھے
کر مجھے مجھ سے جدا، میرے خدا

مَیں کدھر جاؤں یہاں سے اُٹھ کر
یہ مجھے تُو ہی بتا، میرے خُدا

ہوں ستایا ہُوا دنیا کا بہت
نگہِ لطف ذرا، میرے خدا

گرہ در گرہ ہوا میرا وجود
اے مرے عقدہ کشا، میرے خدا

اب ظفر بھی نہیں میرا، مرے یار
میری امداد کو آ، میرے خدا

☆

ہوں پڑا مَیں بھی اِدھر، میرے خدا
ایک، صرف ایک نظر، میرے خدا

ہوں نہیں اور کسی قابل مَیں
مجھ پہ اب رحم ہی کر، میرے خدا

وہ اندھیرا ہے، مَیں کیا بتلاؤں
میرے اندر سے گزر، میرے خدا

تُو کہاں، تیرے ارادے کیا ہیں
دے مجھے اپنی خبر، میرے خدا

اس خزاں میں تری رکھتے ہیں طلب
یہ مرے شاخ و شجر، میرے خدا

تجھ سے دور اب تو گزرتے ہی نہیں
یہ مرے شام و سحر، میرے خدا

اجنبی لگتا ہے اب گھر مجھ کو
کر مجھے خانہ بدر، میرے خدا

ڈال دے پھر کسی کارن، کسی طرح
میری باتوں میں اثر، میرے خدا

کیوں غلط کار نہ ہوتا کہ ظفر
تھا وُہی بندہ بشر، میرے خدا

☆

زندگی قید بنی ، میرے خُدا
اور کتنی ہے ابھی ، میرے خُدا

یاد رکھتا ہوں تجھے ہر لمحے
بھول کیا مجھ سے ہوئی ، میرے خُدا

درگزر تُو ہی کرے گا مجھ سے
یہ بھی عظمت ہے تری ، میرے خُدا

بس گنہگار ہوں ، باغی نہیں مَیں
کر سزاؤں میں کمی ، میرے خُدا

مَیں تو ہوتا ہوں مُعافی سے شُروع
کیا ہے اوقات مری ، میرے خُدا

دوست میرا نہیں بنتا تُو بھی
میرے دُشمن ہیں سبھی ، میرے خُدا

تیری رحمت کا نہیں کوئی شُمار
عُمر گننے میں گئی ، میرے خُدا

نئے آغاز پہ ہے اب یہ سفر
زندگی آئی ، گئی ، میرے خُدا

ظفرؔ ، اندر سے اُچھلتی ہے یہ حمد
یہ سُنی ہے نہ کہی ، میرے خُدا

☆

پڑھوں اس حمد کی لے ، میرے خُدا
اور بُلاؤں تری جے ، میرے خُدا

دل میں کس طرح سُلگتی ہے ہوا
اور ، کیسا ہے سمے ، میرے خُدا

پُوری طاقت سے بُلاتا ہوں تجھے
پھر بھی سُنتا نہیں ، اے میرے خُدا

مَیں جو پہلے نہیں آیا ترے پاس
یہی غلطی ہوئی ہے ، میرے خُدا

اِک بنایا تھا جو گھر تیرے لیے
وہ عمارت گئی ڈھے ، میرے خُدا

ہاتھ خالی ہیں خُدایا میرے
نہیں پلّے کوئی شے ، میرے خُدا

ڈھونڈتا ہے تجھے آخر دم تک
چاہے نکلے مری جے ، میرے خُدا

یہ سفر ہے مجھے منزل سے عزیز
راہ کرنا نہیں طے ، میرے خُدا

رکھنا حصے میں ظفرؔ کے تا عُمر
یہ چھلکتی ہوئی لے ، میرے خُدا

☆

دُور ہیں میں اور تُو میرے خُدا
کب ملیں گے رُوبرُو میرے خُدا

تیری باتیں ، تیری یادیں ، تیرا ذکر
بس یہی ہے گفتگو ، میرے خُدا

تیرا ثانی تو نہیں کوئی ، مگر
دل میں ہے تُو ہُوبہُو ، میرے خُدا

تُجھ بِن مُجھے اچھا نہیں لگتا ہے اب
یہ جہانِ رنگ و بُو ، میرے خُدا

یہ نہیں ممکن کہ ہمت ہار کر
چھوڑ دوں یہ جستجُو ، میرے خُدا

کیا کروں ، بُجھتی نہیں ہے میری پیاس
پھر چُکا ہُوں جُوبجُو ، میرے خُدا

کیا مزہ ہو جب کہیں ہو جائے تُو
ایک میرے رُوبرُو میرے خُدا

پھر کہیں ٹھنڈی ہوا اور چھاؤں بھیج
چل رہی ہے دل میں لُو میرے خُدا

کیا کرے تُو ہی بتا ، تُجھ کو ظفؔر
ڈھونڈ بیٹھا کُوبکُو میرے خُدا

-☆-

حمد کرتا ہُوں سبُو ، میرے خُدا
نشّہ ٹُوٹے نہ وضُو ، میرے خُدا

در پہ آیا ہے ترے تیرا غُلام
طوق ہے زیبِ گلُو ، میرے خُدا

یہ کٹا اور پھٹا سا ہُوا دل
ہو گا تُجھ سے ہی رفُو ، میرے خُدا

یہ دُعا ہے مری ، اب ہو نہ کہیں
ختم یہ ہفتہ ہُو ، میرے خُدا

یہی رکھتا ہے مُجھے خوار و خراب
مُجھ میں یہ میرا لہُو ، میرے خُدا

مُجھ سے ناراض ہے دُنیا ساری
ایک ہوتا نہیں تُو ، میرے خُدا

دل مرا پُھول ہے کب سے ایسا
جس میں ہے باس نہ ہے بُو ، میرے خُدا

کہیں دوچار تو ہوتا ہے کہ تُو
ہر طرف ہے ، ہمہ سُو ، میرے خُدا

تُجھ سے اُمید کرم ہے کہ ظفؔر
جانتا ہے تری خُو ، میرے خُدا

-☆-

آن تمہاری ، بان تمہاری
سب سے اونچی شان تمہاری

واری میرا جسم تمہارے
صدقے میری جان تمہاری

میں معذور گزر نہیں سکتا
آبادی گنجان تمہاری

رکشہ صبح چلائے تمہارا
شام ہے گاڑی بان تمہاری

حاجی یہاں کے سب سے زیادہ
ڈھر ہے پاکستان تمہاری

مشہوری سی مشہوری ہے
چھاپے خبریں ڈان تمہاری

بخشش تو کرتے ہو ، لیکن
شرط نہیں آسان تمہاری

پوچھتے نہیں گنہگاروں کو
نیکی ہے پردھان تمہاری

کہیں ظفر عاصی ہو کر بھی
پا سکتا ہو امان تمہاری

☆

کھیت ہوئے ویران ہمارے
دیدے ہیں حیران ہمارے

نہیں ہمیں نسوار میسّر
بند ہوئے ہیں پان ہمارے

بھاگ گئے لوہار یہاں سے
چھوڑ گئے ترکھان ہمارے

بھری ہوئی لوگوں سے گلیاں
خالی غلے دان ہمارے

تولتے ہیں اندازے سے ہی
رہے نہیں اوزان ہمارے

کٹی ہوئی ہیں جیبیں اپنی
بٹے ہوئے ہیں دھیان ہمارے

شور شرابے سے اپنے ہی
پھٹے ہوئے ہیں کان ہمارے

بات نہیں ہم سے ہو سکتی
بجا نہیں اوسان ، ہمارے

کام اپنے تو ، ظفر ، ہیں جو بھی
سنا کرو اعلان ہمارے

☆

اب کیا ہوں امکان ہمارے
ملتے نہیں بیان ہمارے

حمد کے سونے پہ ہیں سہاگا
قاری خوش الحان ہمارے

باہر چمک دمک ہے پوری
اندر ہیں ویران ہمارے

تازہ ہوا آئے تو کہاں سے
تنگ اور بند مکان ہمارے

آٹا نہیں ملا پرمٹ پہ
بھوکے ہیں نادان ہمارے

وجہ تو ظاہر ہے تم پہ بھی
ہیں جو ضعیف ایمان ہمارے

ویسے ہی ہم نے ہونا تھا
جیسے ہیں سلطان ہمارے

کچھ بھی ہمارے گھر نہیں آتا
کنک ہماری ، دھان ہمارے

سینے کے ناسور یہی ہیں
اور ، یہی سرطان ہمارے

☆

ہٹیں ذرا دربان تمھارے
آئے ہیں مہمان تمھارے

ایک پٹھانے خان ہمارا
دوسرے سارے خان تمھارے

ایک ہماری بندر جاتی
اور ، سبھی ہنومان تمھارے

شہر میں یہ فٹ پاتھ ہمارا
اونچے محل مکان تمھارے

نرک نما جھونپڑیاں اپنی
بنگلے سورگ سمان تمھارے

تنکا تنکا بکھر گئے ہم
جڑے ہوئے جمان تمھارے

دھنسے ہوئے اک دوسرے میں ہم
کھلے کھلے میدان تمھارے

اور ، ہماری بربادی کو
طغیانی ، طوفان تمھارے

جو بھی سلوک اب کرو ظفر سے
پیش ہوا ہے آن تمھارے

☆

ملاقات ہو سکتی ہے
اور ، بات ہو سکتی ہے

مجھے مات ہو جائے گی
مجھے مات ہو سکتی ہے

رات آنے سے پہلے ہی
کبھی رات ہو سکتی ہے

خلقت ہے تیری ، لیکن
میرے ساتھ ہو سکتی ہے

وقتِ دُعا جھلمل کرتی
دل میں دھات ہو سکتی ہے

پُھول پُھول ہوتی
پات پات ہو سکتی ہے

مولوی آئے پھرتے ہیں
واردات ہو سکتی ہے

اگلا ہدف ترا ، مولا
کائنات ہو سکتی ہے

تیرا مرکز اب بھی ، ظفرؔ
ایک ذات ہو سکتی ہے

☆

جان ہوئی بے جان ہماری
اُترے کہیں تکان ہماری

تُو ہی وردِ زباں ہے ، اب تک
تُو ہی رہا گردان ہماری

بیٹھ گئے پاتال میں جا کر
کیسی تھی وہ اُٹھان ہماری

زہر تو مِلتا ہی نہیں خالص
پھٹے کہیں شریان ہماری

گرے ہیں مُنہ کے بل آ کر ہم
کیسی رہی اُڑان ہماری

کوئی نمازی کیسے آتا
پہنچی کہاں اذان ہماری

دار و مدار اندازے پر ہے
اُلٹ گئی میزان ہماری

گھوڑا خود بھاگا پھرتا ہے
ہاتھ میں نہیں عنان ہماری

ہم کمزور ظفرؔ سے بھی ہیں
سُنو کبھی بلوان ہماری

☆

انتظام ہو سکتا ہے
اور ، کام ہو سکتا ہے

یاد اُسے کرنے کے لیے
کوئی نام ہو سکتا ہے

فضل تمہارا ہے ممکن
اور ، تمام ہو سکتا ہے

گھونگٹ تُو نہ اُٹھائے تو
دن بھی شام ہو سکتا ہے

دل وحشی تو ہے ، لیکن
یہی رام ہو سکتا ہے

دانہ ڈالو تو پنچھی
زیرِ دام ہو سکتا ہے

عفو خاص تو ہے اُس کا
کبھی عام ہو سکتا ہے

خالی ہے ایمان سے دل
پُر یہ جام ہو سکتا ہے

مُلاقات کا بھی ، ظفر
اہتمام ہو سکتا ہے

-☆-

تم ہو بڑے اور کام تمہارا بڑا ہے
اس سے ہمیں کیا مطلب کتنا بڑا ہے

میری سوچ احاطہ ہی نہیں کر سکتی
تُو کچھ اتنا ، اتنا ، اتنا بڑا ہے

باقی ہیں سب چھوٹے ، نام بھی ہیں گمنام
خُود ہے بڑا اور نام بھی تیرا بڑا ہے

رونق تو لگتی ہے کافی ہی ، لیکن
خلقت کم ہے اور تماشا بڑا ہے

تیری بڑائی بیاں نہیں کی جا سکتی
امکانات سے بھی تو زیادہ بڑا ہے

چشمِ تصوّر اندازہ نہیں کر سکتی
کوئی نہیں ویسا ، تُو ایسا بڑا ہے

تُو تو بڑا ہے اپنی بڑائی سے بھی بہت
بڑا یہاں بھی کیسا کیسا بڑا ہے

اور تعلق تیرے سامنے کیا ٹھہرے
موت اور زیست کا رشتہ جتنا بڑا ہے

رحم بھی مجھ پہ ویسا ہی کرتا ہے ، ظفر
آپ بذاتِ خُود وہ جیسا بڑا ہے

-☆-

کروں جو تیری شان بیان
پھر ہوتا ہے بیان بیان

تو اس سے بھی زیادہ ہے
جو ہے ترا امکان بیان

ابھی قلم وہ نہیں بنا
کرے جو تیری آن بیان

مہلت ہی نہیں پاس مرے
کروں ترے احسان بیان

حد ہی کوئی نہیں تیری
کیوں کر کرے زبان بیان

حمد لکھی بھی کھول کے دل
خالی ہے دامان بیان

حمد سرا ہونا تیرا
نہیں کوئی آسان بیان

جو بھی ، جتنا ممکن ہو
ہے تیرا فیضان بیان

حمد اتنی سی میں بھی ، ظفر
ہوئی ہے ساری جان بیان

-☆-

سبب اس دل کی ناصبوری ہے
اور ، وقفہ بھی یہ عبوری ہے

حمد کی تجھ کو ہے ضرورت کیا
حمد میرے لیے ضروری ہے

پیش تیرے حضور میں ہوں سو یہ
جی حضوری ہی جی حضوری ہے

آپ کے در سے آپ کے در تک
میری یہ داستان پوری ہے

یہ بھی کیا رنگ ہیں مرے مولا
آہ کالی ہے ، عرض بھوری ہے

حمد میرے لیے جو سچ پوچھیں
صبح کا ناشتہ ہے ، پوری ہے

مجھے میٹھا بھی ہے پسند ، سو یہ
میرے پچھلے پہر کی چوری ہے

جڑ تو سارے فساد کی ، مولا
میری اور آپ کی یہ دوری ہے

کیا بنے گا ظفر کا آخرِ کار
نہ یہ ناری ہے اور نہ نوری ہے

-☆-

حمد خود میرے پاس آتی ہے
اور، مجھے ساتھ لے کے جاتی ہے

شکل بھی تیری جانتا نہیں مَیں
پھر تیری یاد کیوں ستاتی ہے

صبح کی تازہ و لطیف ہوا
روز ہی تجھ کو ڈھونڈ لاتی ہے

چاہتا بھی ہوں تجھ سے ڈرتا بھی
یہ کوئی اختلاف ذاتی ہے

دل سے اُٹھتی ہے لہر سی کوئی
اور، وہیں حشر سا اُٹھاتی ہے

تجھ سے مَیں دور کیوں رہا اتنا
تُو تو میرا ازل کا ساتھی ہے

تُو کہ باہر ہے کائنات سے بھی
کہوں کِس طرح کائناتی ہے

ہوں شمار و قطار میں بھی ترے
یا مری سوچ حادثاتی ہے

ہے ظفر بھی اُمیدوار کرم
بھول جاتا کہ وارداتی ہے

☆

آدھی سُن یا ساری سُن
آ، اور، بات ہماری سُن

خواب ندامت میں ڈوبی
کیسی رات گزاری، سُن

ہُوا نہیں، اور اب تک ہے
کیسا صدمہ جاری، سُن

حرفوں کی حسرت کیا ہے
لفظوں کی لاچاری سُن

دُنیا کی دولت کو دیکھ
اور، دل کی ناداری سُن

ہم جو کہیں کے بھی نہ رہے
کبھی ہماری زاری سُن

بول جو بے تاثیر ہُوئے
بات اثر سے عاری سُن

بچنے کی اُمید نہیں
ضرب لگی ہے کاری، سُن

میرے ساتھ ظفر بھی ہے
سب کو باری باری سُن

☆

مختصر یہ کہ بے مثال ہے تُو
بہت اعلیٰ کوئی خیال ہے تُو

حملہ آور ہوئی ہے یہ دُنیا
مطمئن ہوں کہ میری ڈھال ہے تُو

اور ہر شے کو ہے زوال ، مگر
ایک تُو ہے کہ لازوال ہے تُو

کائنات اک اشارہ ہے تیرا
کیا کہیں کتنا باکمال ہے تُو

بے محابا ترے خزانے ہیں
بے حساب اور مالامال ہے تُو

حُسن تیرا حدوں سے باہر ہے
کہ بہت صاحبِ جمال ہے تُو

میرے جیسے بھی پل رہے ہیں یہاں
سب سے بڑھ کر غریب پال ہے تُو

کون ہے جو نہیں ترا نخچیر
کوئی کون و مکاں میں جال ہے تُو

تیری تعریف کیا کرے گا ظفر
کوئی ایسا ہی خوش خصال ہے تُو

☆

دل کے اندر چور ہے
رونے پر ہی زور ہے

پچھتاوے ہیں عُمر کے
اور ، اِنہی کا شور ہے

چھائی ہوئی ہے خوف کی
کوئی گھٹا گھنگھور ہے

جنگل تُجھ سے ہی سجے
تُو جنگل کا مور ہے

روشنیاں گُھلا گئیں
دوپہری میں بھور ہے

تیرے قدموں میں ہیں اب
یہی ٹھکانا ٹھور ہے

جہاں کہیں لے جائے تُو
تیرے ہاتھ ہی ڈور ہے

فضل ، مُعافی اور کرم
سبھی تُمھاری اور ہے

کُچھ نہیں کہنا ظفر کو
ڈھگا ہے اور ڈھور ہے

☆

انکسار بھی تجھ سے ہے
لاڈ پیار بھی تجھ سے ہے

مُلاقات بھی تیرے ساتھ
انتظار بھی تجھ سے ہے

کہکشاؤں اور تاروں کا
انتشار بھی تجھ سے ہے

وہ بہار بھی تھی تجھ سے
یہ بہار بھی تجھ سے ہے

مستی بھی تیرے ہی طفیل
اور، خُمار بھی تجھ سے ہے

دُنیائے فانی فی الحال
پائدار بھی تجھ سے ہے

چھپا ہُوا بھی ہے منظر
آشکار بھی تجھ سے ہے

جمعیت بھی ہے تیری
خلفشار بھی تجھ سے ہے

پُرسکوں رہے تجھ سے ظفرؔ
بےقرار بھی تجھ سے ہے

☆

روز و شب اور صبح و شام ترے
حیرت افروز ہیں مقام ترے

بے نشاں بھی تجھے کہا گیا ہے
ہیں نشانات گام گام ترے

تیری ہر مصلحت عجیب و غریب
اور ہی طرح کے ہیں کام ترے

میرے پاس اور کیا اثاثہ ہے
میرا عاجز کلام نام ترے

اپنے بندوں کی فکر ہے کیسی
اور، کیا کیا ہیں اہتمام ترے

کسی دن اور کبھی دکھا تو سہی
کس طرح کے ہیں سقف و بام ترے

تُو مرا ہی نہیں ہے، سب کا ہے
اور، عاشق ہیں خاص و عام ترے

مُہر سب کی کمر پہ ہے تیری
بادشاہان بھی غلام ترے

ہے ظفرؔ ایک تیرا ہرکارہ
جس نے پہنچائے ہیں پیام ترے

☆

یہ زمان و مکاں کہاں کے ہیں
ابر اور آسماں کہاں کے ہیں

تیری شانِ نزول تھی کیسی
تیرے نام و نشاں کہاں کے ہیں

بجلیاں یہ کہاں سے آئی ہیں
اور، یہ آشیاں کہاں کے ہیں

حیرت آباد ہے جہاں تیرا
یہ کرشمے کہاں کہاں کے ہیں

داستاں تو یہاں کی ہے، لیکن
زیبِ داستاں کہاں کے ہیں

ہم یہیں کے ہیں دردمند ترے
یہ نئے رازداں کہاں کے ہیں

ہم مچھیرے ہیں ساحلوں والے
بحر یہ بےکراں کہاں کے ہیں

ہیں زمینی کہ آسمانی یہ
تیرے یہ ہم زباں کہاں کے ہیں

تُم کہاں کے ہو انجمن میں ظفر
اور، یہ مہرباں کہاں کے ہیں

☆

سب میں چرچا کریں گے
خود کو رُسوا کریں گے

آسمان کی سیر کو
ہم بھی جایا کریں گے

جس کو دیکھا ہی نہیں
اُس کی پُوجا کریں گے

جادوگری ہے یہ کیا
اُس سے پُوچھا کریں گے

پہلے تو سب میں اُسے
جھوٹا سچّا کریں گے

خاک جلی تو مُستقل
اُس پر سویا کریں گے

ہم بھی اُس کی طرح کا
کوئی تماشا کریں گے

جس کا نہیں وجود ہی
اُس کو دیکھا کریں گے

سوچیں سمجھیں گے، ظفر
دیکھا بھالا کریں گے

☆

ہیرا پھیری خُوب ہے
دُنیا تیری خُوب ہے

جیسی ہے یہ چاندنی
رات اندھیری خُوب ہے

سیر ستاروں کے لگے
اِس کو، سیری خُوب ہے

بے لگام تھی کائنات
اُس نے گھیری خُوب ہے

دُنیا کسی کی بھی نہیں
تیری میری خُوب ہے

آنکھیں اُسے دکھائی ہیں
یہی دلیری خُوب ہے

مُنھ یہ چاند سا چمکتا
زُلف گھنیری خُوب ہے

چکّر اچھا ہے کبھی
شام سویری خُوب ہے

گھوڑی سے آگے، ظفر
چلے پھیری، خُوب ہے

☆

آخر ہے یہ سب کیا راز
سیدھا راز اور اُلٹا راز

بات صرف اتنی سی ہے
کھویا خُود کو، پایا راز

بھانڈا پھوڑ دیا اُس کا
پہلے پایا اُس کا راز

پیچ ہمیں نے ڈالے ہیں
ہے وہ سیدھا سادہ راز

بے رازی کے اندر ہی
چھپا ہُوا ہے سارا راز

دیکھو، اِسی زمین میں ہے
آسمان کا سارا راز

جس کو سمجھ نہیں آئی
خاص اُسی نے سمجھا راز

ایک بار جو سمجھ گیا
پھر نہیں اُس نے کھولا راز

خُود بھی وہ ظاہر تھا، ظفر
مَیں نے بھی نہیں رکھا راز

☆

برقع اُٹھانا کوئی دن
آنا جانا کوئی دن

روک بھی رکھنا کبھی تو
یہی زمانہ کوئی دن

کہیں بدلنا بھی کبھی
ٹھور ٹھکانا کوئی دن

کہتے رہنا خلق سے
یہی فسانہ کوئی دن

دُور رہے ہو اِس قدر
پاس بٹھانا کوئی دن

دریا ہو اِتنے بڑے
پیاس بُجھانا کوئی دن

روک سکو شاید کبھی
کھیل پُرانا کوئی دن

یہی بتا رے پنچھی کے
دانہ دانہ کوئی دن

رکھنا آباد ، اے ظفر
یہ ویرانہ کوئی دن

☆

جب بھی سوچ بنائی ہے
اُلٹی سوچ بنائی ہے

اُس کو سوچنے کے لیے
کیسی سوچ بنائی ہے

اُتنے ہی بے فکر ہیں
جتنی سوچ بنائی ہے

کون ہے جس نے یہاں پر
اپنی سوچ بنائی ہے

مہنگے اخراجات سے
سستی سوچ بنائی ہے

تُجھے سمجھنے کے لیے
تیری سوچ بنائی ہے

وہی بڑا جس نے یہاں
پہلی سوچ بنائی ہے

ٹیڑھا تھا موضوع ہی
ترچھی سوچ بنائی ہے

بول نہیں سکتی ، ظفر
گونگی سوچ بنائی ہے

☆

میرا اور تمھارا کچھ
چکراتا ہے سارا کچھ

آسمان کے نیچے ہم
کرتے رہے گزارہ کچھ

کچھ خود میں بھی ہمت تھی
ملتا رہا سہارا کچھ

جاتی ہے یہ راہ کہیں
اور ، کہتا ہے ستارہ کچھ

صبح تو ٹھیک ہوئی ، لیکن
ٹوٹ گیا ہے کنارہ کچھ

ہوتا رہا یہاں کچھ اور
دیتے رہے اشارہ کچھ

کچھ زمین پر پھینک دیا
آسمان میں مارا کچھ

باز نہیں آنے والے
کریں گے وہی دوبارہ کچھ

آخر مانی ہار ، ظفر
چلا نہیں ہے چارہ کچھ

قول و قرآن بھی اسی کا ہے
اور شیطان بھی اسی کا ہے

نیند پڑتی نہیں ہے ساری رات
خواب ہر آن بھی اسی کا ہے

جس سے باغی ہوئے ہیں آخری بار
یہ تو فرمان بھی اسی کا ہے

سقف و در بھی اسی کے ہیں سارے
اور ، دالان بھی اسی کا ہے

راستہ مشکلوں سے پُر ہے بہت
اور ، آسان بھی اسی کا ہے

وہ رہے گا ہمارے سر پہ سوار
اور ، امکان بھی اسی کا ہے

ہے یہ تنہائی بھی اسی کے لیے
شہر گنجان بھی اسی کا ہے

جنگ بھی اس نے جیتنی ہے ضرور
کہ یہ میدان بھی اسی کا ہے

خوش بھی دنیا سے ہے ظفر ، لیکن
دل پریشان بھی اسی کا ہے

کام ہے کیا حیرانی والا
اس دُنیائے فانی والا

اپنا اپنا سا لگتا ہے
خصلت وہ بیگانی والا

کیا کیا ہیں پہچانیں اُس کی
گھنگرو والا، گانی والا

کوئی شرابی ہے پکا وہ
چال کسی مستانی والا

کیسا ڈھونگ رچا رکھا ہے
روٹی والا، پانی والا

کرتا ہے وہ سوچ سمجھ کر
نہری سے بارانی والا

ہم پر بند پڑا ہے، تھا جو
رستا ایک آسانی والا

کسی سمندر پر آیا ہے
وقت کوئی طغیانی والا

لکھا ہوا دیکھا تو ظفر کو
بھولا سبق زبانی والا

-☆-

بُرا ہوا یا اچھا ہو گا
جو چاہے گا ویسا ہو گا

اُس کی ذمے داری ہے یہ
اُلٹا سیدھا جیسا ہو گا

اسی زمین کے اک حصے پر
آسمان کا قبضہ ہو گا

سب کو دیں گے حصہ رسدی
جس کا جتنا جتنا ہو گا

اُوپر بھی شاید ایسے ہی
جنگل ہوں گے، دریا ہو گا

مُلّا حُوروں کے جُھرمٹ میں
بیٹھا حلوہ کھاتا ہو گا

سسٹم یہی چلے گا شاید
پرجا ہو گی، راجا ہو گا

وہ بھی لڑے گا کوئی الیکشن
جو ریفرنڈم جیسا ہو گا

نیک بیبیوں کی خاطر بھی
شاید ایک اک حُورا ہو گا

-☆-

بد دعائے ہوئے نہیں تھے ہم
یُوں تھکائے ہوئے نہیں تھے ہم

اُس نے بھیجا تھا خود یہاں ہم کو
آپ آئے ہوئے نہیں تھے ہم

تھے ستائے ہوئے تو پہلے ہی
زخم کھائے ہوئے نہیں تھے ہم

اُس کی پیچیدگی پہ البتہ
سر کھپائے ہوئے نہیں تھے ہم

یہ غلط ہے کہ آپ کے ہاتھوں
آزمائے ہوئے نہیں تھے ہم

رونی صورت نہ تھی، مگر پھر بھی
مُسکرائے ہوئے نہیں تھے ہم

سنسنایا ہُوا تو تھا جنگل
سنسنائے ہوئے نہیں تھے ہم

فُرصتِ گریہ بھی ملی نہ ہمیں
اور، گائے ہوئے نہیں تھے ہم

تھی جو تعمیرِ نو میں دیر، ظفر
ابھی ڈھائے ہوئے نہیں تھے ہم

-☆-

زیر زبر نے کرنا ہے
سب نے، ہر نے کرنا ہے

کام تو یُوں سمجھو سارا
رختِ سفر نے کرنا ہے

کریں گے پیچھے کے ہی لوگ
کیا افسر نے کرنا ہے

کون یہ کہتا ہے اُس کی
اگر مگر نے کرنا ہے

بُوڑھوں کا یہ کام نہیں
تازہ و تر نے کرنا ہے

عرش پہ بھی عُقدہ یہ حل
زور اور زر نے کرنا ہے

آخر اپنا اپنا کام
شمس و قمر نے کرنا ہے

باہر کا بھی کیا دھرا
سب اندر نے کرنا ہے

حکم ہی دینا ہے اُس نے
اور، ظفر نے کرنا ہے

-☆-

کچھ کم نہیں تھے ہوا کے اسرار
پھر اتنے بڑے خلا کے اسرار

اب تک تو خدا ہی جانتا ہے
سارے پورے خدا کے اسرار

ایک اور ہی طرح کے ہیں، لیکن
دل سے نکلی دعا کے اسرار

ہر چیز کے راز الگ الگ ہیں
ایسے ہیں جدا جدا کے اسرار

کافی ہے ایک راز اس کا
ہوں لاکھ ہما شما کے اسرار

کرنا کیا بات اجنبی کی
کھلتے نہیں آشنا کے اسرار

سجدے بھی کیے تو کھل نہ پائے
ایسے تھے نقشِ پا کے اسرار

اچھا ہی کیا جو ہم نے اب تک
کھولے نہیں دل رُبا کے اسرار

اس سے تو ظفر خموش رہتے
کیا مل گیا ہے بتا کے اسرار

☆

سحر کو شام سمجھتا ہوں میں
اک یہی کام سمجھتا ہوں میں

خامشی یہ جو رواں ہے، اس کو
کوئی کہرام سمجھتا ہوں میں

تیرے سانچے میں ہی ڈھل جائے کہیں
طبع کو خام سمجھتا ہوں میں

کچھ ترا نقش ہے دل کے اندر
کچھ ترا نام سمجھتا ہوں میں

تُو بھی کچھ خاص نہیں ہے، مولا
تجھ کو بھی عام سمجھتا ہوں میں

ابھی پہنچا نہیں تجھ تک، لیکن
تیرا پیغام سمجھتا ہوں میں

میرے آغاز سے ہی ظاہر ہے
اپنا انجام سمجھتا ہوں میں

وہ خموشی ہی نہ ہو سر تا سر
جسے کہرام سمجھتا ہوں میں

رازِ ہستی کو کئی دن سے، ظفر
طشت از بام سمجھتا ہوں میں

☆

زمین و آسماں کا کھیل کیا ہے
ہمارا اور تمھارا کھیل کیا ہے

نہ جیتا ہے کوئی اس میں نہ ہارا
یہی ہم نے جو کھیلا کھیل کیا ہے

ہیں اک دوجی کے پیچھے کہکشائیں
کہو ، اب اس سے اچھا کھیل کیا ہے

یہ جامہ جو خلا کا ہے ازل سے
یہ اُلٹا ہے کہ سیدھا ، کھیل کیا ہے

اصُول اس کے ہمیں بھی کُچھ بتاتے
کہ یہ اُلجھا ہُوا سا کھیل کیا ہے

جو مُہرے ہم اسی شطرنج کے ہیں
تو ہم کو بھی بتاتا کھیل کیا ہے

کھلاڑی کون کون اس کے ہیں دراصل
ہے یہ میدان کیسا ، کھیل کیا ہے

ہم اپنے طور پر کھیلے تو ، لیکن
سمجھ میں ہی نہ آیا کھیل کیا ہے

ظفر ، بس دیکھتے جاؤ مُسلسل
نہ پُوچھو یہ تماشا کھیل کیا ہے

-☆-

سب کو تیری طرف بُلاؤں گا
میں ہی تیری مدد کو آؤں گا

گر عبادت پسند ہے تُجھ کو
اکثروں کو ادھر لگاؤں گا

پہلے دیکھوں گا تیرا طور طریق
فردِ اعمال پھر دکھاؤں گا

یہ بھی ممکن ہے عرصۂ محشر
سے کہیں دُور بھاگ جاؤں گا

کہیں اک موجۂ ہوا بن کر
تیری حُوروں میں سرسراؤں گا

تیرے احوال بھی سُنوں گا وہاں
اپنی بپتا تجھے سُناؤں گا

سارے پردے ہٹاؤں گا تیرے
ایک پردہ نہیں ہٹاؤں گا

تیری جنت میں جا کے بھی ہردم
یُوں ہی روؤں گا اور گاؤں گا

تُجھ سے مل کر تو ہی ، ظفر ، شاید
آخری بار مُسکراؤں گا

-☆-

تو ہے مشکل کشا ، اے خدا اے خدا
مجھ کو مجھ سے بچا ، اے خدا اے خدا

کب سے بھٹکا ہوا دشتِ خواہش میں ہوں
مجھ کو رستہ بتا ، اے خدا ، اے خدا

کوئی دوبارہ ملنے کی توفیق دے
میں ہوں خود سے جدا ، اے خدا ، اے خدا

اپنے افلاک سے ، میرے ادراک سے
تو ہے سب سے بڑا ، اے خدا ، اے خدا

رنگِ خوابِ ہنر تیری رحمت سے ہے
تیری قدرت سے تھا ، اے خدا ، اے خدا

عاجزی کا اثر میری آواز میں
تو نے پیدا کیا ، اے خدا ، اے خدا

میں نے جو کچھ کیا ، تیری تائید سے
مجھ سے جو کچھ ہوا ، اے خدا ، اے خدا

مجھ کو حیرت بھی دے ، مجھ کو حسرت بھی دے
یوں تو سب کچھ دیا ، اے خدا ، اے خدا

جانے کب سے اٹھائے ہوئے ہے ظفرؔ
بارِ دستِ دعا ، اے خدا ، اے خدا

-☆-

ایسا ہے یا ویسا ہے
تو بھی میرے جیسا ہے

یہی لگن رہتی ہے ، تو
کتنا ہے اور کیسا ہے

اپنا خزانہ ڈھانپ کے رکھ
جو کچھ پائی پیسا ہے

جیسی دنیا ہے تیری
شاید تو بھی ایسا ہے

خلد میں چلسیپٹے کھاتا
مولوی ہے یا بھینسا ہے

جیسے ہم ، ویسی تقدیر
یوں ایسے کو تیسا ہے

ذائقہ اپنی لسی کا
کچھ جنت کی مے سا ہے

تیرا ہی شاگرد ظفرؔ
تیرے ساتھ ہی بہتا ہے

تو بھی سچ پوچھے تو ظفرؔ
کھوئی ہوئی اک لے سا ہے

-☆-

گور کنارے کھڑے ہیں
اور ہم سارے کھڑے ہیں

پاس اندھیرا ہے بہت
دُور ستارے کھڑے ہیں

مِلا نہیں پہلے بھی کُچھ
اب دوبارے کھڑے ہیں

چلتا ہے خُود ہی یہ خلا
اور ، سیّارے کھڑے ہیں

اور ، قطاریں باندھ کر
سبھی بچارے کھڑے ہیں

چلتے چلتے رُک گئے
اب نظارے کھڑے ہیں

سُورج ، چاند اور یہ زمیں
کیا ہرکارے کھڑے ہیں

ہم بھی اپنی اِک طرف
دال بگھارے کھڑے ہیں

بیٹھی ہے پرجا ، ظفر
راج دُلارے کھڑے ہیں

☆

روتے گاتے جائیں گے
جاتے جاتے جائیں گے

آبادی بڑھتی رہے
ہم تو آتے جائیں گے

سُنو یا نہیں سُنو تُم
ہم بتلاتے جائیں گے

پہلی بار تو پیار سے
پاس بٹھاتے جائیں گے

دُنیا سے جاتے ہُوئے
چاند بُجھاتے جائیں گے

مریں گے کھا کھا کر ، مگر
پھر بھی کھاتے جائیں گے

گھومتی ہُوئی زمین کو
اور گھماتے جائیں گے

آئے تھے جس کام سے
یاد دلاتے جائیں گے

مار پڑی ہے ظفر کو
سر سہلاتے جائیں گے

☆

بحر و بر ہے یہ آپ کا ، صاحب
بات سُنیے ذرا خُدا صاحب

کسی قوس و قطار میں نہیں ہم
اور ، ہماری بساط کیا صاحب

جس پہ اب تک اکڑ کے چلتے رہے
تھا یہ سب آپ کا دیا صاحب

دیتی رہتی ہے آپ ہی کا ثبوت
چلتی رہتی ہے جو ہوا صاحب

اب تلافی نہیں ، معافی ہے
کام سارا تو ہو چکا صاحب

یہ زُباں آپ ہی کی دی ہوئی تھی
بخش دیں اب کہا سُنا صاحب

اور کیا کیجیے دوا اس لیے
اور کیا مانگیے دُعا صاحب

بیشک اعراف میں عطا کیجے
بوریا سا بچھا ہوا صاحب

پیش ہے آپ کے حضور ظفرؔ
یہ بھی ہے ایک بے نوا صاحب

☆

ہیں اگر آج دوبدو صاحب
کیجیے کوئی گفتگو صاحب

ہم ترستے رہے زمانوں تک
رنگ لائی ہے جستجو صاحب

ہیں یہاں بھی عجب گل و گلزار
تھے وہاں بھی یہ رنگ و بُو صاحب

فرق اتنا بہت نہ رکھنا تھا
ہم کہ نوکر ہیں ، اور ، تُو صاحب

دو گھڑی چین ہی اگر مل جائے
پھرتے آئے ہیں کوبکو صاحب

حاضری ہے ہماری آج کے دن
ابھی ہونا ہے رُوبرُو صاحب

ہم بھلا کس طرف کو جائیں ، کہ ہیں
آپ ہی آپ چارسُو صاحب

آپ اگر کر سکیں درست یہ دل
تھا نہیں قابلِ رفو صاحب

آپ آئے ہیں جس جہاں سے ، ظفرؔ
یہی نقشہ تھا ہوبہو صاحب

☆

چاہیے لطف اور کرم صاحب
نہیں اب کوئی دم میں دم صاحب

نہیں قابل اب اور سہنے کے
ہم نے خود پر کیے ستم صاحب

آپ نے خود اسے کیا سیدھا
راستہ تھا یہ خم بہ خم صاحب

آج اگر اتنی ہی اجازت ہو
لے سکیں آپ کے قدم صاحب

سامنے سب کے شرمسار نہ ہوں
اپنا رہ جائے کچھ بھرم صاحب

کچھ نہیں ہے سوا ندامت کے
یہی دل میں ہے ایک غم صاحب

دے کے خوش کیا کریں فرشتوں کو
پاس اپنے نہیں رقم صاحب

کوئی دشمن بھی ہو نہ آج کے دن
جیسی حالت میں آئے ہم صاحب

بھیک دے دیجیے ظفر کو بھی
یہ خزانہ نہ ہو گا کم صاحب

-☆-

پاس کچھ بھی نہیں ، مگر صاحب
رحم فرمایئے اگر صاحب

کچھ بہانہ نہیں بنا سکتے
تھی کبھی کچھ ہمیں خبر صاحب

جب غفورالرحیم کہلائے
کیوں ہے تاخیر اس قدر صاحب

ہونٹ اگر خشک ہیں تو پھر کیا ہے
آنکھیں اپنی ہیں تربتر صاحب

ایک دن گر یہیں پہ آنا تھا
کیوں پھرایا ہے دربدر صاحب

ہو الاٹ اس نواح میں ہم کو
کوئی چھوٹا سا ایک گھر صاحب

کیا کہیں ، اور ، کیا دلیلیں دیں
بات میں ہی نہیں اثر صاحب

مستحق جس سلوک سخت کے ہیں
آ رہا تھا یہ سب نظر صاحب

جھوٹ ہی بولتا رہا ہے ظفر
پاس تھا اک یہی ہنر صاحب

-☆-

آپ تو تھے ہی لامکاں صاحب
آپ رہتے ہیں کیا یہاں صاحب

کہیں چھوڑ آئے ہیں جو فردِ عمل
اس کی گنجایش اب کہاں صاحب

کام کرتا نہیں دماغ یہاں
ساتھ دیتی نہیں زباں صاحب

کہیں بھٹکا ہُوا ہے دل اب بھی
کہیں اٹکی ہُوئی ہے جاں صاحب

مشکلیں ہوتی جائیں گی آسان
آپ ہوں گے جو مہرباں صاحب

یہ بھی قطرہ کہیں سما جائے
آپ کی ذات بیکراں صاحب

اور جائے اماں نہیں کوئی
ڈھونڈتے ہیں یہیں اماں صاحب

آپ نے ہی وہاں پہ بھیجا تھا
آپ ہی لائے ہیں یہاں صاحب

آپ ہی میرِ کاروانِ ابد
اور، ظفر، گردِ کارواں صاحب

☆

سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

فراق گورکھپوری

سوچتے تھے فضا ہے نامانوس
یہ تو سارا خلا ہے نامانوس

آتے جاتے گرے ہیں ناواقف
اُڑتی پھرتی صبا ہے نامانوس

فاصلے اس قدر زیادہ ہیں
ایک سے دوسرا ہے نامانوس

ابھی کچھ بھی پتا نہیں چلتا
کیا نہیں ، اور ، کیا ہے نامانوس

اجنبی جس بھی وہیں کا ہے
جس طرف کی ہوا ہے نامانوس

یہ ستاروں کی بستیاں ، یہ دُھواں
کبھی ناآشنا ہے ، نامانوس

کس طرف مجھ کو کھینچ لائے ہو
یہ کوئی سلسلہ ہے نامانوس

کیسے میری سمجھ میں آئے گا
کہ مرا سوچنا ہے نامانوس

کچھ تو سُنتا نہیں وہ بات ، ظفر
اس پہ میرا کہا ہے نامانوس

☆

ڈاکٹر عبدالستار ایدھی کے نام

[illegible] بھی کائنات کی ہے
چال اُلٹی بھی کائنات کی ہے

آپ ہی آپ پھیلتے جانا
بات اچھی بھی کائنات کی ہے

دُور در دُور اور خلا بہ خلا
خاک اُڑتی بھی کائنات کی ہے

آسمانوں کے برف زاروں میں
گرماگرمی بھی کائنات کی ہے

جو مرے فہم سے ورا ہے ابھی
ہیراپھیری بھی کائنات کی ہے

میرے اندر کھُلی ہوئی کب سے
کوئی کھڑکی بھی کائنات کی ہے

ایک صورت سی میری آنکھوں میں
بنتی مٹتی بھی کائنات کی ہے

گفتگو ساری کائنات کے ساتھ
کچھ تمھاری بھی کائنات کی ہے

دُور تر بھی ہوں اس بلا سے، ظفر
ہم نشینی بھی کائنات کی ہے

☆

دلدل سی ایک ہے کہ ہیں جس میں دھنسے ہوئے
میں اور کائنات ہیں دونوں پھنسے ہوئے

آوارگانِ گردشِ افلاک، دیکھنا
ڈھیلے سے، اور، پھر بھی ہیں کیسے کسے ہوئے

کچھ آسماں میں اتنی جگہ بھی نہ تھی کہیں
تارے سے میرے دل کے ہیں اندر ٹھنسے ہوئے

دن کو ہے کچھ تو رات کو ہے اور ہی یہ کچھ
یہ آسماں خیال عجب وسوسے ہوئے

سادہ معاملات جو سمجھا نہیں تھا میں
قولِ محال بن کے وہی مخمصے ہوئے

دیکھے تھے میں نے کون سے باغِ بہشت میں
شہتوت سے وہ ہونٹ، بہت ہی رسے ہوئے

ہنسنے کے ساتھ ہی نکل آئے ہیں اشک بھی
کچھ اتنی دیر کے بھی نہیں ہم ہنسے ہوئے

اپنا تھا یا وہ غیر تھا، کچھ بھی خبر نہیں
ہم بار بار ہیں یہاں جس کے ڈسے ہوئے

شاید یہ راکھ اُن ہی ستاروں کی ہے، ظفر
جو تھے کبھی ہمارے دلوں میں بسے ہوئے

☆

ملتا جو کائنات کے آغاز کا سُراغ
پیدا ہُوئی ہے جس سے ، اُس آواز کا سُراغ

جو آسماں پہ ٹھیک ، زمیں پر غلط رہے
کوئی لگا سکے جو اِس انداز کا سُراغ

بے سُر پڑا ہُوں جس کے بغیر ایک عُمر سے
دے گا کبھی تو کوئی مرے ساز کا سُراغ

شرمندہ ہونا چاہتا ہُوں ، پر ابھی نہیں
دیتا نہیں ہُوں اپنی تگ و تاز کا سُراغ

لاؤں کہاں سے موجِ معانی بہاؤ پہ
مَیں خود لگا سکا نہیں الفاظ کا سُراغ

رُسوائی کے قریب سے ہوتا ہُوا کبھی
پاتا کوئی تو میرے اِس اعزاز کا سُراغ

مَیں بھی بدلنے والا ہُوں اُسلوبِ آرزو
مَیں نے بھی پا لیا ہے اُس اغماض کا سُراغ

لیتے ہیں میرے صبر کا روز امتحاں یہ لوگ
لاتے ہیں اُس کی جلوہ گہِ ناز کا سُراغ

محدود عقل دے کے وہ فارغ ہُوئے ، ظفرؔ
دیتے نہیں ہیں آپ کسی راز کا سُراغ

☆

ہماری کہکشاں ہے یا تُمھاری کہکشاں ہے
یہ کِس نے آسمانوں سے اُتاری کہکشاں ہے

درخشانی کہاں سے آ گئی ہے زور کرتی
یہ تم ہو ، مَیں ہُوں یا ساری کی ساری کہکشاں ہے

ابھی تو اور بھی ہیں دَور میری زندگی کے
ابھی تو مَیں نے اِن میں سے گُزاری کہکشاں ہے

توازن کِس طرح سے آئے گا خالی خلا میں
بہت ہلکا ہُوں مَیں ، اور ، اِتنی بھاری کہکشاں ہے

ہیں دونوں ہی بہت حیرت زدہ اک دُوسرے پر
فلک ٹھہرا ہُوا ہے ، اور ، جاری کہکشاں ہے

ستارے ، چاند ، سُورج بے شُمار اِس کے ہیں اپنے
ہزاری ، دہ ہزاری ، سو ہزاری کہکشاں ہے

مَیں اِس کے رُوبرُو بس ایک لمحے کو ہُوا تھا
لہو میں آج تک جاری و ساری کہکشاں ہے

ہمیں تو دِن میں بھی تارے نظر آتے ہیں اکثر
ہماری تو یہاں بے روزگاری کہکشاں ہے

ظفرؔ ، مَیں دُودھیا رستے کا راہی تھا ابد سے
مرے خوابِ سفر پر اب بھی طاری کہکشاں ہے

☆

پیٹے جیسا، تانے جیسا
سارے آنے بانے جیسا

آنکھوں میں اٹکا ہے آخر
لمحہ ایک زمانے جیسا

منظر پھر اچھا ہوتا ہے
اس دُنیا سے جانے جیسا

نیا نیا ہو کر آتا ہے
لہرا خواب پُرانے جیسا

اُس نقشے کی بات نہ پُوچھو
تھا گندم کے دانے جیسا

کبھی چراغوں کا جلنا ہے
اُس کے بزم میں آنے جیسا

بن کر دیکھو، ہو کر دیکھو
اندھے جیسا، کانے جیسا

لُطف نہیں رکھتا ہے کوئی
پینے جیسا، کھانے جیسا

منظر دیکھا آج ظفر نے
ذرّوں کے ٹکرانے جیسا

☆

ہو ئی جہاں تھا
وہم و گُماں تھا

کسی نقش پر
کوئی نشاں تھا

دُھول تھی اندر
اور، دُھواں تھا

ایک صدی تھی
ایک سماں تھا

کہیں مکیں تھے
کہیں مکاں تھا

رُکے ہُوئے میں
کوئی رواں تھا

مَیں تھا یہاں پر
مَیں ہی وہاں تھا

حُسن بھی آخر
حُسنِ بیاں تھا

آپ ظفر ہی
مالِ گراں تھا

کیا کوئی دیکھتا راستا
تھا وُہی دُودھیا راستا

راستے تھے کئی اُس طرف
اور ، اُنھیں کاٹتا راستا

چاند کے پیچھے پیچھے وُہی
چاندنی سے اَٹا راستا

کب سے خالی پڑا ہے یُونہی
روشنی سے بھرا راستا

یہ بچھائے ہُوئے ماہ و سال
یہ بنایا ہُوا راستا

کُچھ بھی کُھلتا نہیں ہے ابھی
ہے یہ دیوار یا راستا

جس پہ ہم چل پڑے تھے کبھی
تھا کوئی خواب سا راستا

اک رُکاوٹ ہے تُو ، ورنہ میں
روک دُوں وقت کا راستا

جس طرف چل پڑے ہم ، ظفر
اُس طرف بن گیا راستا

☆

ہیں یہ کیسے رات دن ، کس طرح کا ماحول ہے
جو زمین و آسماں ، سب سے جدا ماحول ہے

ہر طرف ذرّوں کے یہ انبار سے نکلتے ہُوئے
روشنی ہے ، اور ، کیسا ملگجا ماحول ہے

سامنے خاکستر خورشید سی اُڑتی ہُوئی
جس کے اندر ایک صبح و شام سا ماحول ہے

ہر کوئی گردش میں ہے اک دُوسرے کے اِرد گرد
جس طرف دیکھو ، کُچھ ایسا دائرہ ماحول ہے

کُچھ نظر میں ، اور ، سمجھ ہی میں نہیں آتا کہیں
کون سا موسم ہے چاروں سمت ، کیا ماحول ہے

جو ابھی ظاہر تھا ، غائب ہے کہ ظاہر ہو سکے
چار سُو کیسا اُبھرتا ڈُوبتا ماحول ہے

ہے یہاں پر بھی بہاروں اور خزاؤں کا چلن
کوئی پیلا ہے کہیں ، کوئی ہرا ماحول ہے

میرے باہر تو ہے کوئی انقلاب آیا ہُوا
میرے اندر بھی بہت کُچھ زلزلہ ماحول ہے

شاعری پہلے ہی جیسی اب بھی ہوتی ہے ، ظفر
میں تو سمجھا تھا کوئی بدلا ہُوا ماحول ہے

☆

اک بار رہ گئی جو خسارے میں کائنات
مٹ کر یہاں بنے گی دوبارے میں کائنات

پھیلائیں گے اسے حدِ کون و مکاں سے دُور
پھر بھینچ دیں گے ایک شرارے میں کائنات

مَیں اپنے آپ میں نکل آیا ہُوں دُور تک
اور ، ڈھونڈتا ہُوں اپنے کنارے میں کائنات

کب تک رہے گا ایک ہی شام و سحر کا رنگ
بہتی رہے گی ایک ہی دھارے میں کائنات

جب منہدم ہُوا تو نشاں بھی نہ تھا کہیں
آباد تھی وگرنہ ستارے میں کائنات

مَیں تاکہ اس کو پھاڑ کے خود لُطف اُٹھا سکوں
لگتی ہے مُجھ کو ایک غبارے میں کائنات

گنجایش اور تیسری کی ہے کہاں ، اگر
تقسیم ہے ہمارے تُمھارے میں کائنات

ہونے لگا ہے کُچھ تو ہمارا بھی اعتبار
دینے لگے ہیں اب وہ اُدھارے میں کائنات

اس طرح سے بگاڑ بھی سکتے ہیں وہ ، ظفر
جس طرح سے بنی ہے اشارے میں کائنات

☆

اُس نے خود آ کے مُجھ کو بتایا ہے طُولِ موج
کتنا لگا ہے ، کتنا بقایا ہے طُولِ موج

ذرّوں کے اضطراب کا عالم ہی اور تھا
اک طُولِ موج سے جو اُٹھایا ہے طُولِ موج

تابش کے زور شور پہ بندش لگائی ہے
اور ، کافی مشکلوں سے گھٹایا ہے طُولِ موج

گنجایش اور کوئی نہیں تھی ، اسی لیے
آپس کے راستوں میں سمایا ہے طُولِ موج

کرتا مَیں اس کو شعر میں کس طرح سے بیاں
میری سمجھ میں ہی نہیں آیا ہے طُولِ موج

رَو میں رواں ہُوں ساتھ ہی سب کے کُچھ اس طرح
مَیں ہُوں کبھی ، کبھی مرا سایا ہے طُولِ موج

ہے اتنی روشنی کہ مرے آر پار ہے
یہ کس نواح میں مُجھے لایا ہے طُولِ موج

مَیں نے بھی کوئی خاص توجّہ نہیں دھری
اُس نے بھی دُور سے ہی دکھایا ہے طُولِ موج

اُس کو بھی ناپسند ہیں یہ فاصلے ، ظفر
مَیں نے بھی سامنے سے ہٹایا ہے طُولِ موج

☆

پکارتی ہے بہت دور سے زمیں مجھ کو
مگر ، یہ اپنی طرف کھینچتی نہیں مجھ کو

ابھی گرے مرے اندر بھی ہیں خلا یہ خلا
ذرا سی دیر کو بس چھوڑ دو یہیں مجھ کو

ابھی سفر میں ہیں ، تارے ، غبار ، کاہکشاں
کرے گا کیا کوئی ایسے میں ہم نشیں مجھ کو

گھماؤ میں کوئی ٹھہراؤ کی نہیں صورت
کہیں پہ بھی نہیں دیکھو گے جاگزیں مجھ کو

میں اپنی سیدھ میں چلتا ہی جاؤں گا بھی تو پھر
یہ گردشیں کبھی لے آئیں گی وہیں مجھ کو

ابھی ہوں سلسلۂ انجماد سے بھی پرے
زمانہ چاہیے کچھ اور ، آتشیں مجھ کو

چہار سُو مرے پھیلاؤ پہ نہ جا ، کہ یہاں
لیے بھی پھرتا ہے اِک خواب واپسیں مجھ کو

کوئی بھی چیز نہیں ہے یقین کے قابل
رہے گا ایک اِسی بات پہ یقیں مجھ کو

بغیر سمت کے چل تو پڑا ہوں میں ، سو ، ظفر
یہ لے ہی جائے گی آخر کبھی کہیں مجھ کو

☆

باہر کی روانی ہو کہ اندر کی روانی
ہے میرے لیے ایک ہی چکر کی روانی

بہتی ہے ندی اپنے سے آگے بھی نکل کر
اور ، اپنے ہی اندر ہے سمندر کی روانی

بہتا ہوا ذرّوں کا کوئی سیلِ فلک تاب
جیسے کسی دریائے منوّر کی روانی

سیلابِ جمال ایسا گزرتا ہے شب و روز
کیا یاد رہے گی کسی پیکر کی روانی

میں سوچ بھی سکتا نہیں رُک کر کسی صورت
گردش ہے برابر کی ، برابر کی روانی

ہیں ایک ہی زنجیرِ جہانگیر کے حلقے
ملتی نہیں آپس میں ہی اکثر کی روانی

میں نے سفر آغاز ہی کرنا ہے وہاں سے
رُکتی ہے جہاں جا کے مقدّر کی روانی

کم ہے کہ زیادہ ہے ، مجھے کچھ نہیں معلوم
گلیوں کی روانی ہے مرے گھر کی روانی

اب کے یہ ، ظفر ، کیسی ہوا ہے مرے پیچھے
پہلے سے زیادہ ہے مکرّر کی روانی

☆

اصل میں میرے سوا ہے دریافت
آج تک جو بھی ہُوا ہے دریافت

مجھ سے پہلے تو یہ موجود نہ تھی
میری اپنی یہ ہوا ہے دریافت

جو بھی دریافت ہُوا دُنیا میں
کچھ مری اُس سے جُدا ہے دریافت

رُونما ہونے لگا ہُوں کچھ تو
وہ مجھے کرنے لگا ہے دریافت

کبھی آ کر اُسے جُھٹلا تو سہی
مَیں نے جو کر کے دیا ہے دریافت

جس کو دریافت کیا ہے مَیں نے
یہ تو پہلے بھی رہا ہے دریافت

مَیں نیا کوئی نوا گر بھی نہیں
نہ ہی یہ طرزِ نوا ہے دریافت

یہ جو صحرائے سُخن ہے، اِس میں
ایک میری بھی صدا ہے دریافت

خود کو اِس طرح سے گُم کر کے، ظفرؔ
آپ نے کچھ تو کیا ہے دریافت

-☆-

بے شک یہ تماشا ہے تمنا کے مساوی
دُنیا تو نہیں ہے مری دُنیا کے مساوی

آگے ہے فلک، اُس سے بھی آگے کئی افلاک
کیا کیا ہے، مگر، راہ میں کیا کیا کے مساوی

اُس چادرِ صد خواب کی دھجی بھی نہیں اب
اک شے جو مرے پاس تھی صحرا کے مساوی

کرتے کبھی اِس کام سے بڑھ کر کوئی، ورنہ
لاتے کوئی شے آپ اِن اشیا کے مساوی

کچھ میرے کنارے سا بھی ہے کوئی کِنارہ
دریا تو بہُت ہیں مرے دریا کے مساوی

لمحہ جو نہیں ہے کسی لمحے کے برابر
کچھ اور تو ہو گا اسی اثنا کے مساوی

ہونے کی مَیں کوشش تو بہُت کرتا ہُوں دِن رات
اعلیٰ کے مساوی کبھی ادنیٰ کے مساوی

فی الحال میسّر تو نہیں ہے مجھے، لیکن
ہوتی ہے کوئی شے لبِ گویا کے مساوی

ہونا ہے، ظفرؔ، اور طرح کی یہ مُلاقات
اک بار جو ہو جائے دوبارہ کے مساوی

-☆-

ڈھونڈوں جو ستارے کو ، ستارہ نہیں ملتا
جگنو کو بھی چمکنے کا اشارہ نہیں ملتا

دھنسنے کے لیے ہم کو مُیسّر نہیں دلدل
اُڑنے کے لیے کوئی غبارہ نہیں ملتا

رکھتے کوئی اُس بحرِ تغافل سے سروکار
مُدّت ہُوئی اپنا ہی کِنارہ نہیں ملتا

یہ سانپ تو سارے ہیں یہاں ایک ہی جیسے
ہر چند پٹاری سے پٹارا نہیں ملتا

مُشکل سے یہاں ایک اوارے کو ملے ہم
اس بھیڑ میں اب ہم کو اوارہ نہیں مِلتا

ہم بھی کئی دن سے نہیں موجود زمیں پر
کچھ یُوں بھی سُراغ اُس کو ہمارا نہیں مِلتا

مصرُوفِ محبت ہے زیادہ ہی کہ وہ شوخ
مِلتا بھی اگر ہے تو دوبارہ نہیں مِلتا

وہ ہم کو مُیسّر ہے ، مگر ، گاہے بگاہے
تھوڑا سا مِلا کرتا ہے ، سارا نہیں مِلتا

اک عُمر سے رہتے ہیں ، ظفرؔ ، ہم بھی یہاں پر
ہم کو تو مزاج اب بھی تمھارا نہیں مِلتا

☆

ٹھہرے کہیں وقت ہی کی رفتار
یکساں نہیں روشنی کی رفتار

گُزرا ہُوں وہاں سے بھی ، جہاں پر
تبدیل ہُوئی گھڑی کی رفتار

رہتا جاتا ہے پیچھے انساں
آگے ہے آگہی کی رفتار

کچھ موت کے بند باندھنے سے
رُکتی نہیں زندگی کی رفتار

قابو میں نہ آ سکی کسی کے
یہ عُمر رسیدگی کی رفتار

کھلتا نہیں اس دفعہ تو ، اے دوست!
کیا کچھ رہی دوستی کی رفتار

گھٹتا گیا زورِ آدمیت
بڑھتی رہی ، آدمی کی رفتار

احباب زیادہ ہوں نہ حیران
یہ بھی ہے کبھی کبھی کی رفتار

خالی ہونے ہی والا ہوں مَیں
ایسی ہے ، ظفرؔ ، کمی کی رفتار

☆

یہ جو اب ہے تو ہے کبھی کا غبار
گرتا رہتا ہے روشنی کا غبار

اُڑ رہا ہے کئی زمانوں سے
آسمانوں پہ آدمی کا غبار

یہ قرن ہا قرن پرانا بھی
لگ رہا ہے ابھی ابھی کا غبار

کوئی پہچان ہی نہیں سکتا
موت کا ہے کہ زندگی کا غبار

اُٹھتے جائیں گے خواب خواب قدم
بیٹھتا جائے گا کسی کا غبار

کسی آواز کے جزیرے پر
پھیل جاتا ہے خامشی کا غبار

راستہ میرا روک دیتا ہے
خود ہی میری مسافری کا غبار

شام کے وقت آپ ہوتا ہوں
اور، میری کسی کمی کا غبار

کیوں ظفر، دشمنی کے شیشے پر
جمتا جاتا ہے دوستی کا غبار

☆

پھیلتا جاتا ہے کاغذ پہ علاقہ میرا
کیوں نہ ہو باعثِ تخلیق دھماکا میرا

بنتی مٹتی مری تصویر خلا میں ہے وہی
آسمانوں میں اُڑا کرتا ہے خاکہ میرا

بے خبر رہتے مرے کانچ کے دل سے یونہی لوگ
گر کے ٹوٹا تو سنا سب نے چھناکا میرا

میں کسی اور کی دھن میں کہیں پھرتا رہا، اور
میرے پیچھے یونہی خالی رہا ناکا میرا

میں نے ہتھیار ہی جب پھینک دیے لڑتے ہوئے
فتح پھر ہوتا نہ کس طرح سے ڈھاکہ میرا

کچھ مجھے خلق بھی رکھتی رہی مشغولِ فساد
کچھ لہو بھی تھا زیادہ ہی لڑاکا میرا

حرفِ بے معنی سے ہوتی ہے مری افزائش
صفر لگنے سے ہی بنتا ہے دہاکا میرا

ڈرتے ڈرتے یونہی آغاز کیا میں نے سخن
رفتہ رفتہ یونہی کھلتا گیا جھاکا میرا

سعیِ فن میں جو بہت زور لگاتا ہوں، ظفر
کچھ اسی طرح سے نکلے گا کڑاکا میرا

☆

گردش کرتی ہوئی زمین
جیتی مرتی ہوئی زمین

ٹوٹتے ہوئے ستاروں سے
ہر دم ڈرتی ہوئی زمین

کائنات کی فوج میں کیوں
آخر بھرتی ہوئی زمین

اندر باہر ڈھول بجی
بیچ بکھرتی ہوئی زمین

آسمان کی سیڑھی سے
روز اترتی ہوئی زمین

ابھی یہ رکتی ہوئی لگے
ابھی گزرتی ہوئی زمین

کہیں ڈوبتی جاتی ہے
کہیں ابھرتی ہوئی زمین

پھر سے نئی ہو جاتی ہے
میری برتی ہوئی زمین

کبھی رواں رہتی ہے، ظفر
کبھی ٹھہرتی ہوئی زمین

☆☆

کہیں میٹھا ہے نہ کھاری پانی
آج کل ہوتا ہے بھاری پانی

سو رہا مینھ کی تہ کے نیچے
کر رہا خواب گزاری پانی

آسماں اور زمیں سے نکلا
خاک در خاک دودھاری پانی

ہو تو لے شہر میں داخل اک بار
بات بتلائے گا ساری پانی

چادر آب وہی ہے سر پہ
رات بھر رہتا ہے طاری پانی

کوئی بچ کر نہیں جاتا اس سے
اس طرح کا ہے شکاری پانی

خشک ہو جاتے ہیں خود ہی چشمے
کبھی رہتا نہیں جاری پانی

راستا آپ بنا لیتا ہے
کیا کرے عرض گزاری پانی

کام آیا نہ ہمارے یہ، ظفر
بات سنتا ہے تمھاری پانی

☆☆

کچھ زمیں، کچھ آسماں پر ہوں
جانتا ہوں میں کہاں پر ہوں

وقت آگے، اور ہے آگے
میں ابھی پچھلے نشاں پر ہوں

بھاگتے سے ابر کے پیچھے
دوڑتی سی کہکشاں پر ہوں

میں کہیں پر بھی نہیں شاید
تم سمجھتے ہو یہاں پر ہوں

وہم اپنا بھی نہیں باقی
میں کسی ایسے گماں پر ہوں

یہ بھی کیا کم ہے اگر اب تک
قایم اپنے ہی بیاں پر ہوں

حشر کیا کرتے ہیں اب میرا
جانے کس کس کی زباں پر ہوں

تم کہو، کافی مزے میں ہو
ٹھیک ہوں میں بھی جہاں پر ہوں

ہوں، ظفر، آدھا خلاؤں میں
اور، آدھا خاکداں پر ہوں

☆

ہم نہیں ہیں کوئی ستارہ شناس
ہیں اگر آپ بھی ستارہ شناس

جب ستاروں کا باغ کھلنے لگا
نکل آئے کئی ستارہ شناس

اک ستارے سے آشنائی تک
ہم نہیں تھے کبھی ستارہ شناس

آسماں تھا ہمارے اندر بھی
رہے باہر کے ہی ستارہ شناس

بجھ کے جو راکھ ہو گیا ہے یہاں
ہو سکا ہے وہی ستارہ شناس

میں یہاں شور کس لیے کرتا
تھی مری خامشی ستارہ شناس

خواب اُس کے نہیں تھے خوش منظر
آنکھ جس کی نہ تھی ستارہ شناس

میری تقدیر کی خبر تھی جسے
ہے کہاں وہ مری ستارہ شناس

ہم نہیں ہیں، ظفر، تو پھر کیا ہے
آپ ہے زندگی ستارہ شناس

☆

ہو گی یہ بھی کہاں کی پیمائش
کیجیے کیا بیاں کی پیمائش

فیتہ کہکشاں سے کرتے ہیں
آج اِس آسماں کی پیمائش

کہیں رفتار کا حساب کتاب
کہیں سیارگاں کی پیمائش

ایک تخمینہ آفتاب کا ہے
ذرّۂ بے نشاں کی پیمائش

آپ میرا کریں گے اندازہ
میں زماں و مکاں کی پیمائش

آپ کی عقل کے نہیں بس میں
میرے وہم و گماں کی پیمائش

بیٹھا بیٹھا ہی کرتا رہتا ہوں
کچھ یہاں سے وہاں کی پیمائش

اور تو اور، آج تک نہ ہوئی
ہم سے ایک آشیاں کی پیمائش

حرفِ اوّل کا ناپ ہے جو، ظفر
ہے وہی داستاں کی پیمائش

☆

جب ہمارا ہوا حساب کتاب
ساتھ اُس کا بھی تھا حساب کتاب

ہو سکے گا زمین والوں کا
آسمانوں پہ کیا حساب کتاب

فاصلے ہی عجیب تھے اب کے
بیچ میں رہ گیا حساب کتاب

یہ خم و پیچ ناپنے کے لیے
چاہیے ہے کُھلا حساب کتاب

آخری درجۂ حرارت سے
خود پگھلتا رہا حساب کتاب

ایک رفتار تھی قرن بہ قرن
تھا اُسی میں مرا حساب کتاب

ہو گئی رفع ساری خوش فہمی
بیٹھ کر جب کیا حساب کتاب

عشق تھا کاروبار ہی ایسا
کوئی کیا مانگتا حساب کتاب

پوچھ گچھ ہو گی آپ سے بھی، ظفر
ہم نے تو دے دیا حساب کتاب

☆

پرزہ پرزہ ہونا ہے
کبھی اکٹھا ہونا ہے

ٹکرانا ہے ستاروں نے
یہ بھی تماشا ہونا ہے

دریا دریا ہو کر بھی
صحرا صحرا ہونا ہے

بہت بُرا ہو کر ہم نے
اک دن اچھا ہونا ہے

آسمان پر ابھی بہت
خُون خرابہ ہونا ہے

پہلے نہیں ہُوا ہو گا
اس بار ایسا ہونا ہے

کبھی کسی ستارے نے
راہ سے بھٹکا ہونا ہے

اک دن جُھوٹا ، یا سچا
خواب ہمارا ہونا ہے

ایک بار ہو جائے ، ظفر
جو بھی ، جتنا ہونا ہے

☆

بند آنکھیں نہیں کرتا کوئی
ہونے والا ہے تماشا کوئی

میری قسمت کی خبر کیا دے گا
ٹوٹنے والا ستارہ کوئی

یہ زمیں کا ہی کرشمہ سمجھو
آسماں سے نہیں آتا کوئی

میں نے دن دیکھے ہی مانا خود کو
دیکھ کر بھی نہیں مانا کوئی

میری مٹی میں سمانے والا
میرے پانی سے اُبھرتا کوئی

ہیرا پھیری نہیں کچھ جانتا میں
کاش اتنا تو سمجھتا کوئی

آسماں ٹوٹ پڑے گا سر پہ
کیا مجھے اس کا پتا تھا کوئی

مطمئن بیٹھا ہے خاموش کہیں
کر کے یہ شور شرابا کوئی

رات نکلی ہے کسی دن سے ، ظفر
دن بھی ہے رات سے نکلا کوئی

☆

کبھی انار درخت ہیں
کبھی شرار درخت ہیں

بُو سی پھوٹ رہی ہے، کیا
صبح آثار درخت ہیں

آسمان پر اُگے ہُوئے
سدا بہار درخت ہیں

ہیں اقرار درخت یہ
یا انکار درخت ہیں

چھانو دے رہے یہاں تک
دریا پار درخت ہیں

زرد ہیں اپنی خُوشی سے
یا بیمار درخت ہیں

اپنے تو اِس دُھوپ میں
بس دو چار درخت ہیں

دیتے ہیں سب کی خبر
کُچھ اخبار درخت ہیں

ایک قطار میں ہی، ظفر
تین ہزار درخت ہیں

☆

اور ہی کوئی جل رہی ہے آگ
آسمان سے نکل رہی ہے آگ

شُعلہ شُعلہ دُھواں دُھواں ہر سُو
کیسی کیسی اُچھل رہی ہے آگ

کتنی مُشکل میں، کس عذاب میں ہے
آگ پر جیسے چل رہی ہے آگ

یہ جہنّم کا کوئی نقشہ ہے
جس طرح پھول پھل رہی ہے آگ

صرف باہر نہیں، دلوں میں بھی
ایک مُدّت سے پل رہی ہے آگ

کہیں جلتی ہے ایک ہی رُخ پر
کہیں پہلو بدل رہی ہے آگ

اپنے اندر گھسی ہوئی ہے کہیں
کہیں خُود سے پھسل رہی ہے آگ

لے رہی ہے لپیٹ میں سب کو
مَیں تو سمجھا تھا ٹل رہی ہے آگ

آسماں کی طرح، ظفر، اب تو
یہ زمیں بھی اُگل رہی ہے آگ

☆

ڈھیلے ڈھالے لوگ ہیں
بھولے بھالے لوگ ہیں

کوئی عبادت رات دن
کرنے والے لوگ ہیں

رات اور دن کی طرح سے
گورے کالے لوگ ہیں

جیتے ہیں کس بات پر
کیا متوالے لوگ ہیں

لڑ مرتے ہیں ایک دم
کیا یہ سالے لوگ ہیں

ساتھ نہیں اُس کے کبھی
جس کے پالے لوگ ہیں

چال چلیں گے اور کی
کیا بے چالے لوگ ہیں

ان کو میں سمجھاؤں گا
بچے بالے لوگ ہیں

اسی لیے اُس نے، ظفر
کل پہ ٹالے لوگ ہیں

-☆-

کیسی کالی دھوپ ہے
کوئی نرالی دھوپ ہے

چلی ہوئی ہے فلک سے
پہنچنے والی دھوپ ہے

چپکے ہوئے ہیں سب پتے
ڈالی ڈالی دھوپ ہے

ملی نہیں ہے خاک، تو
سر میں ڈالی دھوپ ہے

کبھی ہے اصلی ہر طرف
کبھی خیالی دھوپ ہے

سایہ نہیں ہے دور تک
ہر سُو خالی دھوپ ہے

کہیں کڑکتی ہے، مگر
کہیں سیالی دھوپ ہے

لاڈ پیار اس کے ہی ساتھ
اپنی سالی دھوپ ہے

چھاتو ہے آدھی میں، ظفر
نصف پیالی دھوپ ہے

-☆-

دوبارہ اس زمیں پہ پانو دھرنا چاہتا ہوں
میں شاید اس کے ہونے سے مُکرنا چاہتا ہوں

مرے اندر سے جاتی ہے ہوا رستے بناتی
میں خود بھی آج ان میں سے گزرنا چاہتا ہوں

مجھے اچھی نہیں لگتی ہے یکسوئی کسی طور
ستاروں کی طرح میں بھی بکھرنا چاہتا ہوں

وہ خواب خاک ہو یا خاک ہو اس دشت و در کی
میں خالی ہو چکا ہوں، اور، بھرنا چاہتا ہوں

مرا پیمانہ ہے سطحِ سمندر تک بلندی
میں اب اس سطح سے نیچے اُترنا چاہتا ہوں

سفر طے کر چکا ہوں اپنے اندر کا بہت میں
کسی لمحے، کسی صورت ٹھہرنا چاہتا ہوں

میں اپنی زندگی تو جی نہیں پایا ہوں اب تک
اجازت ہو تو اپنی موت مرنا چاہتا ہوں

مرے اندر ہے وحشت حُسن کی اس بار ایسی
نڈر ہو کر بھی میں اب اُس سے ڈرنا چاہتا ہوں

تفکّر چھوڑ رکھا ہے، ظفر، مدّت سے میں نے
سو، اب فارغ ہوں، کوئی کام کرنا چاہتا ہوں

☆

خون میں خواب ہمارے تیرے
یہ فسادات ہیں سارے تیرے

دل کی بے رنگ فضا میں دن بھر
اُڑتے رہتے ہیں غبارے تیرے

میرے تاریک فلک پر کس رات
جھلملائیں گے ستارے تیرے

یاد رکھتا ہوں ارادہ اپنا
بھول جاتا ہوں اشارے تیرے

کیا بیابان ہوا تھا جس میں
راستے ہم نے گزارے تیرے

کبھی واجب تھے ہمیں پر دراصل
ہم نے جو قرض اُتارے تیرے

بدگمانی ہوئی پانی سے ذرا
اور، الگ ہو گئے دھارے تیرے

ڈوبنا ہے یہیں آ کر اک دن
چوم لیتا ہوں کنارے تیرے

وہی پکڑا گیا، جلسے میں، ظفر
جو لگاتا رہا نعرے تیرے

☆

پھنسا ہُوا ہُوں دلدّر میں
صبح و شام کے چکر میں

ریشم لوہے کا نکلا
نرمی سی ہے پتھر میں

شور ہے باہر باہر تک
چور ہے میرے اندر میں

شکر کیجیے، مَیں اس بار
شامل نہیں کچھ مر میں

کب سے دبکا بیٹھا ہُوں
اپنے ٹوٹے ہُوئے پر میں

ہو سکتی ہے سیرِ فلک
بیٹھے بیٹھے ہی گھر میں

لیتے نہیں حساب کتاب
پڑا ہُوں عرصۂ محشر میں

دوڑ ہے کیسی لگی ہُوئی
سیّارہ ہے برابر میں

یہ بھی ادا اُس کی ہے، ظفر
خوف ہے اندر باہر میں

-☆-

مجھے ہی گھورتا رہتا ہے، تھکنے والا ہے
نہ سانپ کوئی پلک ہی جھپکنے والا ہے

اسی ہوا سے بکھرنے کو ہے یہ ابرِ خزاں
وہ ماہِ سبز دوبارہ دمکنے والا ہے

گھٹا میں کوندنے والی ہے نرم خُو بجلی
یہ آشیاں کسی لمحے چمکنے والا ہے

جو پھول باغ میں بے چین ہے دھڑکنے کو
تو میرے سینے میں دل بھی مہکنے والا ہے

لرز رہے ہیں ستارے جو میری آنکھوں میں
تو آسمان سے آنسو ٹپکنے والا ہے

کسی کو بھی کوئی پھر یاد رکھ نہیں سکتا
یہ دل مجھے بھی اگر بھول سکنے والا ہے

وہاں کسی کو بھلا کیا ہو ملکیت کہ جہاں
کسی کی چیز کوئی اور اُچکنے والا ہے

یہ ایک پل کی چکاچوند بھی بہت ہو گی
چراغ بجھنے سے پہلے بھڑکنے والا ہے

کہانی کس نے سُنائی ہے دن کے وقت، ظفر
جو راستے سے مسافر بھٹکنے والا ہے

-☆-

ہوتا رہتا ہے خود ہمارا کام
ورنہ یہ بھی نہیں تمہارا کام

اندر اندر دھکتا رہتا ہے
ہو نہ یہ بھی کوئی ستارہ کام

آسماں تک نہیں پہنچ سکتے
ہے زمیں کا ہی یہ کنارہ کام

کیا کرتے تھے جو فلک پہ کبھی
ہے یہاں بھی وہی دوبارہ کام

ہاتھ میں تھا جو ثابت و سالم
ہو گیا گر کے پارہ پارہ کام

سانپ مرضی سے اپنی نکلے گا
کھول بیٹھے ہیں کیا پٹارا کام

دل ہے بے کار ایک مدت سے
ڈھونڈتا پھرتا ہے بیچارہ کام

یوں تو اپنے نکال سکتا ہے
آپ کا ایک ہی اشارہ کام

ہوتے ہیں کام اسی طرح سے ظفر
کام کے بیچ سے گزارا کام

-☆-



آنکھوں پار ستارہ تھا
کیا دلدار ستارہ تھا

پیلا پیلا لگا مجھے
کچھ بیمار ستارہ تھا

کسی گرد سے اٹھا ہوا
ایک غبار ستارہ تھا

نور کی بارش تھی کوئی
دھاروں دھار ستارہ تھا

آگے آگے تھا سب سے
خوش رفتار ستارہ تھا

پھلجھڑیاں سی چھوٹی تھیں
کوئی انار ستارہ تھا

رستا بھول گئے ہم ہی
اپنا یار ستارہ تھا

ڈوب گیا یا ٹوٹ گرا
ایسا پیار ستارہ تھا

چمکا نہیں ظفر کچھ بھی
کیا بے کار ستارہ تھا

-☆-

اپنی صورت بدل رہی ہے آگ
بجھ گئی ہے کہ جل رہی ہے آگ

ابھی کچھ بھی پتا نہیں چلتا
کس طرف سے نکل رہی ہے آگ

کبھی نکلے گی دل سے باہر بھی
ابھی اندر ہی پل رہی ہے آگ

رُک گئی ہے ہر اک طرف کی ہوا
در دریچوں میں چل رہی ہے آگ

اور ہی طرح اُٹھ رہا ہے دُھواں
نئی شکلوں میں ڈھل رہی ہے آگ

بن رہے ہیں عجیب انگارے
کیا خزانے اُگل رہی ہے آگ

لگ رہی ہے گُلوں میں شاخ بہ شاخ
روشوں پر ٹہل رہی ہے آگ

ہیں کنارے نہ کوئی حد اس کی
شعلہ شعلہ اُچھل رہی ہے آگ

وہ تو خود کو سنبھالتی تھی ، ظفر
میں یہ سمجھا کہ ٹل رہی ہے آگ

☆

ہوا کے آگے بھی ہوا
اُوپر نیچے بھی ہوا

نیند کے اندر ہی نہیں
خواب کنارے بھی ہوا

بھرا ہُوا ہے باغ بھی
رستے رستے بھی ہوا

کہیں اُڑا کر لے گئی
پیڑ اور پتے بھی ہوا

مسجد میں بھی وُہی ہے
اور ، بُت خانے بھی ہوا

چلے تو پھر رُکتی نہیں
پاس ہمارے بھی ہوا

میرے بعد بھی رہے گی
مجھ سے پہلے بھی ہوا

بات سی کوئی کہہ گئی
چلتے چلتے بھی ہوا

اُٹھتے بیٹھتے بھی ، ظفر
آتے جاتے بھی ہوا

☆

نامعلوم ہوائیں
اور ، موہوم ہوائیں

کہاں سے آئی ہیں یہ
بے مفہوم ہوائیں

زہر بھرے بادل ہیں
اور ، مسموم ہوائیں

یاد بہت آتی ہیں
وہ مرحوم ہوائیں

بِس کے چرچے پانی
بِس کی دھوم ہوائیں

آئی ہیں شاید اُس کا
ماتھا چوم ہوائیں

آئی ہوئی کہیں سے
کچھ معدوم ہوائیں

کہاں رُکی ہیں جا کر
وہ مظلوم ہوائیں

خوب چلائیں ظفر نے
یہ منظوم ہوائیں

☆☆☆

اپنے اوپر پڑی ہے
مٹی سب سے بڑی ہے

مٹی ہی نے بٹھا دیا
اور کیا خوش کھڑی ہے

مٹی ہی اس دوڑ میں
سب سے آگے بڑھی ہے

وقفے وقفے بعد یہ
دیواروں سے جھڑی ہے

چڑھے تھے ہم اس پر کبھی
اب یہ ہم پر چڑھی ہے

سلسلے ہیں سب اسی کے
کڑی کے اوپر کڑی ہے

کھاتی ہے کیا کیا اُبال
کیسی باسی کڑھی ہے

مٹی ہی کا وقت ، اور
مٹی ہی کی گھڑی ہے

مٹی ہی اس نے ، ظفر
اپنے ماتھے مڑھی ہے

☆☆☆

بادل بن کر چھایا موسم
چلی ہوا ، اور ، بدلا موسم

میلی میلی آبادی پر
کیسا اُجلا اُجلا موسم

اپنا جینا ، اپنا مرنا
اپنی مٹی ، اپنا موسم

روشنیوں کے ساتھ اندھیرا
کالی رات اور گورا موسم

آپس میں کچھ بھی نہیں لگتے
بُری بات اور اچھا موسم

مِل جُل کر ہی رہ سکتے ہیں
میرا اور تُمھارا موسم

سب کچھ ساتھ بدل دیتا ہے
کبھی کبھار بدلتا موسم

اسی اُمید پہ زندہ ہیں سب
آئے گا کبھی اچھا موسم

وہی ، ظفر ، دن ہیں اور راتیں
کیسی موج اور کیسا موسم

-☆-

کہاں ہے اپنا دانہ پانی
کیوں نایاب ہے میٹھا پانی

چھپا ہُوا ہے تُمھارا دریا
اُترا ہُوا ہے اپنا پانی

اس سے بڑی نعمت کیا ہوگی
صاف ہوا ، اور ، تازہ پانی

انگڑائی لیتی ہے مٹی
دُور ہے لہریں لیتا پانی

بہت دیر سے رُکا ہُوا ہوں
دیکھ رہا ہوں چلتا پانی

کس نے کھائی ہماری روٹی
کس نے پیا ہمارا پانی

کون سی وہ گندی مچھلی تھی
کر گئی گندہ سارا پانی

چائے ہمیں پینی نہیں آتی
ہمیں دیجیے سادہ پانی

اور ، یہاں بے کار ظفر نے
کیا ہے اپنا پتّہ پانی

-☆-

دروازہ کھولا پانی میں
خواب کوئی گھولا پانی میں

لہریں تھیں چالاک نہر کی
ڈوب گیا بھولا پانی میں

اکثر ہی پیتے ہیں ملا کر
ہم کوکا کولا پانی میں

کمرے کمرے میں اپنے آپ ہی
جانے کیوں ڈولا پانی میں

ٹراتا ہے رات رات بھر
مینڈک بڑبولا پانی میں

میری سمجھ میں ہی نہیں آیا
اُڑا کوئی شعلہ پانی میں

کوئی نہیں تھا دور دور تک
پانی ہی بولا پانی میں

جل پری تھی بس ایک اکیلی
عمر تھی سولہ پانی میں

میرے، ظفر، نزدیک سے گزرا
پانی کا گولا پانی میں

☆

روشنی ہے سارے پانی میں
تیرتے ہیں تارے پانی میں

سوچ رہا ہوں ڈوبوں جا کر
میٹھے یا کھارے پانی میں

چھوڑ رکھی ہے میں نے کوئی
بات اپنے بارے پانی میں

خودکشیاں کرتی ہے خلقت
جا کر بے چارے پانی میں

کسی اور پانی کے آ کر
ملتے ہیں دھارے پانی میں

آگ سی ایک لگا دیتے ہیں
بہتے گل پارے پانی میں

پانی سے نکلو تو دیکھو
ہیں کیا نظارے پانی میں

کچھ آرام تو کر لیتے ہیں
لوگ تھکے ہارے پانی میں

گہرائی تھی، ظفر، کچھ اتنی
ڈوبے سیارے پانی میں

☆

خاک سے جو خدا کے رشتے ہیں
اور ہی انتہا کے رشتے ہیں

ہیں کہیں تکمۂ طلب کے جوڑ
کہیں بندِ قبا کے رشتے ہیں

ایک دھاگا الگ بھی ہے ان سے
جو خطا و سزا کے رشتے ہیں

حد جہاں پہ ہے آسمانوں کی
اُس سے آگے خلا کے رشتے ہیں

کہیں شام و شفق ہیں پیوستہ
کہیں صبح و صبا کے رشتے ہیں

گتھیاں کھول کر اگر دیکھو
سارے حمد و ثنا کے رشتے ہیں

کہکشائیں جو ہیں بگولا سی
ان کے اندر ہوا کے رشتے ہیں

ہے بندھی کائنات آپس میں
اور، یہ رشتے بلا کے رشتے ہیں

دونوں دُنیاؤں میں اگر ہیں، ظفر
صرف صوت و صدا کے رشتے ہیں

-☆-

چلتی ہے زمین یا کھڑی ہے
میرے تو دماغ سے بڑی ہے

اس بار سفر طویل ہے کچھ
دُنیا کہیں راہ میں پڑی ہے

محدود ہے کائنات اتنی
یُوں سمجھو یہ میری کوٹھڑی ہے

کچھ دُور سے دیکھ اس زمیں کو
پتھر سا خلاؤں میں جڑی ہے

ہے اور بھی انتظام کوئی
تاروں سے بھی روشنی جھڑی ہے

یہ لمحہ نہیں ہے سوچنے کا
یہ تو کوئی اور ہی گھڑی ہے

آنکھوں کا شکریہ ادا کر
تارے ہیں کہ نُور کی لڑی ہے

کچھ کچھ تو یہ شرابِ ہستی
اللہ کے سر کو بھی چڑھی ہے

عرفان ہُوا ہے جو ظفر جی
یہ بھی کوئی آپ کی تڑی ہے

-☆-

رہ سکتے نہیں اپنے کناروں میں ستارے
گڈمڈ ہوئے اس طرح ستاروں میں ستارے

لگتا ہے کہ آئے ہیں کسی اور فلک سے
ملتے ہی نہیں، دیکھیے، ساروں میں ستارے

ہوں گے جو رواں رات کے تاریک مسافر
دیکھیں گے پڑے راہگزاروں میں ستارے

بے وجہ نہیں ہے یہ لرزنا، یہ دمکنا
کہتے ہیں کوئی بات اشاروں میں ستارے

آ سکتے نہیں اُس عدم آباد سے واپس
ہر رات اُترتے ہوئے غاروں میں ستارے

رفتار الگ اِن کی، روانی بھی جُدا ہے
بہتے ہیں کہیں اپنے ہی دھاروں میں ستارے

سہتے ہیں سدا بچھڑے ہوئے ساتھیوں کا غم
رہتے ہیں کہیں دور دیاروں میں ستارے

ترتیب سے ہٹ کر کوئی جُھرمٹ ہے، کوئی جھنڈ
اور، اس کے علاوہ ہیں قطاروں میں ستارے

ہوتے ہیں خلاؤں کے، ظفر، اپنے ہی موسم
پھولوں کے بجائے ہیں بہاروں میں ستارے

☆

زمیں پہ چاند اُتارا ہے، آؤ دیکھو تو
بڑا عجیب نظارا ہے، آؤ دیکھو تو

زوالِ مہر سے پہلے ہوئے زوال پذیر
یہی کمال ہمارا ہے، آؤ دیکھو تو

نکلتی جا رہی ہے کائنات ہاتھوں سے
سو، یہ بھی ایک اشارہ ہے، آؤ دیکھو تو

تمھیں یقیں ہی نہیں آ رہا تھا جس پہ کبھی
وہی کرشمہ دوبارہ ہے، آؤ دیکھو تو

ابھی ابھی جو ستارہ یہاں سے ٹوٹا تھا
وہیں پہ ایک ستارہ ہے، آؤ دیکھو تو

ہے کائنات میں اتنی بساط سورج کی
کہ یہ بھی ایک شرارہ ہے آؤ دیکھو تو

یہاں سے دیکھتے ہیں منظرِ زمین و زماں
مری نگاہ میں سارا ہے، آؤ دیکھو تو

یہیں سے دوسرا ہوتا ہے آسمان شروع
یہ آسماں کا کنارہ ہے، آؤ دیکھو تو

چلا ہوا ہے جو یہ کاروبارِ خواب، ظفر
یہ نفع ہے کہ خسارہ ہے، آؤ دیکھو تو

☆

یہ زمیں گردش میں ہے یا آسماں گردش میں ہے
لگ رہا ہے جس طرح سارا جہاں گردش میں ہے

رات دن چکر میں ہے سب کچھ بھنور اندر بھنور
مچھلیوں کے ساتھ ساتھ آبِ رواں گردش میں ہے

دائرہ در دائرہ زورِ ہوا ہے چار سُو
کیا کرے کشتی کہ سارا بادباں گردش میں ہے

کچھ نہیں جیسے کسی کی بھی سمجھ میں آ رہا
گفتگو بھی کر رہے ہیں، اور، زباں گردش میں ہے

گھومتی ہے کیا کہانی اپنے کرداروں کے گرد
چل رہی ہے، اور، ساری داستاں گردش میں ہے

رُکتا جاتا ہے یہ دل، اور، سُن ہُوا جاتا دماغ
اور، لہو شاید رگوں کا رایگاں گردش میں ہے

اتنے زور و شور سے خود رقص میں ہے کائنات
جسم پھرکی بن گیا ہے، اور، جاں گردش میں ہے

باری باری یہ مناظر ایک ہی لے پہ ہیں سب
ایک پہلے، دوسرا پھر بعدازاں گردش میں ہے

چل رہا تھا، اے ظفر، کارِ دلِ رُسوا، مگر
مرے، قسمت کا ستارہ ناگہاں گردش میں ہے

☆

چلتا ہُوا رُکے ہُوئے پانی میں آسماں
کیسا رواں ہے اپنی روانی میں آسماں

اس پر نہیں گزرتے ہُوئے وقت کا اثر
ایسا ہی تھا یہ اپنی جوانی میں آسماں

اس نے سروں پہ ٹوٹ کے گرنا ہے ایک دن
آیا جو ایک بار گرانی میں آسماں

پتوں کی طرح جھڑتے ہیں تارے تمام رات
ٹھہرے گا کیا ہوائے خزانی میں آسماں

آواز دے رہے ہیں ستارے کہیں مجھے
جھلکا ہے میری ہستیِ فانی میں آسماں

ہے اک خلا کے بعد کوئی دُوسرا خلا
رہتا ہے روز نقل مکانی میں آسماں

شکلیں بدلتا رہتا ہے رنگت کے ساتھ ساتھ
ہوتا ہے روز اور کہانی میں آسماں

کیسا مزہ ہو، کوئی جھٹک دے اسے اگر
اٹکا ہُوا یہ زُلفِ زمانی میں آسماں

الفاظ کھینچتے ہیں زمیں کی طرف، ظفر
اور پھیلتا ہے موجِ معانی میں آسماں

☆

کوئی گڑبڑ کریں گے جل کر زمین و آسماں
شور کرتے ہیں مرے اندر زمین و آسماں

رات آتی ہے تو ہو جاتے ہیں کیا شیر و شکر
اجنبی رہتے ہیں جو دن بھر زمین و آسماں

پاس سے اکثر گزر جاتی رہی یہ کائنات
اور پیچھے رہ گئے اکثر زمین و آسماں

ہے زمین و آسماں پر اک خلا چھایا ہُوا
اور، ہیں چھائے ہُوئے اس پر زمین و آسماں

ہے زمین و آسماں نے سب کو چکرایا ہُوا
اور، ہیں خود بھی کوئی چکر زمین و آسماں

رُک گئی تھی چلتے چلتے خواب کے اندر زمیں
چل رہے تھے خواب سے باہر زمین و آسماں

باغ باغیچے ہی اُگتے ہیں نہ اب تاروں کے کھیت
رفتہ رفتہ ہو گئے بنجر زمین و آسماں

کس طرف جاتے ہیں اتنی تیز رفتاری کے ساتھ
اور، کہاں سے آئے ہیں یہ سرزمین و آسماں

کس قیامت کی لڑائی لڑ کے آئے تھے، ظفر
لگ رہے تھے کیوں لہو سے تر زمین و آسماں

-☆-

آزما بیٹھے ہنر سارے زمین و آسماں
کیا خبر جیتے ہیں یا ہارے زمین و آسماں

ظلم جو مجھ پر ہُوئے اس باب میں خاموش تھے
بولتے کیا شرم کے مارے زمین و آسماں

چیز کیا نکلی ہے یہ، اور، ہم اِسے سمجھے تھے کیا
سوچتے ہوں گے مرے بارے زمین و آسماں

کس قدر بکھرے ہُوئے ہیں، اور، کتنے آس پاس
چاند، سُورج، کہکشاں، تارے، زمین و آسماں

کوئی سودا بیچتے پھرتے ہیں جیسے رات دن
ان خلاؤں میں یہ بنجارے زمین و آسماں

تنگ بھی آ جائیں تو جائیں کہاں، مجبور ہیں
طے شدہ رستے پہ بے چارے زمین و آسماں

راکھ سی اُڑتی ہے ان کے ہر طرف، کیوں اور کہاں
چھوڑ آئے اپنے انگارے زمین و آسماں

خُود ہے اِن کی گُتھگی و خشکی سے باخبر
اور، بنا سکتا ہے دوبارے زمین و آسماں

دیکھ لینا، رُک بھی سکتے ہیں کسی لمحے، ظفر
چلتے چلتے یہ تھکے ہارے زمین و آسماں

-☆-

آپ رہ جائیں گے بیش و کم زمین و آسماں
ہوں گے جس دن درہم و برہم زمین و آسماں

صاف آتے ہیں نظر، لیکن مجھ سے دُور ہیں
اتنے واضح، اس قدر مدھم زمین و آسماں

اک چھناکا، اور، ہو جائے گی ہر شے چُور چُور
یعنی ٹکرا جائیں گے جس دم زمین و آسماں

سردیوں میں گرمیاں ہوں گی، بہاروں میں خزاں
اس طرح بدلیں گے ہر موسم زمین و آسماں

دیکھتے تھے، اور، ترستے تھے کہ مل سکتے کبھی
دُور تھے اک دُوسرے سے ہم زمین و آسماں

جس طرح اک دُوسرے سے کوئی ہمدردی نہ ہو
کھا رہے ہیں اپنا اپنا غم زمین و آسماں

آ رہی ہے اور ہی کوئی صدا ان کی طرف
سُن رہے ہیں اور ہی سرگم زمین و آسماں

پھر تو یہ نوبت بہرحال آ ہی جاتی تھی کبھی
چھپ کے ملتے جو رہے پیہم زمین و آسماں

حق تو یہ ہے، کچھ نئے لوگوں کے آنے سے، ظفر
ہو گئے ہیں اک نیا عالم زمین و آسماں

☆

پہلے ایسے تو نہ ہوتے تھے زمین و آسماں
آج میں نے غور سے دیکھے زمین و آسماں

میری نیچے کوئی گنجایش نہ اُوپر ہے کہیں
یہ بنائے ہیں عجب اُس نے زمین و آسماں

باندھ کر رکھا ہے دونوں کو بہم کس چیز سے
اور لٹکائے ہیں کس شے سے زمین و آسماں

جو یہاں میرے اشارے پر چلا کرتے فقط
چاہیے تو تھے مجھے ایسے زمین و آسماں

ہیں بہت اچھے، مگر، کوشش اگر کی جائے تو
ہو بھی سکتے ہیں مزید اچھے زمین و آسماں

کچھ پتا چلتا نہیں کیا کچھ یہاں موجود ہے
اس خلا میں اور ہیں کتنے زمین و آسماں

میں گزارہ کر رہا ہوں چار و ناچار ان کے ساتھ
تُو نے قائم کر دیے جیسے زمین و آسماں

میں نے سوچا تھا جسے وہ اور دُنیا ہے کوئی
اور ہیں شاید کہیں میرے زمین و آسماں

اس فضا کا اور ہی نقشہ کوئی ہوتا، ظفر
یہ اگر ہوتے کہیں اپنے زمین و آسماں

☆

گھومتے دیکھو گے متوالے ، زمین و آسماں
یہ خلا میں تیرنے والے زمین و آسماں

دیکھیے تو ہے اِنھی کے دم سے یہ سارا فساد
ہیں یہی آفت کے پرکالے زمین و آسماں

مَیں کہاں لایا گیا ہُوں ، کون سا منظر ہے یہ
ہیں مرے دیکھے نہ یہ بھالے زمین و آسماں

اپنی راہوں پر کسی ترکیب سے قائم ہیں یہ
ڈگمگا سکتے نہیں حالے زمین و آسماں

کس طرح اصلاح کا اپنی اُنھیں آئے خیال
دیکھ بیٹھے ہیں مرے چالے زمین و آسماں

کس طرح میری مسافت کے مقابل آئیں گے
ہیں یہ میرے پانو کے چھالے زمین و آسماں

مَیں نے تو کچھ اور مانگا تھا ، مگر ، وائے نصیب
اُس نے میرے سامنے ڈالے زمین و آسماں

جانتا ہُوں جس قدر اوقات کے مالک ہیں یہ
میرے مُنہ آئیں گے کیا سالے زمین و آسماں

ایسے بے منزل سفر پر ہیں رواں کب سے ، ظفر
کائناتی ابر کے گالے زمین و آسماں

-☆-

ہیں حقیقت یا کہ افسانے زمین و آسماں
میرے جانے اور پہچانے زمین و آسماں

روزِ اوّل سے کسی سنگِ صدا کے منتظر
ہیں یہ ایسے آئنہ خانے زمین و آسماں

پیڑ پودے ہی رہیں گے اور نہ یہ شمس و قمر
ہونے ہی والے ہیں ویرانے زمین و آسماں

دُور کا رشتہ سہی کوئی ، مگر ، ہے تو سہی
میرے کچھ لگتے ہیں انجانے زمین و آسماں

میرے بس میں ہی نہیں اس طرح ان کو دیکھنا
جس طرح دیکھے ہیں دُنیا نے زمین و آسماں

ناپ سکتے ہیں اِنھی سے آپ ساری کائنات
اس طرح کے ہیں یہ پیمانے زمین و آسماں

اس قدر دُوری بھی ان کو دُور کر پائی نہیں
ایک دُوجے کے یہ دیوانے زمین و آسماں

مسئلہ ان کے لیے بھی بن گیا میری شناخت
دیر سے مَیں نے بھی پہچانے زمین و آسماں

یہ تعلّق بھی ہے اور ترکِ تعلّق بھی ، ظفر
میرے اپنے ہیں نہ بیگانے زمین و آسماں

-☆-

کب ہوئے تھے اتنے برفیلے زمین و آسماں
کیا ٹھٹھر کر پڑ گئے نیلے زمین و آسماں

دور ہیں، اک دوسرے کو چاہتے بھی ہیں بہت
مل نہیں سکتے ہیں شرمیلے زمین و آسماں

دور ہو سکتی بھی ہے یہ سست رفتاری کبھی
کس بھی سکتا ہے کوئی ڈھیلے زمین و آسماں

کچھ بُرے وقتوں کی خاطر یہ بچا سکتے نہیں
ہو گئے ہیں جتنے خرچیلے زمین و آسماں

کس لیے خاک و خلا میں اب وہ ہریالی نہیں
کس خزاں نے کر دیے پیلے زمین و آسماں

وقت پر ہوتے تھے سارے کام اپنے بھی یہاں
جب ہُوا کرتے تھے پھرتیلے زمین و آسماں

ایسی حالت ہی نہ ہوتی اہلِ دنیا کی، اگر
مشورہ کرتے کسی چیلے زمین و آسماں

مَیں تو حتی الوسع ان سے دور ہی رہتا ہوں اب
ہو چکے ہیں اتنے زہریلے زمین و آسماں

کون سی شبنم تھی جس نے شام ہوتے ہی، ظفر
کر دیے تھے ایک دم گیلے زمین و آسماں

☆☆

لے کے آئے تھے کوئی اُلجھن زمین و آسماں
رفتہ رفتہ ہو گئے دشمن زمین و آسماں

بند موسم میں تر و تازہ ہوا کے واسطے
ہر طرف رکھتے ہُوئے روزن زمین و آسماں

ظاہراً آزاد لگتے ہیں، مگر، دراصل ہیں
ایک دوجے کے لیے بندھن زمین و آسماں

کل خرابوں میں انھیں تبدیل ہونا ہے کہیں
ہیں جو اب کِھلتے ہُوئے گلشن زمین و آسماں

دائمی تنہائی ہے ان کا مقدر بھی، مگر
اس قدر رہتے ہیں کیوں بدظن زمین و آسماں

چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتا ہوں مَیں ان کو کہ ہیں
وقفے وقفے سے مرا مسکن زمین و آسماں

ہے انہی سے کھیل کود اس کی بھی ہر صورت کہ ہیں
طفلِ دل کے واسطے آنگن زمین و آسماں

وہ بھی کاٹوں گا یہاں جو مَیں نے بویا ہی نہیں
سوچیے تو ہیں مرا خرمن زمین و آسماں

اتنی تابانی کہاں سے آئی ہے ورنہ، ظفر
ایسے پہلے تو نہ تھے روشن زمین و آسماں

☆☆

پانو رکھے سر پہ اور بھاگے زمین و آسماں
پیچھے پیچھے کہکشاں ، آگے زمین و آسماں

کٹ گئے ہیں، اور، کٹ کر ایک سے دو ہو گئے
بٹ گئے ہیں آن کر واںگے زمین و آسماں

کیا بتائیں کیا خیالی سی نئی دُنیا تھی وہ
ہم نے خود جس کے لیے تیاگے زمین و آسماں

کاتناتوں اور خدا کے درمیاں رشتہ ہُوں مَیں
اور ایسے ہی مرے دھاگے زمین و آسماں

رات ہو یا دن ، الاپیں راگنی بے وقت کی
اس طرح کے ہیں یہ کھٹ راگے زمین و آسماں

مَیں جہاں بھی تھا بھٹکتے سے مجھے پڑتے رہے
اور تھے کوئی ، مجھے لاگے زمین و آسماں

سامنے سب کے زمانے کی منڈیروں سے کہیں
ایک دن اُڑ جائیں گے کاگے زمین و آسماں

وہ مِلا پھر بھی نہ اطراف و جوانب میں کہیں
جس کی خاطر آپ نے جھاگے زمین و آسماں

دُور سے آنے لگیں چڑیوں کی چہکاریں ، ظفر
پو پھٹی اور نیند سے جاگے زمین و آسماں
-☆-

مَیں بھی ایسے ہی بجھ بیٹھا زمین و آسماں
جیسے جلاتی تھی یہ دُنیا زمین و آسماں

اتنی رونق ، اور ، اتنا شور و شیون ہے ، مگر
لگ رہے ہیں اس قدر تنہا زمین و آسماں

کچھ نہ کچھ تو ہو گی ان کی اپنی ہستی بھی کہیں
آدمِ خاکی سے ہیں زندہ زمین و آسماں

بھینچ کر نابود کر دے گی وہی آواز انھیں
جس دھماکے سے ہُوئے پیدا زمین و آسماں

اپنے ٹکڑے جوڑتا جاؤں گا جس دوران مَیں
ٹوٹ سکتے ہیں اُسی اثنا زمین و آسماں

مِل چکی ہے کچھ مجھے ان کے ارادوں کی خبر
جانتے ہیں مُدّعا میرا زمین و آسماں

کچھ اُمیدیں اُن سے میری بھی ہیں وابستہ ابھی
رکھتے ہیں مجھ پر بھی کچھ دعویٰ زمین و آسماں

ان کے نرغے میں تو مَیں آیا ہُوا ہُوں دیر سے
ہاتھ کچھ رکھیں اگر ہلکا زمین و آسماں

دانہء گندم میں یہ کیسا کرشمہ تھا ، ظفر
جس سے ہو کر رہ گئے رُسوا زمین و آسماں
-☆-

سربسر مشکل تھے ہر عنواں زمین و آسماں
میں یہ سمجھا تھا کہ ہیں آساں زمین و آسماں

میں نے پہلی بار انھیں دیکھا تو ششدر رہ گیا
مل کے مجھ سے بھی ہوئے حیراں زمین و آسماں

پھر ہی پہنایا گیا دونوں کو ملبوسِ غبار
مدتوں پھرتے رہے عریاں زمین و آسماں

کون سی وہ رہزنی برپا ہوئی تھی، جس کے بعد
آج تک ہیں بے سر و ساماں زمین و آسماں

جس قدر بنتا ہے جس کا، آئے اور کر لے حساب
چند ہی قرنوں کے ہیں مہماں زمین و آسماں

اشرف المخلوق ہونے کا مزہ تب تھا، اگر
ہوتے اپنی شان کے شایاں زمین و آسماں

ہے فقط اُن کی مجھے گھیرے میں لینے کی کسر
پھر نکالیں گے کبھی ارماں زمین و آسماں

چھا چکی ہے اک عجب بے رونقی سی ہر طرف
کہکشاں برباد ہے، ویراں زمین و آسماں

میں تو ہوں شاید کہ مشتِ خاک سے بھی کم، ظفر
ہوں گے البتہ مرا امکاں زمین و آسماں

☆

خاک پر تو بلا تماشا ہے
یہ خلا کون سا تماشا ہے

ابھی پہلے ہی سے نہیں فارغ
یہ کوئی دوسرا تماشا ہے

کھیلتے اور دیکھتے ہی رہے
سوچ چُکی، صدا تماشا ہے

سُرخ تصویر ہے ستارے کی
اور، اُس میں ہرا تماشا ہے

اس پہ اب سوچ کر قدم رکھنا
یہ عجب راستا تماشا ہے

حیرتِ حُسن ہے خلا بہ خلا
بے فضا، بے ہوا تماشا ہے

کل کوئی اور دیکھنا منظر
یہ فقط آج کا تماشا ہے

اس زمیں کے مدار سے تو نکل
سُو بسُو، جابجا تماشا ہے

آسماں ہے کرشمہ اور، ظفر
یہ زمیں اک جدا تماشا ہے

☆

جس قدر غور کر رہا ہوں میں
خود سے اُتنا ہی ڈر رہا ہوں میں

یہ زمیں کتنی خوب صورت ہے
مجھے لگتا ہے مر رہا ہوں میں

چاندنی مجھ سے خوش نہ ہوگی کیوں
چاند کا کام کر رہا ہوں میں

کہکشاں تھی مرے لہو میں بھی
خود سے کیا بے خبر رہا ہوں میں

جیسے اِس کائنات کے مانند
ہر طرف کو بکھر رہا ہوں میں

کسی پانی میں ہو رہا ہوں غروب
یا اُفق سے اُبھر رہا ہوں میں

کھینچتی جا رہی ہے مجھ کو زمیں
آسماں سے اُتر رہا ہوں میں

ایک ہی وقت میں کسی جانب
چل رہا ہوں، ٹھہر رہا ہوں میں

میرے اندر کی طرح کا ہے، ظفر
جس خلا سے گزر رہا ہوں میں

☆

پہنچے ہیں اِن حالوں میں
کتنے نُوری سالوں میں

صِرف خلا کا امرت ہے
آسمان کے پیالے میں

کتنے بڑے اندھیرے ہیں
اِن بے انت اُجالوں میں

کتنے اُڑتے سیارے
پھنسے خلا کے جالوں میں

آئی ہے معصوم زمین
آسمان کی چالوں میں

ساری، پُوری کائنات
آتی نہیں خیالوں میں

سُورجوں اور ستاروں کو
کیا ہے بند مقالوں میں

کائنات کا کوئی شمار
کرتا پری جمالوں میں

بیٹھا ہے خاموش، ظفر
ڈوبا ہوا سوالوں میں

☆

جس قدر ہیں رواں کہکشائیں
جا رکیں گی کہاں کہکشائیں

کیا عجوبے ہیں ناقابلِ فہم
یہ زمیں ، آسماں ، کہکشائیں

کتنے موسم بسر کر چکی ہیں
ساری بوڑھی ، جواں کہکشائیں

دور تر ہوتی جاتی ہیں سب سے
کارواں کارواں کہکشائیں

کس طرف بھاگتی جا رہی ہیں
یہ کراں تا کراں کہکشائیں

ایک دن واپس آ جائیں گی سب
آشیاں آشیاں کہکشائیں

کیا مسلسل اُڑی جا رہی ہیں
لامکاں لازماں کہکشائیں

اور منزل نہیں کوئی ان کی
یہ بہت بے اماں کہکشائیں

غم کھڑا ہے ظفر حیرتوں میں
بھاگتی ہیں جہاں کہکشائیں

-☆-

کچھ اضافہ ہے کچھ کمی بھی ہے
دوستی بھی ہے ، دشمنی بھی ہے

ہر ستارہ ، ہر ایک سیارہ
ہم سفر بھی ہے ، اجنبی بھی ہے

ایک بکھراؤ بھی ہے چاروں طرف
اور ہر شے نپی تلی بھی ہے

یہ ستاروں کی راکھ ہے شاید
کوئی تو شے جلی بجھی بھی ہے

رنگ سا ہے کبھی کبھی جیسا
اور ، ہر چیز ابھی ابھی بھی ہے

گرچہ بنیاد ہے بہت مضبوط
ہر جگہ کوئی کچی بھی ہے

برق نے بھسم بھی کیا سب کچھ
شاخِ دنیا ابھی ہری بھی ہے

ہیں کچھ ایسے ہی کائنات کے رنگ
اُجڑی اُجڑی ، بنی بنی بھی ہے

ہونے والا بھی کچھ نہ کچھ ہے ، ظفر
محض ہستی رکی رکی بھی ہے

-☆-

یہ جو چاند ستارے ہیں
میرے ہیں کہ تمھارے ہیں

کہکشائیں ہیں یا ہر سُو
اُڑتے ہوئے غبارے ہیں

کس نے انھیں بنایا تھا
یہ کس کے شہ پارے ہیں

کہیں چُھپایا ہے اُوپر
نیچے کہیں اُتارے ہیں

اِتنا تیز سفر کرتے
روشنیوں کے دھارے ہیں

اُتنے اور بھی ہیں باقی
جتنے چاند گزارے ہیں

ٹم ٹم کرتے ہیں تارے
اور، سارے کے سارے ہیں

برساتیں ہیں رنگوں کی
روشنی کے فوارے ہیں

کائنات کیا ہے یہ، ظفر
اُس کے چند اشارے ہیں

-☆☆-

رواں دواں ہریالی ہے
یہاں وہاں ہریالی ہے

دل کو بھاتی ہے کیا کیا
راحتِ جاں ہریالی ہے

مجھے بھی لے جاتے نہیں کیوں
اتنی جہاں ہریالی ہے

پہلے شیشم کا شیشہ
بعدازاں ہریالی ہے

کوئی نقش بنتی سا
کوئی نشاں ہریالی ہے

کہیں بہار ہے پیلی زرد
کہیں خزاں ہریالی ہے

کاہکشائیں ہیں شاداب
کون و مکاں ہریالی ہے

پُھولوں اور ستاروں سے
کیسی عیاں ہریالی ہے

ہرے بھرے آنسو ہیں، ظفر
میری فغاں ہریالی ہے

-☆-

زمیں آسماں ہرے
ہیں جسم اور جاں ہرے

ہرے نہیں کیوں وہاں
جب ہیں سب، یہاں ہرے

پانی بھلا خلا کا
ہوئے کہکشاں ہرے

فطرت کے سب سخن
بیاں در بیاں ہرے

باغ بے طرح سبز
کھیت بے گماں ہرے

آئی خزاں میں نیند
خواب اب کہاں ہرے

پردے اُٹھے جس دم
سب جہاں تہاں ہرے

آبِ حیات پیا
بوڑھے اور جواں ہرے

ڈھونڈ رہا ہے ظفر
کہاں ہو جہاں ہرے

☆

کہکشاں بدن زرد
چاند کا چمن زرد

کہیں دہاڑا شیر
خوف سے ہے بن زرد

مہکی بدن بسنت
ہُوا پیرہن زرد

چمکا سانپ سرے
پڑا سبھی دھن زرد

سُورج ہے بیمار
ہُوئی ہے کرن زرد

کن اُداسیوں میں
پڑا ہے گگن زرد

پڑی ہے اُداسی
لگی ہے لگن زرد

مُرجھائی سی ہوا
پیا کا ملن زرد

کمی لہو کی تھی
رہا ظفر تن زرد

☆

جدھر چل پڑو گے اُدھر راستے ہیں
خلاؤں میں یہ کس قدر راستے ہیں

سفر ہے سبھی کو ہر اک لمحہ درپیش
نہیں کوئی منزل ، مگر ، راستے ہیں

کسی دن اُدھر سے گزر کر تو دیکھو
ستاروں سے باہر جدھر راستے ہیں

کبھی آؤ تو کہکشاں کی گلی میں
مکاں در مکاں ، در بدر راستے ہیں

پریشانیوں کا ہے پھر ذکر ہی کیا
اگر جانتے ہو کدھر راستے ہیں

پہاڑ اور جنگل بہت ہیں سفر میں
تو مشکل ہے کیسی ، اگر راستے ہیں

کوئی بندوبست اس طرح کا کیا ہے
کہ دریا بھی رہگزر راستے ہیں

زمیں کا تو ہے ذکر ہی کیا کہ اب تو
سرِ آسماں سر بسر راستے ہیں

رُکاوٹ ، ظفر ، نام کو بھی نہیں ہے
چلے گا جدھر کو بشر ، راستے ہیں

-☆-



کب سے آگے سُورج ہے
میرے آگے سُورج ہے

پیچھے پیچھے ہے یہ زمیں
آگے آگے سُورج ہے

اس کے پیچھے کچھ بھی نہیں
جس کے آگے سُورج ہے

دھوپ تو غائب ہے ساری
کیسے آگے سُورج ہے

آگ کا گولا سا ہے کیا
جیسے آگے سُورج ہے

مکر نہیں سکتا کوئی
وعدے آگے سُورج ہے

اسی طرح چلتے جاؤ
سیدھے آگے سُورج ہے

پیچھے چھوڑ اندھیرے کو
لے لے ، آگے سُورج ہے

میرے پیچھے خُود ہے ظفر
تیرے آگے سُورج ہے

-☆-

چاند کی طرح دمک سکتی ہے
تاریکی بھی چمک سکتی ہے

تاروں کی بارات بھی آخر
چلتے چلتے تھک سکتی ہے

کاہکشاں کی گاڑی اِک دن
رستے ہی میں اٹک سکتی ہے

اور، زمیں بھی اتنا پُرانا
اپنا بوجھ پٹک سکتی ہے

ایک جگہ پر جمی ہوئی بھی
کوئی چیز کھسک سکتی ہے

کاہکشاں بھی خلا کے اندر
بھاگتے ہوئے بھٹک سکتی ہے

تنگ آ کر اِن سیاروں کا
روشنی ہاتھ جھٹک سکتی ہے

کائنات پہیلی ہے جیسے
اسی طرح سے ونچک سکتی ہے

اور، ظفر، اِک روز اچانک
ساری بات کھچک سکتی ہے

☆

آگے چاند ستارہ
پیچھے چاند ستارہ

شام کے ماتھے اُوپر
چمکے چاند ستارہ

دُور کسی چوٹی سے
اُترے چاند ستارہ

نین مٹکت یُوں دمکے
جیسے چاند ستارہ

دل آنگن سے اُبھرا
کیسے چاند ستارہ

تاریکی میں محبت
ایسے چاند ستارہ

آسمان کے اندر
کانپے چاند ستارہ

اُن ہونٹوں پر دیکھے
میں نے چاند ستارہ

کیسا لگا ظفر کو
کیسے، چاند ستارہ

☆

جدھر ستارے جائیں
ہم بھی سارے جائیں

اس بے نام جدل میں
ہمی نہ مارے جائیں

جس کی قدرت ہے یہ
اُس کے وارے جائیں

شام سے پہلے پہلے
دھوپ کنارے جائیں

کہکشاؤں کے اندر
کبھی اشارے جائیں

خاک چڑھائی جا کے
چاند اُتارے جائیں

سودا نہیں بکے گا
یہ بنجارے جائیں

بند نہ کر دیں رستا
کُلتے چارے جائیں

یہی ، ظفر ، اچھا ہے
پاتو پیارے جائیں

-☆-



ناچ رہے ہیں دل میں تارے
ہیں کیسی جھلمل میں تارے

بولی بولیں بھانت بھانت کی
ہیں اپنی محفل میں تارے

بُجھے ہُوئے ماضی کے آ کر
چمکے مستقبل میں تارے

بلّی کے ڈر سے سارا دن
گھُسے ہُوئے تھے بل میں تارے

آنکھوں میں جب شام ہو گئی
چمکے اُس کے تل میں تارے

حرف ہُوئے ہیں کیسے روشن
تھے اُس کی پنسل میں تارے

کبھی اُدھر تھے کبھی اِس طرف
رہے حق و باطل میں تارے

بہت اندھیرے تھے وہ جیتو
رہے بڑی مُشکل میں تارے

کھینچ نکالے آج ظفر نے
پھنسے ہُوئے ساحل میں تارے

-☆-

صبح و شام حیرانی
اور ، مدام حیرانی

اُس کا ہنر صناعی
میرا کام حیرانی

در دیوار تحیّر
سقف و بام حیرانی

اِذنِ عام کے آگے
روک تھام حیرانی

کائنات کے اندر
خُوش خرام حیرانی

کوئی رات پریشاں
کوئی شام حیرانی

کوئی تفاوت نہیں ہے
خاص و عام حیرانی

قدم قدم پہ حسرت
گام گام حیرانی

ہرگز نہیں ظفر کو
طبع خام حیرانی

☆

اندر باہر شور ہے
اور ، برابر شور ہے

چُپ کے پیچھے خامشی
شور کے اُوپر شور ہے

وہیں مُجھے رکھا گیا
جہاں سراسر شور ہے

کرتا ہُوں مَیں ہی شروع
پھر ، سارا گھر شور ہے

دھواں دھار بھی ہے فضا
اس سے بڑھ کر شور ہے

چُپ لگتا ہے جو خلا
اُسی کے اندر شور ہے

سُنتا ہُوں تصویر کو
سارا منظر شور ہے

گھوم رہا ہے چار سُو
کیسا چکّر شور ہے

کائنات ہے وہ ، ظفر
اُس کا زیور شور ہے

☆

نیا پرانا دھواں ہے
دُنیا کیسا دُھواں ہے

نیچے آگ بھڑک رہی
اُوپر چڑھتا دُھواں ہے

کتنی دُھول ہے چار سُو
وسط میں کیا کیا دُھواں ہے

سانس بھی لے سکتے نہیں
ایسا گاڑھا دُھواں ہے

ہوا نہیں ہے کہیں بھی
گویا سارا دُھواں ہے

جلے ستاروں کا یہاں
کیوں کر اِتنا دُھواں ہے

خالی کیے ہیں پھیپھڑے
باہر پھینکا دُھواں ہے

پانی غائب ہے یہاں
دریا دریا دُھواں ہے

آسمان ہے یا ظفرؔ
سر پہ پھیلا دُھواں ہے

☆☆

شام ڈھلے جب آئی بارش
اپنے ساتھ جگائی بارش

بادل کی تھی اور ہی نیت
ہم نے خُود کروائی بارش

کیا کہیے کس طرح گزاری
کالی رات ، جُدائی ، بارش

ایسی اچانک آئی ، بھگو گئی
باہر پڑی رضائی بارش

پڑی مصیبت خُود ہی اُس کو
مانگ رہی تھی خُدائی بارش

ڈال گئی ہے جاتے جاتے
سب کے بیچ لڑائی بارش

گھر کے باہر ہی کیچے نے
کھڑے کھڑے برسائی بارش

کچھ بھی پکا نہیں تھا گھر میں
ہم نے اُس دن کھائی بارش

اور ، بڑے جتنوں سے ظفرؔ نے
آخر بند کرائی بارش

☆

غضب کرشمہ، عجب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں
لگا ہے کیسا غضب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

وہ شوخ بھی ہوگا سب میں شامل، کہیں چمکتا، کہیں مہکتا
کہ دیکھتے ہوں گے جب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

چلی تھیں پہلے تو کوچے کوچے میں ابرآلود سی ہوائیں
ہُوا ہے آغاز اب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

برستی بارش کے نرم قطرے جو گیسوؤں میں مچل رہے ہیں
اور، اُس پہ ہے رنگِ لب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

یہ صحن و در میں نہاتے چھینٹے اُڑاتے گاتے کھلنڈرے بچے
دکھا رہے ہیں طرب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

چھریرے بھیگے بدن پہ ہر دم پھسلتی بوندیں، مہکتی چولی
ہُوا تھا پہلے یہ کب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

کڑکتی بجلی کے ڈر سے یکلخت وہ جو مُجھ سے لرز کے لپٹے
ہُوا ہے بھرپُور تب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

ہزار بہہ جائے گھر کا سارا ہی ساز و سامان بارشوں میں
لگے یہی روز و شب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

برس رہا ہے، ظفر، چھماچھم چھت اور دالان پہ جو پانی
اسی کے دم سے ہے سب تماشا، فلک پہ بجلی، زمیں پہ باراں

☆

ہے بے آب سمندر
پُر ہے خواب سمندر

ایک سوال ستارہ
ایک جواب سمندر

کوئی کنایہ صحرا
کوئی کتاب سمندر

اِک گندی مچھلی سے
ہُوا خراب سمندر

سُوکھ چلا ہے پانی
ہے پایاب سمندر

چاند ابھی نہیں نکلا
ہے بے تاب سمندر

مَیں چھوٹی سی ندی
آپ جناب سمندر

اِک قطرہ دیدار
ایک حجاب سمندر

مست ظفر رہتا ہے
پی شراب سمندر

☆

انھیں پیچھے دریا
اُوپر نیچے دریا

میں دریا کے آگے
میرے پیچھے دریا

دائیں بائیں آبادی
بیچوں بیچ دریا

سُوکھ گئے ہیں آخر
کیسے کیسے دریا

میری راہ میں آئے
کیسے ، کتنے دریا

پُوچھے حال ہمارا
آتے جاتے دریا

رُخ جو موڑ سکے گا
سارے اُس کے دریا

کوئی وقت صحرا ہے
کوئی زمانے دریا

رُکے ظفرؔ نے دیکھے
چلنے والے دریا

-☆-

گورا دن اور کالی ریت
اپنی دیکھی بھالی ریت

پانی سُوکھا دریا کا
اور ، رہ گئی خالی ریت

جھکّڑ تھا سر سے اُونچا
مُشکل ہی سے ٹالی ریت

اُس کے لیے سنبھالا پانی
اپنے لیے بچا لی ریت

پانو میں اُس کے بچھوائی
اپنے سر پر ڈالی ریت

اب کے پڑا عجیب سفر
نیا تھا دشت ، نرالی ریت

یہی ہماری وحشت ہے
جا کر وہاں اُڑا لی ریت

رنگ اس کا پانی جیسا
پانیوں کی ہے پالی ریت

یہی ہُنر اپنا ہے ، ظفرؔ
ڈالے خواب ، نکالی ریت

-☆-

ایسے اُڑے ہمارے ذرّے
دیکھتے رہے تُمھارے ذرّے

ایک نہیں ہو سکتے ہیں اب
بکھرے ہُوئے یہ سارے ذرّے

چمک دمک سے ہو گئے خالی
کڑی دھوپ کے مارے ذرّے

برسے بِنا گزر گئے بادل
کرتے رہے اِشارے ذرّے

پو پُھوٹی تو کرن کرن نے
پُورم پُور بکھارے ذرّے

ہوتے ہیں پانی کے بجائے
میٹھے ذرّے ، کھارے ذرّے

شکل ہی گُم کر بیٹھے اپنی
پڑے ہیں ڈھول کنارے ذرّے

کیسی عقل مِلی انساں کو
ذرّوں میں سے گزارے ذرّے

ایٹم بن کر ہُوئے ہیں رُسوا
کیسے پیارے پیارے ذرّے

-☆-

ایسی بھائی گرد
اور اُڑائی گرد

ہوا عقب کی تھی
سامنے آئی گرد

مطلع تھا سب صاف
اُسے بتائی گرد

اپنی اُڑائی ہُوئی
آپ بٹھائی گرد

کہیں صاف کی دھند
کہیں ہٹائی گرد

دیکھ کے گھور گھٹا
کیا تھرّائی گرد

لگتی ہے اچھی
ہے ہمسائی گرد

کبھی دکھایا شور
کبھی سُنائی گرد

آئینے پہ ظفر
آپ جمائی گرد

-☆-

لگا بہت ہی بھولا چاند
بندھا ہوا تھا، کھولا چاند

میری سمجھ نہیں سکتا
اپنی بولی بولا چاند

انگیا کیسی روشن تھی
تھوڑی دیر ٹٹولا چاند

شرم سے آنکھیں کر لیں بند
بدل رہا تھا چولا چاند

چاندنی بہت مقدس تھی
پھر بھی بہت مدھولا چاند

دور تھی ابھی ہوا اُس سے
کھڑے کھڑے ہی ڈولا چاند

مجھے بھی ساتھ اُڑائے پھرا
تھا وہ اُڑن کھٹولا چاند

رات اندھیری تھی اور سرد
ہوا ہے شعلہ شعلہ چاند

کہاں سے آئے ہیں یہ، ظفر
ایک آسماں، سولہ چاند

☆

آسمان سے ٹوٹا تارا
جو تھا سب سے اچھا تارا

رات کے بعد بھی رات ہی آئی
شام سے پہلے چمکا تارا

کسی طرح سے خوش رہتا ہے
جلتا تارا، بجھتا تارا

میرے سامنے آن گرا ہے
وہی مری قسمت کا تارا

رہ گئے تھے بس آسمان پر
پورا چاند اور آدھا تارا

الگ نہیں ہونے والا ہے
یہ تارے سے اُلجھا تارا

ٹوٹنے والے تارے کے پھر
پیچھے ٹوٹ کے بھاگا تارا

اتنے بڑے خلا کے اندر
بھول گیا تھا رستا تارا

بھول نہیں سکتا ہے ظفر کو
آخری شام اور پہلا تارا

☆

اپنی نکلائی ہوئی
موت ہے آئی ہوئی

بکھر گئے تارے تمام
خوب لڑائی ہوئی

پھر کہیں جا کر کوئی
صُلح صفائی ہوئی

پھٹنے کو ہے کائنات
اُس کی پھلائی ہوئی

ٹھہری ہوئی ہے زمیں
یا ہے گھمائی ہوئی

دشمنِ جاں ہو گئی
پاس بٹھائی ہوئی

رُک نہیں سکتی ہے اب
اُس کی نچائی ہوئی

گھر میں خُدا کے ہے کیا
سیندھ لگائی ہوئی

ذات ہے اُس کی ، ظفر
چار سُو چھائی ہوئی

-☆-

کائنات کی حیرانی ہے
یہ ایک اور پریشانی ہے

دل کا بھی ہے یہی مُعاملہ
دولت بھی آنی جانی ہے

دریا ہیں سُوکھے اور خالی
صرف سمندر میں پانی ہے

بہت عناصر کی آپس میں
چار طرف کھینچا تانی ہے

کہکشاؤں نے روزِ ازل سے
کہیں اور ہی کی ٹھانی ہے

ناواقف سیاروں کی بھی
صُورت جانی پہچانی ہے

آنا مُشکل ہے دُنیا میں
جانے ہی کی آسانی ہے

اِک طوفان ہے آفتاب میں
اور ، باہر بھی طغیانی ہے

شش جہات میں ظفر ابھی تک
وُہی کرشمہ سامانی ہے

-☆-

ستارہ دُور کیوں ہے
اشارہ دُور کیوں ہے

بھنور نزدیک ہے کیوں
کنارہ دُور کیوں ہے

خسِ دُنیا سے آخر
شرارہ دُور کیوں ہے

درِ مہتاب سے گھر
ہمارا دُور کیوں ہے

کُھلی رکھتا ہوں آنکھیں
نظارا دُور کیوں ہے

فلک پہلے بھی تھا دُور
دوبارہ دُور کیوں ہے

مری لکڑی ہے تیار
تو آرا دُور کیوں ہے

جو آیا پاس آدھا
وہ سارا دُور کیوں ہے

ظفرؔ، پیاسا ہوں اتنا
وہ دھارا دُور کیوں ہے

☆

کس جنگل میں کھوئے
اوئے اوئے اوئے

جاگا سُورج بیٹھے
اور، ستارے سوئے

ایک برابر ہیں
ہم ہوئے نا ہوئے

خار ہی خار اُگے ہیں
بیج وہ ہم نے بوئے

بادل تو نہیں برسا
چھت کاہے کو چوئے

ہمیں زمانہ گزرا
دل کی کالک دھوئے

پڑا ہے اپنا سارا
بوجھ کسی کے ڈھوئے

ہنسے آٹھ آٹھ آنسو
کھلکھلا کے ہم روئے

کوئی پتا نہیں چلتا
جیتے ہیں یا موئے

☆

زمیں زیر و زبر کب ہو رہی ہے
یہ ہو گی تو، مگر، کب ہو رہی ہے

سو، اہلِ آسماں کی مہربانی
ہمارے حال پر کب ہو رہی ہے

مری حالت بدلنی ہے تو کس دن
مری نوگی مٹر کب ہو رہی ہے

سفر میرے پہ آساں، اور آساں
کسی کی رہگزر کب ہو رہی ہے

تمھارے عہد میں یہ زندگانی
گزرتی ہے، بسر کب ہو رہی ہے

سمندر سے مجھے یہ پوچھنا تھا
مری کشتی بھنور کب ہو رہی ہے

خبر رکھنا، ستاروں کی سواری
ہماری ہم سفر کب ہو رہی ہے

نکل آیا ہے سورج تو کبھی کا
ہمارے ہاں سحر کب ہو رہی ہے

پڑے رہنا ہے کیا ایک آستاں پر
تمنّا در پہ در کب ہو رہی ہے

☆

یہ ہوتا کیوں نہیں تھا ہونے والا
رُکا تھا کیوں تماشا ہونے والا

کھڑے ہیں منتظر، ہوتا ہے کس دن
وہ سُورج میں دھماکا ہونے والا

کہیں جوڑیں گے آخر بیٹھ کر ہم
زمیں کا پُرزہ پُرزہ ہونے والا

زمین و آسماں کا کوئی دن میں
ہے کوئی اور نقشہ ہونے والا

ہرے ہونے کو ہیں یہ خشک جنگل
فلک سے ہے اشارہ ہونے والا

یہ پانی خاک ہونا چاہتا ہے
سمندر ہے کنارہ ہونے والا

زمیں کا حضرتِ انساں کے ہاتھوں
کوئی دن میں ہے تختہ ہونے والا

یہ صحرا برف سے ڈھک جائے شاید
کہ خُود سُورج ہے ٹھنڈا ہونے والا

تُمھارا بھی ہے کچھ دن میں ظفرؔ اب
برابر تیا پانچا ہونے والا

☆

ایک خلا یا اور خلا
دیکھو اپنے طور خلا

اس کے علاوہ ڈھونڈتے ہیں
کوئی قابلِ غور خلا

تاروں اور سیاروں پہ
کرے نہ ظلم و جور خلا

کہکشاؤں سے تُرت نکال
اور کوئی فی الفور خلا

اپنے لیے تو کافی ہے
ایک یہی لاہور خلا

بھارت سے لے آئیں گے
ایک اُدھار پھلور خلا

کرتے رہے شکار بہت
تیتر اور تلور خلا

کسی نجومی سے جا پُوچھ
کوئی ستارہ ثور خلا

یہ ہے خلائی دور ، ظفر
کہیے اس کو دور خلا

☆

کوئی ستارہ چاہیے
اور ، دوبارہ چاہیے

اُجڑی ہوئی ہے زندگی
پارہ پارہ چاہیے

ہرا سمندر چار سُو
کہیں کنارہ چاہیے

بچوں بالوں کے لیے
دودھ کی دھارا چاہیے

مجھے لنگوٹی ہے بہت
اُسے غرارہ چاہیے

درکار اُس کا ہے بدن
اور ، پھر سارا چاہیے

وہیں منافع ملے گا
جہاں خسارہ چاہیے

دیوارِ دل کے لیے
مٹی گارا چاہیے

ہمت ہارے کو ، ظفر
قسمت مارا چاہیے

☆

گیلی مٹی ، پیلی مٹی
پڑی ہوئی تھی گیلی مٹی

اندر سے کچھ اور ہی نکلا
مٹی پر سے چھیلی مٹی

وہ ہے کساکسایا اتنا
اور ، ہے اپنی ڈھیلی مٹی

خودکشی ہوئی خاک پھانک کر
تھی اتنی زہریلی مٹی

ہاتھ لگایا ڈرتے ڈرتے
تھی اُس کی شرمیلی مٹی

آسمان سے آئی ہے یہ
کیسی نیلی نیلی مٹی

لیپنی ہے ہم نے قبر اپنی
چاہیے ایک چمکیلی مٹی

کوشش کرتے رہو کبھی تو
پگھلے گی برفیلی مٹی

چبھتی رہتی ہے راتوں کو
ہمیں ، ظفر ، نوکیلی مٹی

☆

ایک ستارہ ہرا
دیکھ کے مجھ کو ڈرا

پیاس بھی تھی بے حد
گھونٹ بھی آدھا بھرا

روز اُترتا ہے
پریوں کا اک پرا

ہمیں بھی کر ارداس
ایک آدھ سنگترہ

ایسا پڑا زُکام
پھول گیا نرخرہ

چاند بھی نقد نرائن
سورج بھی ہے کھرا

لگتا تو ہے دوست
دشمن ہے کس طرح

کام نہیں ہے کوئی
بات تو سنیے ذرا

مجھے دکھائیں ، ظفر
اُڑا ہوا گھگرا

☆

نیلم پری سی ہے کوئی ساروں کے درمیاں
ایک اور آسمان ستاروں کے درمیاں

اُڑتی ہوئی فضا میں پتنگیں سی رنگ رنگ
گرد و غبار سا وہ غباروں کے درمیاں

اک رات ہے شکستہ اندھیروں کے بین بین
اک راستا ہے راہگزاروں کے درمیاں

اک پھول ہے دہکتا ہوا شش جہات میں
دونوں کے اردگرد ہے، چاروں کے درمیاں

اک تیرگی کا چاند چمکتا ہے دُور دُور
اُلجھے ہوئے نگاہ کے تاروں کے درمیاں

کونجوں کا اک سفید سفر، اور، ساتھ ساتھ
بادل کے گُل کھلے ہوئے ڈاروں کے درمیاں

جھونکا سا ایک نرم ہوا کا رُکا ہوا
اور، خار و خس پڑے تھے شراروں کے درمیاں

لتھڑے ہوئے سے لفظ معانی کے دائیں بائیں
بچھڑے ہوئے کنائے اشاروں کے درمیاں

مہلت ملی ہے یہ جو نئی عمر کی، ظفر
رہنا ہے کچھ دن اور ابھی پیاروں کے درمیاں

☆

یہ اندر ہو کہ باہر آسماں کے سامنے ہے
بہت خوش ہوں مرا گھر آسماں کے سامنے ہے

مَیں نیچے سے نکل آیا ہوں آخر آسماں کے
کہ جو کچھ ہے برابر آسماں کے سامنے ہے

کنارہ آسماں کے دُوسرے رُخ پر ہے شاید
وگرنہ تو سمندر آسماں کے سامنے ہے

نہیں ہے ڈھونڈنا مشکل نیا مسکن ہمارا
خلا کے اور اندر، آسماں کے سامنے ہے

جو پس منظر میں ہوتا تھا ہمیشہ آسماں کے
وہ اب دیکھو تو اکثر آسماں کے سامنے ہے

بہت مُدّت کی خواری جھیلنے کے بعد آ کر
زمیں بھی اب اُچھل کر آسماں کے سامنے ہے

اگر کچھ غور سے دیکھیں تو ان پہنائیوں میں
ستارہ بھی سراسر آسماں کے سامنے ہے

ہوا کی ساری ہلچل راہ میں پڑتی ہے، لیکن
زمیں کا سارا منظر آسماں کے سامنے ہے

ظفر، مَیں آسماں کا سامنا کر بھی چکا ہوں
دلِ تنہا مکرّر آسماں کے سامنے ہے

☆

اسی دشت میں کوئی تھا سبزہ زار
ہر اک سمت پھیلا ہُوا سبزہ زار

کہیں میرے حیرت کدے میں کوئی
چمکتا ہے آئینہ سا سبزہ زار

زمیں پر ستارے سجائے کبھی
کبھی آسماں پر لکھا سبزہ زار

سفر درمیاں میں ہی رُک جائے گا
اگر راستے میں پڑا سبزہ زار

ہُوئی آمد و رفت اپنی جو کم
تو اندر ہی اندر اُگا سبزہ زار

زمیں اپنا پانی اُگلتی نہیں
کہاں جائے یہ سُوکھتا سبزہ زار

کُھلی نیند سے آنکھ اپنی تو پھر
کہاں کے درخت اور کیا سبزہ زار

مکاں ہی مکاں بن گئے دُور تک
نہیں کوئی باقی بچا سبزہ زار

بہُت ہی بڑا باغ تھا وہ ، ظفر
اور ، اُس باغ سے بھی بڑا سبزہ زار

-☆-

وقت سے جیسے ماورا دن ہے
یہ نکلتا کہ ڈوبتا دن ہے

تھم کے دے ہی نہیں رہی بارش
تیسری رات ، دُوسرا دن ہے

پھیلتی شام ہے مرے باہر
اور ، اندر ہرابھرا دن ہے

برف سی گر رہی ہے سُورج میں
اور سردی سے کانپتا دن ہے

کہیں روشن ، کہیں اندھیرا بھی
آج کا دن ملاجُلا دن ہے

عرصۂ کائنات میں جیسے
اک طرف کو کہیں پڑا دن ہے

خُود سے خالی ہُوں صبح سے مَیں ہی
ورنہ کیسا بھراپُرا دن ہے

گُزر اوقات کِس طرح ہو گی
رات چھوٹی ہے اور بڑا دن ہے

ہے گُزاری ہُوئی سی رات ، ظفر
اور ، بسر سا کیا ہُوا دن ہے

-☆-

ہر طرف دھند ہے پھیلی ہوئی سیارے پہ
تیرگی ہے تو کہیں روشنی سیارے پہ

یہ زمیں راس بھی مجھ کو نہیں آئی ہے کہیں
میں پہنچ بھی نہیں سکتا کسی سیارے پہ

سچ تو یہ ہے کہ مجھے ہونا ہے دریافت ابھی
میری تقدیر پڑی ہے اُسی سیارے پہ

ڈھونڈنے نکلے ہو، ممکن ہے کہیں مل جائے
کوئی تعبیر کسی خواب کی سیارے پہ

وہ بھی وقت آنے ہی والا ہے کہ بیٹھے بیٹھے
ابھی اس دشت میں ہو اور ابھی سیارے پہ

آدمی ہی وہ عجوبہ ہے کہ دیکھو گے کبھی
وُہی موجود یہاں ہے، وُہی سیارے پہ

گنگناتی ہے ہوا سی کوئی چاروں جانب
تھرتھراتی ہے صدا سی کوئی سیارے پہ

خاک پر اپنی ملاقات نہیں ہو سکتی
کبھی ملنا ہے ستارے، کبھی سیارے پہ

سر بسر یہ تو کوئی موت کی صورت ہے، ظفر
زندگی ہو گی کسی اور ہی سیارے پہ

☆

آسمانوں سے اُتری ہُوئی شام
اور، بستی پہ بکھرتی ہُوئی شام

تھی تعلق سی دن اور دُنیا میں
اپنے اندر سے اُبھرتی ہُوئی شام

ابھی شبنم سے شہادت لے کر
زندہ ہو جائے گی مرتی ہُوئی شام

رات کا راز بنے گی جا کر
آپ ہی آپ ٹھہرتی ہُوئی شام

اور یہیں لیٹ رہے گی آخر
اس چراگاہ میں چرتی ہُوئی شام

پھول پتّوں پہ، گزرگاہوں پہ
پانو آہستہ سے دھرتی ہُوئی شام

رُک بھی سکتی ہے کسی جنگل میں
یہ بظاہر تو گزرتی ہُوئی شام

کوئی آئے گا اسے ملنے کو
کہہ رہی ہے یہ سنورتی ہُوئی شام

شام سے ڈرنے لگے لوگ، ظفر
اور، لوگوں سے یہ ڈرتی ہُوئی شام

☆

اِک جگہ پہ تو ٹھہرتے نہیں سارے موسم
ہو بھی سکتا ہے بدل جائیں ہمارے موسم

زور کرتی ہُوئی ہر سمت سیاہ آب و ہوا
ٹوٹتے پُھوٹتے ہُوئے سبز ستارے موسم

منتظر رہتا ہے میرا خس و خاشاک بدن
اُڑتے رہتے ہیں کہیں دور شرارے موسم

جُھک گئی ہو نہ کہیں پُھول کی ڈالی سی یہ رات
رُک گئے ہوں نہ کہیں خواب کنارے موسم

اور نیچی ہُوئی جاتی ہے محبت کی اُڑان
اور اُونچے ہُوئے جاتے ہیں غبارے موسم

زور سے ہنس پڑی پتّوں پہ سرکتی ہُوئی دُھوپ
پُھوٹ کر رو دیے بادل سے اُتارے موسم

ہم بھی مایُوس نہ تھے ، آس لگائے رکھی
ہمیں ہر روز لگاتا رہا لارے موسم

اپنا موسم تو سراسر ہمیں بھولا ہُوا ہے
جس طرح کے ہیں کئی دن سے تُمھارے موسم

راستا کوئی سُجھاتے ہُوئے سے مُجھ کو ، ظفر
اُس کی آنکھوں میں چمکتے ہیں جو تارے موسم

-☆-

تازہ و صاف لہکتی ہمہ سُو آب و ہوا
وہاں رہیے کہ ہو جس شہر کی تُو آب و ہوا

سانس لینا ترا کُچھ یُوں بھی ضروری ہے بہت
کہ اِسی چیز سے پاتی ہے نمو آب و ہوا

دن نکلتا ہے تو آلیتی ہے تپتی ہُوئی دُھوپ
اور ، یُوں میرا سُکھاتی ہے لہُو آب و ہوا

تالیاں پیٹتے رہتے ہیں برابر پتّے
کیا بہم ہوتے ہیں اکثر لب جُو آب و ہوا

چاک ہر زخم کہ جیسے کہ یہاں تھا ہی نہیں
کرتی ہے ایسی مہارت سے رفو آب و ہوا

مُجھ سے ہر لحظہ لگاوٹ ہی رکھے گی ، جیسے
چھوڑ سکتی نہیں شاید تری خُو آب و ہوا

باغ میں پُھول چمک اُٹھتے ہیں چہرہ چہرہ
عکس جب ڈالتی ہے آئنہ رُو آب و ہوا

دمک اُٹھتے ہیں ترے چشم و جبیں شام و سحر
پھیل جاتی ہے تری زُلف کی بُو آب و ہوا

عید ہو جاتی ہے آنکھوں کی مَیں جب چاہوں ، ظفر
بھر کے لاتی ہے تماشے کے سبُو آب و ہوا

-☆-

کوئی شاید جواب دے آواز
آئی ہے آسمان سے آواز

آ رہی ہیں ہزار آوازیں
کون دے گا یہاں اُسے آواز

کسے پروا ہے شور و شر میں اگر
ٹوٹتی پھوٹتی رہے آواز

یہ ہوا اور میں کسی لمحے
ہوتے ہیں ایک ساتھ بے آواز

کام اپنا پکارنا ہے فقط
کوئی شاید کبھی سُنے آواز

اور بھی دیکھ پائیں کچھ منظر
کہیں آگے سے تو ہٹے آواز

کل کی خاطر سنبھال کر رکھ لیں
شام کے بعد جو بچے آواز

موت کچھ دور ہے ابھی، شاید
زندگی ہی ابھی کرے آواز

یہ بھی اک مستقل سفر ہے، ظفر
رات دن سُو بسُو چلے آواز

☆

ہے اور بات بہت میری بات سے آگے
زمین ذرہ ہے اس کائنات سے آگے

اک اور سلسلۂ حادثات ہے روشن
اس ایک سلسلۂ حادثات سے آگے

ہوائے عکسِ بہار و خزاں نہیں ہے فقط
اگر نگاہ کرو پھول پات سے آگے

یہ ہم جو پیٹ سے ہی سوچتے ہیں شام و سحر
کبھی تو جائیں گے اس دال بھات سے آگے

کچھ اور طرح کے اطراف منتظر ہیں کہیں
اُٹھائیں زحمت اگر شش جہات سے آگے

نہ روک پائے تغیر کی تیز طغیانی
جو بند باندھنے آئے ثبات سے آگے

کنویں میں بیٹھ کے ہی ٹرّا گئے کچھ دن
نظر پڑا نہیں کچھ اپنی ذات سے آگے

اس آب و رنگ سے باہر بھی اک تماشا ہے
چلے چلو جو نظر کی صفات سے آگے

ظفر، یہ دن تو نتیجہ ہے رات کا یکسر
کچھ اور ڈھونڈتا رہتا ہوں رات سے آگے

☆

پہلے تو فقط ہوا ہے رفتار
پھر آپ وہاں خلا ہے رفتار

اندازہ ہی کر سکا نہ کوئی
روشن اور کیا سے کیا ہے رفتار

رفتاریں یوں ہوئی ہیں گڈ مڈ
لگتا ہے کچھ اور، یا ہے رفتار

آواز کو ناپتے کہاں تک
ایک اپنی الگ صدا ہے رفتار

اب اس کی مثال دیجیے کیا
رفتار سے بھی جدا ہے رفتار

سوچو تو یہ سلسلہ ہے بے حد
دیکھو تو ذرا ذرا ہے رفتار

لگتا ہے اس طرح کہ شاید
اپنا ہی نقشِ پا ہے رفتار

آیا ہی نہیں یقین اس کا
گویا کوئی وہم سا ہے رفتار

ڈر ہی ظفر آ رہا ہے مجھ کو
آخر یہ کیا بلا ہے رفتار

-☆-

موسم کا ہاتھ ہے نہ ہوا ہے خلاؤں میں
پھر اس نے کیا طلسم رکھا ہے خلاؤں میں

جو ٹوٹتی بکھرتی سی رہتی ہے رات دن
کچھ اس طرح کی ایک صدا ہے خلاؤں میں

جاری ہے روشنی کا سفر دور دور تک
کیا کھیل کوئی کھیل رہا ہے خلاؤں میں

منظر بھی مختلف ہیں، جدا اس کے رنگ بھی
جس طرح کوئی خواب نوا ہے خلاؤں میں

جاری ہے کہکشاؤں کی بارات اس طرح
میلا سا جیسے کوئی لگا ہے خلاؤں میں

صنعت گری کی رمز الگ ہے زمین پر
کاری گری کا راز جدا ہے خلاؤں میں

بے طرح پھیلتے ہیں سماوات ہر گھڑی
ہر لحظہ ایک رنگ نیا ہے خلاؤں میں

رفتار اور وقت کا اندازہ ہے کچھ اور
فطرت کی مختلف ہی ادا ہے خلاؤں میں

اس کائنات کی کوئی حد ہی نہیں، ظفر
اپنا ہی اس نے طرز رکھا ہے خلاؤں میں

-☆-

بے وجہ بلندی سے اترتے نہیں بادل
اب شہر کے اوپر سے گزرتے نہیں بادل

سازش کہیں رکھتے ہیں کوئی تیز ہوا سے
آتے بھی کبھی ہیں تو ٹھہرتے نہیں بادل

پل بھر میں جو پہنچے ہیں یہاں اور، وہاں اور
میں سوچ رہا تھا کہ بکھرتے نہیں بادل

سر پر سے گزر جاتے ہیں بے روک، بلا ٹوک
پرواز نہیں مانگتے، ڈرتے نہیں بادل

کیا بات ہے، چشمک سی لگا رکھی ہے مجھ سے
زنہار افق سے جو ابھرتے نہیں بادل

کچھ بھول گئے ہیں وہ برسنے کا قرینہ
اس بات پہ اب غور بھی کرتے نہیں بادل

بارش ہی نہیں ہے تو دھنک آئے کہاں سے
آتے بھی کبھی ہیں تو اترتے نہیں بادل

رہتے ہیں ہوا کے ہی کہیں رحم و کرم پر
کچھ دیر کو بنتے ہیں، سنورتے نہیں بادل

خود میں نے ظفر آپ کیا تھا جنہیں رخصت
گزرے ہیں زمانے، ابھی پرتے نہیں بادل

☆

گرد میں دھند ہے، غبار میں دھند
قافلے کے ہے انتظار میں دھند

نظر آتا نہیں کنارہ صاف
ہے وہ دریا کے آرپار میں دھند

ایک دیوار سی کھڑی ہے ابھی
وادیٔ کوہ و برف زار میں دھند

راستے بند ہیں، کدھر جائیں
ہے وہ مستور آشکار میں دھند

جس نے یوں جمع کر کے بھیجی ہے
نہیں اس کے بھی اب شمار میں دھند

چہرہ اس کا بھی آ سکا نہ نظر
تھی وہ خوابِ خیالِ یار میں دھند

ریت کی جگہ بھر گئی، دیکھو
کتنی صحرائے بے کنار میں دھند

پھر رہی بے ارادہ و بے سمت
ہے کہیں اپنے ہی مدار میں دھند

مستقل ہی ٹھہر گئی ہے، ظفر
اپنے اشعار آبدار میں دھند

☆

مجھے ہر بار ہی لگی آواز
کبھی تصویر تھی ، کبھی آواز

شکر ہے ، اس گھنی خموشی میں
کوئی تو کان میں پڑی آواز

بولتا بھی نہ تھا کوئی ، لیکن
ان فضاؤں میں کوئی تھی آواز

سسکیوں کی طرح سے آتی ہے
زندگی کی دبی دبی آواز

ابھی کچھ دیر انتظار کرو
آئے گی ایک تیسری آواز

لڑکھڑانے لگے ہیں سب لمحے
کھو گئی ہے نپی تُلی آواز

جس نے پاگل کیے رکھا ہم کو
تُو نہیں تھا ، وہ تھی تری آواز

سلسلہ یہ عجیب سا ہے کوئی
ہے کبھی روشنی ، کبھی آواز

اب تو عادت سی پڑ گئی ہے ، ظفر
اچھی لگتی ہے دُور کی آواز

☆

اس طرح کی بھی ہے کہیں آواز
یہ تو کچھ اور ہے ، نہیں آواز

موت نے جو لگائی تھی اک رات
زندگی سے بھی تھی حسیں آواز

اُس کے پیچھے نہ بھاگنا ہرگز
آئے گی ایک دن یہیں آواز

ڈھونڈنا چاہیے ہے گھر اُس کا
ہے یہیں پر کہیں مکیں آواز

ہم پریشاں رہے عبث ، ورنہ
وہ بھی تھا ، اور ، تھی وہیں آواز

کیا خبر کس طرف سے اُبھری تھی
کوئی دل میں ہے جاگزیں آواز

نہیں اُتری فلک سے دُوسری بار
پھر وہ سرسبز ، اوّلیں آواز

پھر رہی ہے کہیں خلاؤں میں
نم نشیں ، نرم ، نازنیں آواز

روک لی کس نے راہ میں ہی ، ظفر
آ رہی تھی مرے تئیں آواز

☆

رُکتی رُکتی ، ڈری ڈری آواز
پھر نہ آئی وہ سرسری آواز

ہو گئی جیسے ایک دم خالی
وہ شگفتہ ، بھری بھری آواز

شام کے وقت روز اُترتی ہے
آسمانوں سے اک پری آواز

پھر چلی جائے گی کسی جانب
پارۂ ابر پہ دھری آواز

دمبدم ساتھ ساتھ رہتی ہے
کرتی ہے اُس کی نوکری آواز

زندگی کا ثبوت ہے پھر بھی
یہ لرزتی ، مری مری آواز

کسی جانب سے آ ہی جاتی ہے
کسی دن تازہ تر ، ہری آواز

کبھی ہوتی تھی اپنے جوبن پر
اب تو ہے صرف تھرتھری آواز

بھیک پہ ہی گزر بسر ہے ، ظفر
کر رہی ہے گداگری آواز

☆

نہیں دیتے ہیں رفتگاں آواز
دے چکا ہوں کہاں کہاں آواز

چہچہاتے ہیں صبح کو طائر
گونج اُٹھتا ہے اک جہاں آواز

ایک لمحے کو بس چمکتی ہے
ہوتی جاتی ہے پھر دھواں آواز

ڈر گئے تھے گھروں کے اندر لوگ
آئی تھی کوئی ناگہاں آواز

اور کیا چاہیے ضعیفی میں
ہو اگر اس قدر جواں آواز

دے رہی تھی زمیں کوئی آہٹ
مجھے لگتی تھی آسماں آواز

ان فضاؤں میں ، ان خلاؤں میں
روز رہتی ہے اک رواں آواز

برق ابھی دُور ہی چمکتی ہے
دینے لگتا ہے آشیاں آواز

روز ، اُس کو پکارتا ہوں ، ظفر
روز جاتی ہے رائگاں آواز

☆

روشنی کا یہ پل اندھیرے میں
صبر ہی کا ہے پھل اندھیرے میں

گر یہ خصلت ہیں اس جگہ کے لوگ
چل کہیں اور چل اندھیرے میں

عمر باقی بھی اب گزر جائے
اسی گھنگھور ، اٹل اندھیرے میں

مسکرا کر نہ روشنی پھیلا
آ رہا ہے خلل اندھیرے میں

یہ نہ ہو بے خبر رہیں ہم ، اور
جائے سب کچھ بدل اندھیرے میں

دور تر تھے جو ایک دوسرے سے
ہیں بغل در بغل اندھیرے میں

روشنی کا سراغ ڈھونڈتے ہیں
یار لوگ آج کل اندھیرے میں

پیش کیا کیجیے کہ ہو گئی گم
اپنی فردِ عمل اندھیرے میں

روزِ روشن بھی آ رہا ہے ، ظفر
کوئی دن اور چل اندھیرے میں

☆

پھول کیسا کھلا اندھیرے میں
چل رہی تھی ہوا اندھیرے میں

شاید اس کو نظر نہیں آیا
میں نے جو کچھ کہا اندھیرے میں

تیرہ و تار وہ بھی تھا ، لیکن
ایک جھلمل سی تھا اندھیرے میں

شور میں کچھ مجھے سنائی دیا
کچھ دکھائی دیا اندھیرے میں

وہ ہے بے اختیار ایک طرف
میں ہوں بے دست و پا اندھیرے میں

میں تو شاید ٹٹول سکتا ہوں
دیکھتا ہے خدا اندھیرے میں

روشنی تک مجھے کہیں لے چل
دے ذرا آسرا اندھیرے میں

ہے بہت دور تک اندھیرے کا
اور اک سلسلہ اندھیرے میں

ایک ہی طرح کا ہے کام ، ظفر
کیا اجالے میں ، کیا اندھیرے میں

☆

اسی گہرائی کی اندھیرے میں
کھو گئی روشنی اندھیرے میں

جگمگاتا تھا دور خواب کوئی
سُرمئی سُرمئی اندھیرے میں

روشنی میں ہوئی تھی گم کوئی چیز
ڈھونڈتا ہوں کسی اندھیرے میں

راستا کیسے ہو گیا روشن
چل رہا تھا ابھی اندھیرے میں

اِک سویرا بھی ہے کہیں شاید
رات کے دائمی اندھیرے میں

سانس اندھیرا تو لے نہیں سکتا
ہے کوئی آدمی اندھیرے میں

آج کل یہ کہاں سے آئی ہے
اس قدر سنسنی اندھیرے میں

کہیں کچھ بھی پتا نہیں چلتا
گم ہیں نیکی بدی اندھیرے میں

روشنی میں سُنائی دے گی ، ظفر
بات میری کہی اندھیرے میں

☆

ہم خزاں کے ڈرے ڈرے صاحب
آپ ہیں دائمی ہرے صاحب

جب کہ فردِ عمل میں کچھ بھی نہ ہو
پھر کوئی اور کیا کرے صاحب

ہم گنہگار اگر نہیں ہوتے
حال ہوتا یہ کیوں ، ارے صاحب

پیش ہے کارکردگی ساری
اب کرو جو بھی تبصرے صاحب

عفو سے آپ ہیں لبالب ، تو
ہم گناہوں سے ہیں بھرے صاحب

پھینکیے اس طرف بھی راہِ کرم
یہ معافی کے سنگترے صاحب

اب چھپائیں بھی کس طرح ان کو
ہیں عمل ہاتھ پر دھرے صاحب

جو بھی ہمت فزائی آپ کریں
آ گئے ہیں اگر ورے صاحب

مال کھوٹا ظفر کے پاس ہے ، اور
آپ ہیں کس قدر کھرے صاحب

☆

رفیقۂ حیات کے نام

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیضؔ دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

فیض احمد فیضؔ

ہوائے وادیٔ دشوار سے نہیں رکتا
مسافر اب ترے انکار سے نہیں رکتا

سفینہ چل جو پڑا ہے چڑھاؤ پر تو کبھی
مخالف آتی ہوئی دھار سے نہیں رکتا

مرا خیال ہے تدبیر کوئی اور ہی کر
ہجوم اب تری تلوار سے نہیں رکتا

ٹھہرنا چاہے تو ٹھہرے گا آپ ہی ، ورنہ
ہماری کوشش بسیار سے نہیں رکتا

اب اس کے ساتھ ہی بہ جائیے کہ یہ سیلاب
خس و خمار کے انبار سے نہیں رکتا

رواں جو ہے سفرِ منزل صدا ہر چند
یہ قافلہ مرے معیار سے نہیں رکتا

یہ ایسے لوگ ہیں ، عادت پڑی ہوئی ہے جنھیں
یہ مال سردیٔ بازار سے نہیں رکتا

مسافرت میں جو ہارے نہ حوصلہ راہی
تو لطفِ سایۂ اشجار سے نہیں رکتا

ہمارا عشق رواں ہے رکاوٹوں میں ، ظفر
یہ خواب ہے ، کسی دیوار سے نہیں رکتا

☆

دریا مرے راستے میں آیا
کیسا مرے راستے میں آیا

میں تیری طرف چلا تو پیہم
کیا کیا مرے راستے میں آیا

میں بھول گیا ہوں راستہ ہی
ایسا مرے راستے میں آیا

جس دشت سے ڈر رہا تھا یہ دل
سارا مرے راستے میں آیا

ہونا تھا جسے مرا مددگار
الٹا مرے راستے میں آیا

پتھر تھے جہاں بھی ، جس قدر بھی
پہلا مرے راستے میں آیا

ویسا نہیں جا سکا ہے واپس
جیسا مرے راستے میں آیا

شبنم کی رہی مجھے توقع
شعلہ مرے راستے میں آیا

منہ موڑ کے چل دیا ، ظفر ، وہ
اچھا مرے راستے میں آیا

☆

کہیں پہ خوار ہوئے ہیں کہیں زبوں ہوئے ہم
یہی سوال ہے خود سے ، ہوئے تو کیوں ہوئے ہم

ہمارا طَور کہیں ایک سا رہا ہی نہیں
کہیں پہ کم ہوئے ہیں اور کہیں فزوں ہوئے ہم

یہ اضطراب اسی طرح دُور ہونا تھا
جو اتنا شور ہُوا ہے تو پُرسکوں ہوئے ہم

اُٹھا نہ کوئی پذیرائی کے لیے اپنی
تُمھاری بزم تھی ، اور ، باریاب یوں ہوئے ہم

کسی نے بھی نہیں پُوچھا کہ آئے ہو کیسے
کھڑے کھڑے ہی ستُونوں میں اک ستوں ہوئے ہم

کمی نہیں تھی وہاں رنگِ لالہ و گُل کی
تُمھارے باغ میں بے فائدہ ہی خُوں ہوئے ہم

ہمارا بھید جو کُھلنے لگا تو پھر ، کسی رات
عصا اُٹھا لیا ، اور شہر سے بروں ہوئے ہم

بس ایک حالتِ حیرت میں ہی رہے اب تک
کہ سرفراز ہوئے ہیں نہ سرنگوں ہوئے ہم

کشود جس کی نہیں تھی کسی کے پاس ، ظفر
طلسم زارِ تماشا میں وہ فسوں ہوئے ہم

☆

اس طبعِ خام کی جو روانی رُکی رہی
اک موڑ پہ پہنچ کے کہانی رُکی رہی

ہونا تھا اُس کے دل کا سفر آنسوؤں میں گم
بارش پڑی تو نقلِ مکانی رُکی رہی

موسم کو اُس نے اور بھی بوجھل بنا دیا
دل کے نواح میں جو گرانی رُکی رہی

جاری تھا ساتھ ساتھ بُڑھاپا قدم قدم
سر میں کہیں کہیں پہ جوانی رُکی رہی

جانے کی جُھوٹ سچ اُسے جلدی تو تھی ، مگر
میرے لیے وہ شام سُہانی رُکی رہی

پتّوں کا شور پھر سے اُسی طرح چل پڑا
کُچھ دیر تو ہوائے خزانی رُکی رہی

کُچھ دن خیال اور کسی راستے پہ تھا
کُچھ دن لہُو میں اُس کی نشانی رُکی رہی

اطرافِ جاں میں آگ تو ٹھنڈی ہوئی کہیں
اچھا ہے ، اپنی شعلہ بیانی رُکی رہی

الفاظ دُور ڈُبکیاں کھاتے رہے ، ظفر
ساحل کے ساتھ موجِ معانی رُکی رہی

☆

نہ گھاٹ ہے کوئی اپنا نہ گھر ہمارا ہُوا
قیام اب کے سرِ رہگزر ہمارا ہُوا

غرض رہی نہ کبھی منزلوں سے کوئی ہمیں
ہمیشہ اپنے ہی اندر سفر ہمارا ہُوا

اُسی کی روشنی کام آئی عُمر بھر اپنے
جو اِک ستارہ فقط شام بھر ہمارا ہُوا

ہمارے حصّے میں دیوار ہی رہی دن رات
کوئی دریچہ ہمارا نہ در ہمارا ہُوا

ہمارے خوں سے گزر کر ہی تیغِ برق بُجھی
ہمارے خس میں اُتر کر شرر ہمارا ہُوا

زرِ سخن جو لُٹایا ہے راستے میں کہیں
تو دُور دشتِ ہوا میں خطر ہمارا ہُوا

رہے ہیں بے ثمر و سایہ ہی سرِ ہستی
برائے نام یہاں پر شجر ہمارا ہُوا

اُسی میں اُلجھے ہُوئے ہیں ہمارے پاؤں ابھی
جو ایک خواب کبھی سر بسر ہمارا ہُوا

کسی سند کی ضرورت نہیں پڑی ہے، ظفر
ہمارا عیب ہی آخر ہُنر ہمارا ہُوا

☆

کچھ وعدہ وعید چاہیے ہے
اور، خط کی رسید چاہیے ہے

کچھ لائقِ گفتگو ہے درکار
کچھ باعثِ دید چاہیے ہے

بچھڑے ہُوئے ہو گیا زمانہ
ملنے کی نوید چاہیے ہے

حاصل ہے جو آپ کی عنایت
کچھ اُس پہ مزید چاہیے ہے

پہلے جو مطالبہ تھا اُس میں
کچھ قطع و بُرید چاہیے ہے

کیا کہیے کہ چاہیے ہے کیا کچھ
اور، کتنا شدید چاہیے ہے

نقصان بہُت اُٹھا چکے ہیں
کچھ اب تو مُفید چاہیے ہے

مایوس بہُت ہیں آج کل ہم
تھوڑی سی اُمید چاہیے ہے

کہہ دو، ظفر، ایک بار ہی اب
جو پاک و پلید چاہیے ہے

☆

دیکھو تو کچھ زیاں نہیں کھونے کے باوجود
ہوتا ہے اب بھی عشق، نہ ہونے کے باوجود

شاید یہ خاک ہی میں سمانے کی مشق ہو
سوتا ہوں فرش پر ہی بچھونے کے باوجود

کرتا ہوں نیند میں ہی سفر سارے شہر کا
فارغ تو بیٹھتا نہیں سونے کے باوجود

ہوتی نہیں ہے میری تسلی کسی طرح
رونے کا انتظار ہے، رونے کے باوجود

پانی تو ایک عمر سے مجھ پر ہے بے اثر
میلا ہُوا ہوں اور بھی دھونے کے باوجود

بوجھل تو میں کچھ اور بھی رہتا ہوں سارا دن
سامانِ خواب رات کو ڈھونے کے باوجود

تھی پیاس تو وہیں کی وہیں، اور، میں وہاں
خوش تھا ذرا سے ہونٹ بھگونے کے باوجود

یہ کیمیاگری مری اپنی ہے، اس لیے
میں راکھ ہی سمجھتا ہوں، سونے کے باوجود

ڈرتا ہوں پھر کہیں سے نکالیں نہ سر، ظفر
میں اُن کو اپنے ساتھ ڈبونے کے باوجود

-☆-

اس شہر سے جا رہا ہوں کب سے
یہ شور مچا رہا ہوں کب سے

ہر ایک سے جھوٹ بولتا ہوں
اک وضع نبھا رہا ہوں کب سے

بستر سے نکل سکوں کسی طور
ترکیب لڑا رہا ہوں کب سے

میں خود بھی ابھی نہیں سمجھتا
جو بات سنا رہا ہوں کب سے

جو مجھ کو لگے نہیں ابھی تک
وہ زخم دکھا رہا ہوں کب سے

کہنے کو نہیں ہے کچھ مرے پاس
دُنیا کو بتا رہا ہوں کب سے

مُنہ بھی تو کوئی مجھ پہ ڈالو
الزام اُٹھا رہا ہوں کب سے

مضبوط بہت ہے یہ عمارت
بُنیاد ہی ڈھا رہا ہوں کب سے

پہنچا نہیں میں، ظفر، ابھی تک
کہنے کو تو آ رہا ہوں کب سے

-☆-

ستارے، چاند، سورج سب تھکے ہارے لگے مجھ کو
کچھ اپنے ہم سفر یوں بھی بہت سارے لگے مجھ کو

کٹائی ہو رہی تھی جانے کس گنجان جنگل کی
بدن میں رات دن چلتے ہوئے آرے لگے مجھ کو

اندھیرے کے تعاقب میں جہاں ایک اور اندھیرا تھا
وہیں بجتے ہوئے آنکھوں میں نقارے لگے مجھ کو

سرایت کر رہی تھی میرے اندر نیند کی نرمی
مگر بجتے ہوئے کانوں میں نقارے لگے مجھ کو

مرے باہر ہوا تھی، اور، اندر برف باری سی
دھندلکے میں جب اُس کے ہونٹ انگارے لگے مجھ کو

پھریں دن بھر اُڑائے اِن فضاؤں میں مجھے کیا کیا
کبھی جو تتلیاں تھیں آج طیارے لگے مجھ کو

بظاہر تو کبھی تھے زندہ و موجود ہر صورت
مگر، اکثر طلسمِ خواب کے مارے لگے مجھ کو

وفورِ طبع کے مُنہ زور طوفانی زمانے میں
معانی بے نوا، اور، لفظ بے چارے لگے مجھ کو

ظفر، چھایا ہوا تھا ہر طرف اس طرح کا موسم
کہ خاموشی کے وقفے بھی سخن پارے لگے مجھ کو

-☆-

نہ اُس کو بھول پائے ہیں نہ ہم نے یاد رکھا ہے
دلِ برباد کو اس طرح سے آباد رکھا ہے

جھمیلے اور بھی سلجھانے والے ہیں کئی پہلے
اور، اُس کے وصل کی خواہش کو سب سے بعد رکھا ہے

رکا رہتا ہے چاروں سمت اشک و آہ کا موسم
رواں ہر لحظہ کاروبار ابر و باد رکھا ہے

پھر اُس کی کامیابی کا کوئی امکان ہی کیا ہو
اگر اُس شوخ پر دعویٰ ہی بے بنیاد رکھا ہے

خزاں کے خشک پتے جس میں دن بھر کھڑکھڑاتے ہیں
اُسی موسم کا نام اب کے بہار ایجاد رکھا ہے

یہ کیا کم ہے کہ ہم ہیں تو کسی فہرست میں اُس کی
بھلے ناشاد رکھا ہے کہ ہم کو شاد رکھا ہے

جسے لفظِ محبت کے معانی تک نہیں آتے
اُسے اپنے لیے ہم نے یہاں اُستاد رکھا ہے

جواب اپنے کو۔ پتہ ہے جو بھی وہ ملبوس پہنائے
سوال اس دل نے اُس کے آگے مادر زاد رکھا ہے

ظفر، اتنا ہی کافی ہے جو وہ راضی رہے ہم پر
کمر اپنی پہ کوئی بوجھ ہم نے لاد رکھا ہے

-☆-

گیرائی دریا کو زنہار نہیں پہنچا
اس پار ہی پہنچا ہوں ، اُس پار نہیں پہنچا

اقرار ہی سمجھیں گے فی الحال تو ہم اس کو
ہم تک جو ابھی اُس کا انکار نہیں پہنچا

ایک اور ہی دُنیا کا پیغام ہمارے تک
پہلے تو پہنچتا تھا ، اس بار نہیں پہنچا

کہسار تماشا پر ، پریوں کے بسیرے میں
سویا ہُوا پہنچا ہے ، بیدار نہیں پہنچا

اُس نے بھی بچا رکھا آئینۂ نخوت کو
ہم کو بھی محبت میں آزار نہیں پہنچا

از خود ہی پریشاں تھی خوشبوے بدن اُس کی
گُل پھول نہیں بیچے ، عطار نہیں پہنچا

وہ دُور نہیں مجھ سے ، اس پر بھی مرے اندر
کچھ اُس کو سمجھنے کا اسرار نہیں پہنچا

اوروں سے گِلہ کیسا ، خود سے ہی شکایت ہے
مجھ تک ابھی اپنا بھی معیار نہیں پہنچا

خود اپنی ، ظفر ، قیمت کیا ہم نے لگائی ہے
کوئی جو ہمیں لے کر بازار نہیں پہنچا

☆

جیسا بھی ہے وہ ، اُس کی تمنا بُری نہیں
شاید اسی سبب سے یہ دُنیا بُری نہیں

خود کس قدر بُرے ہیں ، اسی پر ہے انحصار
کیا چیز ہے بُری یہاں اور کیا بُری نہیں

خلقت بہت بُری ہی سہی اپنے آس پاس
ہم کو ہے سازگار لہٰذا بُری نہیں

نیت کسی طرح کی بھی ہو اُس کی سب کے ساتھ
لیکن ، ہمارے حق میں زیادہ بُری نہیں

سودا نہیں ہے سر میں ، چلو خاک ہی اُڑائیں
ایسے میں ہم کو صحبتِ صحرا بُری نہیں

اپنے لیے تو ڈوب کے مرنا بھی تھا محال
ہے مُفت میں تو دولتِ دریا بُری نہیں

اچھی نہیں جو ایک طرف سے یہ کائنات
جتنی بھی ہے ، بجا ہے ، بقایا بُری نہیں

چیزوں کی خاصیت کو سمجھنا بھی چاہیے
جو ایک بار ہے وہ دوبارہ بُری نہیں

نقصان تو ہے اس میں ہمارا خُدا گواہ
لیکن ، ظفر ، یہ شُہرتِ بے جا بُری نہیں

☆

سراسر ختم ہو کر بھی جوانی اور باقی ہے
ابھی خوابِ ہوس کی رائگانی اور باقی ہے

ہمارا ہی کہا کافی نہیں کچھ اپنے بارے میں
ہماری داستاں، اُس کی زبانی اور باقی ہے

تلاطم کوئی برپا ہے پسِ الفاظ بھی جیسے
اسی طوفاں میں اک موجِ معانی اور باقی ہے

کنارے ڈوبتے ہیں اور پانی زور پر، جیسے
کسی طبعِ رواں کی بے کرانی اور باقی ہے

میں کتنا اور جی سکتا تھا اس عالم میں پہلے ہی
مری خاطر یہ زہرِ زندگانی اور باقی ہے

ہمیشہ ساتھ ہی رہتا ہوں اک سیلِ محبت کے
سو، اپنے خون میں تھوڑی روانی اور باقی ہے

جو سچ پوچھو تو ہیں ساری بہانے بازیاں، ورنہ
اگر ہم ڈوبنا چاہیں تو پانی اور باقی ہے

مرے آثار بھی ہیں اس خراب آباد میں، شاید
کہیں عمرِ گزشتہ کی نشانی اور باقی ہے

جلا بیٹھا ہوں دُنیائے خس و خاشاک سب اپنی
ظفر، اب کس لیے آتش بیانی اور باقی ہے

☆

اک دشت اور بھی مرے گھر کے بجائے تھا
یہ دوسرا سفر جو سفر کے بجائے تھا

ہم کو تو بچ نکلنے کی دیتے رہے نوید
گرداب ہی تھا وہ جو بھنور کے بجائے تھا

گھیرے میں آ چکی تھی بُری طرح سے یہ خلق
دیوار ہی کا سلسلہ در کے بجائے تھا

کُھلتا نہ تھا معاملہ کیسا ہے اصل میں
اک خوف کا خُمار خبر کے بجائے تھا

مقدور بھر اُسی سے ڈراتے رہے ہمیں
جو وقتِ سخت لقمۂ تر کے بجائے تھا

اُس کی خوشی سے اپنے لیے چُن لیا وہی
جو خارزار راہگزر کے بجائے تھا

اب تک تو چل رہا تھا یہاں پر اُسی سے کام
دستار کا جو دبدبہ سر کے بجائے تھا

آنے لگا ہے اُس کے بیاں میں بھی آج کل
درپردہ عذر سا جو اثر کے بجائے تھا

اچھوں سے چھین لی تھی بُروں نے جگہ، ظفر
جو عیب تھا یہاں وہ ہنر کے بجائے تھا

☆

ہم نے اُسے مدد کو پکارا تو ٹھیک ہے
اُس کو اگر نہیں ہے گوارا ، تو ٹھیک ہے

گردش میں آسماں کی ہی گڑبڑ نہ ہو کہیں
ورنہ بظاہر اپنا ستارہ تو ٹھیک ہے

باہر نکلتا رہتا ہے دل سے لہو ، اگر
ہو گی کچھ اور وجہ ، کنارہ تو ٹھیک ہے

آخر نکل رہا ہے نتیجہ کچھ اور کیوں
ہم ہی غلط نہ ہوں کہ اشارہ تو ٹھیک ہے

ہم نے اُسے دوبارہ بھٹکنے سے پیشتر
اس دل کے راستے سے گزارا تو ٹھیک ہے

بات اُس کی معتبر تو زیادہ نہیں ، مگر
اُس نے اگر کہا ہے دوبارہ تو ٹھیک ہے

اُس کو مغالطہ کوئی اب ہو تو ہو کہیں
ہر طرح سے حساب ہمارا تو ٹھیک ہے

اپنے بحال ہونے میں کچھ دیر ہو تو ہو
خوش ہیں کہ اب مزاج تمھارا تو ٹھیک ہے

جھلکی نہیں وہ سانولی صورت ابھی ، ظفر
ہم نے اس آئنے کو نکھارا تو ٹھیک ہے

☆

کچھ اب کے میں بہ اندازِ دگر جاگا ہوا ہوں
کہ آنکھیں بند ہیں میری ، مگر ، جاگا ہوا ہوں

مچا رکھا ہے چڑیوں نے یہ کیسا شور مجھ میں
مجھے لگتا ہے میں کوئی شجر جاگا ہوا ہوں

کبھی سو جائیں تو ہو گا گزارا کس طرح سے
میں ان سوئے ہوؤں کو دیکھ کر جاگا ہوا ہوں

میں اپنی نیند پوری کر چکا ہوں عمر بھر کی
کہ بھر سویا رہا ہوں ، اور ، بھر جاگا ہوا ہوں

ہٹاتے کیوں نہیں مجھ پر سے یہ خوابوں کی چادر
بتاتے کیوں نہیں مجھ کو اگر جاگا ہوا ہوں

اُٹھا کر کون لایا ہے مجھے اُس کی گلی سے
کہ باہر سو رہا تھا ، اور ، گھر جاگا ہوا ہوں

میں چلتا پھر رہا ہوں عالمِ خوابیدگی میں
کبھی سمجھے ہوئے ہیں سربسر جاگا ہوا ہوں

اگر کچھ ہے ، مرے دوبارہ سو جانے سے پہلے
تو کہہ سن لو کہ خاصا مختصر جاگا ہوا ہوں

ظفر ، تقسیم کر رکھا ہے دو حصوں میں خود کو
ادھر سویا ہوا ہوں ، اور ، اُدھر جاگا ہوا ہوں

☆

ایسی کوئی درپیش ہوا آئی ہمارے
جو ساتھ ہی پتّے بھی اُڑا لائی ہمارے

وہ ابر کہ چھایا رہا آنکھوں کے اُفق پر
وہ برق جو اندر کہیں لہرائی ہمارے

دیکھا ہے بہت خواب مُلاقات بھی ہر روز
حصّے میں جو اب آئی ہے تنہائی ہمارے

اس بار مِلی ہے جو نتیجے میں بُرائی
کام آئی ہے اپنی کوئی اچھائی ہمارے

تھے ہی نہیں موجود تو کیوں خلق نے اُس کی
چاروں طرف افواہ سی پھیلائی ہمارے

پھر جھوٹ کی اس میں ہمیں کرنی ہے ملاوٹ
پھر راس نہیں آئے گی سچائی ہمارے

ڈرتے ہوئے کھولا تو ہے یہ بابِ تعارف
پڑ جائے گلے ہی نہ شناسائی ہمارے

دعویٰ تو بہت رمز شناسی کا اُسے تھا
یہ خلق اشارے نہ سمجھ پائی ہمارے

چل بھی دیے دکھلا کے تماشا تو ظفرؔ ، ہم
بیٹھے رہے تا دیر تماشائی ہمارے

☆

وہی اک خواب ہے آنکھوں میں تازہ رہنے والا
جو ہے دُنیا کے نقشے پر ہمیشہ رہنے والا

خزاں ہر بار کترا کر گُزر جائے گی اس سے
ہمارا پھول ہے دائم شگفتہ رہنے والا

بہت اس کو مٹانے کی ہوئی تدبیر ، لیکن
کہیں پر ہے کوئی اس میں کرشمہ رہنے والا

نہ رہنے والی چیزیں بھی ہیں اکثر قابلِ غور
کہ ہوتا ہے کوئی اُن کا بھی حصّہ رہنے والا

ہمارے دشت و در میں دھوپ بھی ہے چھانو جیسی
کہ سر پر ہے کسی سُورج کا سایہ رہنے والا

ہمارے اپنے موسم ہیں رنگارنگ ، آتے جاتے
کوئی کم ہے یہاں کوئی زیادہ رہنے والا

زمانے اور صدیاں بیت جاتے ہیں دبے پانو
مگر ، ہوتا ہے کوئی ایک لمحہ رہنے والا

اک ایسی عرصہ گاہِ سخت ہے دُنیا کہ اس میں
وہی زندہ رہے گا جو ہے زندہ رہنے والا

ظفرؔ ، رہتے تو ہیں ہم اس ہجومِ رنگ و بُو میں
مگر ، ہم میں نہیں کوئی سلیقہ رہنے والا

☆

تمھارے پرس میں رکھا نہ اُس کی جیب میں ڈالا
کسی نے خواب دُنیا بس ہماری جیب میں ڈالا

سو، اتنی بھیڑ میں اچھا نہیں لگتا تھا ویسے بھی
سو، لے کر بوسہ اُس سے ہم نے خالی جیب میں ڈالا

اب اتنی آرزو دل میں سما سکتی بھی تھی کیوں کر
بڑا انعام تھا جو سب سے چھوٹی جیب میں ڈالا

وہاں پر ہوش تھا کس کو جو رخصت ہو رہے تھے ہم
نکالا کچھ وہاں سے یا تمھاری جیب میں ڈالا

مِلا ہے جو بھی کچھ مالِ غنیمت، چھوڑیے اُس کو
وہ اگلی جیب میں اُڑسا کہ پچھلی جیب میں ڈالا

نہیں معلوم ساری جمع پونجی کیا ہوئی آخر
کہ جو کچھ تھا اُسی سوراخ والی جیب میں ڈالا

یہ جا پہنچا ہے جانے دوسری میں کس طرح خود ہی
کہ جتنے سوچ کا مَیں نے تو پہلی جیب میں ڈالا

کسی بس کا ٹکٹ، بجلی کا بل، اور، اسپرو نکلے
جو ڈالا بھی تو ہم نے ہاتھ کیسی جیب میں ڈالا

ظفر، رختِ سفر کچھ بھی نہ تھا جس کی جگہ ہم نے
خدا کا ایک ٹکڑا آخر اپنی جیب میں ڈالا

☆

یہ اپنی ذات بھی اپنا تماشا خود بناتی ہے
محبت کی طرح نفرت بھی رستا خود بناتی ہے

یہ اپنا تانا بانا بُنتی رہتی ہے الگ سب سے
دلوں میں خواہشِ وصل اپنی دُنیا خود بناتی ہے

مرے کمزور پیکر میں توانائی ہے کچھ ایسی
مَیں جیسا ہو نہیں سکتا ہوں، ویسا خود بناتی ہے

جب اُکتا دینے والا ہو بہت ٹھہرا ہُوا موسم
ہوا چلتی ہے، اور، اُس کو گوارا خود بناتی ہے

دل حیرت زدہ دیکھا ہی کرتا ہے خوشی سے
کسی کی آرزو اِس میں گھر اپنا خود بناتی ہے

کسی طوفان کی صورت اُترتی ہے وہ شام اکثر
جو مجھ کو توڑتی ہے، اور، دوبارہ خود بناتی ہے

کوئی چہرہ ہے جس کی روشنی دیوار ہستی سے
گزرنا چاہتی ہے جب، دریچہ خود بناتی ہے

لہو میں رابطے کی ایسی اک زنجیر بھی ہے جو
کنارے ڈھونڈتی ہے، اور، دریا خود بناتی ہے

اک ایسی نیند کے نرغے میں رہتا ہوں، ظفر، اکثر
مری آنکھوں میں جو خواب زلیخا خود بناتی ہے

☆

شناسائی بہت ہے ، آشنائی چاہتا ہوں
وہاں پہنچا ہُوا ہُوں ، اور ، رسائی چاہتا ہوں

کہیں اُس کے بدن کا جال میرا منتظر ہے
مَیں اپنی قید سے خود ہی رہائی چاہتا ہوں

نہیں ہرگز کسی کی اور گنجایش یہاں پر
وہیں ، جیسے بھی ہو ، اپنی سمائی چاہتا ہوں

محبت ہوں ، مرا عنوان ہونا چاہیے تھا
کتابِ خواب ہُوں مَیں ، رُونمائی چاہتا ہوں

کسی کی حکمرانی ہر طرف تسلیم ، لیکن
مَیں اپنی بھی کہیں فرماں روائی چاہتا ہوں

ملاقات اس لیے بے حد ضروری ہے کہ اب مَیں
ذرا لمبی ہی مُدت کی جُدائی چاہتا ہوں

یہاں مُجھ سے بھی پہلے جانتے ہیں لوگ سارے
وہی اک بات جو سب سے چھپائی چاہتا ہوں

مری گُم کردہ راہی عام ہونے کو ہے اک دن
یہ مذہب ہے تو اس کی پیشوائی چاہتا ہوں

ظفر ، اپنی بُرائی بے سبب کرتا نہیں مَیں
کُچھ اس میں اہلِ دُنیا کی بھلائی چاہتا ہوں

☆

اندر تو جھانک بیٹھے ہیں ، باہر بھی دیکھیے
اُس کو کُچھ اُس کی راہ سے ہٹ کر بھی دیکھیے

مایُوس ہو کے لوٹ بھی آئے تو ہیں ، مگر
دیوار میں بنائے ہُوئے در بھی دیکھیے

پانی کا ڈر نہ تھا ، کوئی جلدی تھی ، ورنہ ہم
ساحل تو دیکھ آئے ، سمندر بھی دیکھیے

باہر تو اک ہجوم تھا ابر و غبار کا
یعنی فصیلِ خواب کے اندر بھی دیکھیے

دیتا ہے وہ دکھائی کہیں دوسری ہی بار
دیکھا تھا ایک بار ، مکرر بھی دیکھیے

کھلتے تھے اپنے عیب و ہنر سب پہ صاف صاف
چاہے وہ میری سمت گھڑی بھر ہی دیکھیے

تحریر سے مٹے ہوئے معنی کے ساتھ ساتھ
تصویر میں بُجھا ہُوا منظر بھی دیکھیے

رہتا ہوں کیوں کہ اُس کے دلِ سنگ سنگ میں
یاران غار آ کے مرا گھر بھی دیکھیے

دیکھا ہے جو بھی ، میرے پس و پیش تھا ، ظفر
ہے کون کون میرے برابر بھی دیکھیے

☆

محبت ہو چکی تھی مبتلا ہونے سے پہلے ہی
سو، آخر میں الگ تھے ہم، جُدا ہونے سے پہلے ہی

وہ خوابِ زرگری جیسا بھی تھا، دیکھا بہت، لیکن
اُڑی ہے راکھ اپنی کیمیا ہونے سے پہلے ہی

ہماری عاجزی ہو اِس سے بڑھ کر اور کیا آخر
کہ ہم تو مِٹ گئے ہیں نقشِ پا ہونے سے پہلے ہی

سمٹنے کی کوئی تدبیر لائیں اب کہاں سے ہم
کہ یہ تو سوچنا تھا جابجا ہونے سے پہلے ہی

کئی دن سے وہاں ماحول ہی کچھ اور تھا اُس کا
خبر تھی مجھ کو اُس کے بے وفا ہونے سے پہلے ہی

یہ عالم ہے اگر تو اور کیا درکار ہے ہم کو
کہ رونق لگ رہی ہے ماجرا ہونے سے پہلے ہی

نکل تو آئی اُس کی شکل کافی دیر میں، لیکن
مجھے اچھا لگا وہ خوشنما ہونے سے پہلے ہی

کسی کا دخل کیا اِس میں، مری قسمت ہی ایسی تھی
کہ مَیں بدنام ہو جاؤں بُرا ہونے سے پہلے ہی

ظفر، اِس کارِ دُنیا میں ہماری انتہا یہ ہے
کہ ہم پکڑے گئے ہیں ابتدا ہونے سے پہلے ہی

☆

ہو ہی جائے تو نہیں لے یہ نہیں ہو سکتی
ہونے والی ہے محبت جو نہیں ہو سکتی

کچھ تو ہوتا ہی مرے سیر سپاٹے کے لیے
آسماں ہو نہ سکا تھا تو زمیں ہو سکتی

اک جہاں تھا کہ مرے پیشِ نظر رہ سکتا
اک جگہ تھی کہ مرا سنگِ جبیں ہو سکتی

آئنہ عکس کو تصویر اگر کر سکتا
آرزو دل میں اگر گوشہ نشیں ہو سکتی

وہ جو تصویر تھی دیوارِ ہوا پر تحریر
دور رہتے ہوئے بھی میرے قریں ہو سکتی

اور اِمکاں جو نہیں تھا تو کم از کم دُنیا
مَیں جہاں ہو نہیں سکتا یہ وہیں ہو سکتی

جو اُسے پاس بٹھانے کے لیے تھی درکار
خاک اُتنی ہی مرے زیرِ نگیں ہو سکتی

اُس پری کے لیے آزاد فضا تھی لازم
اِس دلِ تنگ میں کیسے وہ مکیں ہو سکتی

موسمِ خواب کی جو بارشِ اوّل تھی، ظفر
اُس کو ہونا ہی اگر تھا تو یہیں ہو سکتی

☆

پیشانی سے باہر، کبھی اندر مجھے دیکھے
ممکن ہی نہیں ہے وہ برابر مجھے دیکھے

ہو جائے کبھی رات مرے دم سے بھی روشن
وہ شمعِ تماشا جو گھڑی بھر مجھے دیکھے

میں خود میں تو موجود ہی مشکل سے رہوں گا
ہر دیکھنے والا مرے باہر مجھے دیکھے

ڈھونڈے کوئی مجھ کو تو اسی خاکِ ہوس میں
یا سلسلۂ سیلِ ہوا پر مجھے دیکھے

ماحول ہی کچھ ہو چمن خواب کا ایسا
بلبل مجھے سمجھے تو گلِ تر مجھے دیکھے

اب دیکھنا ہی شرط یہ ٹھہری ہے کہ یُوں ہو
میں منظرِ نایاب کو، منظر مجھے دیکھے

دریا کی پذیرائی میں شک تو نہیں، لیکن
اک لہر ہو ایسی بھی کہ اُٹھ کر مجھے دیکھے

میں بارِ دگر ہی کہیں آتا ہوں سمجھ میں
جو دیکھنا چاہے، سو، مکرر مجھے دیکھے

میرا نظر آتا ہے، ظفر، بات ہی کچھ اور
جو دیکھ نہیں سکتا وہ اکثر مجھے دیکھے

☆

بظاہر تو کبھی کچھ مبتلا رہنے سے ہو گا
مگر، اب کے گزارہ ہی جدا رہنے سے ہو گا

فوائد بھی بہت ممکن ہے کچھ ہو جائیں حاصل
بہت نقصان بھی اُس کے خفا رہنے سے ہو گا

یہ دُنیا اور بھی ہو جائے گی کچھ خوب صورت
مگر، ایسا تمھارے خوش نما رہنے سے ہو گا

تمھارے چاہنے والوں پہ، خود ہی سوچ لو تم
اثر کیا کچھ تمھارے جابجا رہنے سے ہو گا

مری جانب بھی ہو سکتا ہے، دھیان اُس کا بہرطور
مگر کچھ دن یہ ہنگامہ بپا رہنے سے ہو گا

پتنگ آسا اُڑا پھرتا ہوں، لیکن جانتا ہوں
کہ یہ ممکن ہی پابندِ ہوا رہنے سے ہو گا

جو خاکِ دل کا سونے میں بدل جانا ہے ممکن
تو ہاتھوں میں کمالِ کیمیا رہنے سے ہو گا

اسے روکے ہوئے ہوں دیر سے اندر ہی اندر
کہ نغمہ اصل نغمہ اَن سُنا رہنے سے ہو گا

ظفر، اس عمر میں دیوار کیا پھاندیں گے اب ہم
کہ اب تو کام دروازہ کھلا رہنے سے ہو گا

☆

اگر بھی ترے آزار سے نکلتا ہوں
تو اپنے دائرۂ کار سے نکلتا ہوں

ہوائے تازہ ہوں، رُکتا نہیں کہیں بھی مجھے
گھروں میں گھستا ہوں، اشجار سے نکلتا ہوں

کبھی ہے اُس کے مضافات میں خبر میری
کبھی مَیں اپنے ہی آثار سے نکلتا ہوں

مَیں گھر میں ہو نہیں سکتا تو گھاس کی صورت
دریچہ و در و دیوار سے نکلتا ہوں

اسی کنارۂ دریائے ذات پہ ہر دم
غروب ہوتا ہوں، اُس پار سے نکلتا ہوں

وداع کرتی ہے روزانہ زندگی مجھ کو
مَیں روز موت کے منجدھار سے نکلتا ہوں

رُکا ہُوا کوئی سیلاب ہوں طبیعت کا
ہمیشہ تُندیٔ رفتار سے نکلتا ہوں

اِسے بھی کچھ مری ہمت ہی جانیے جو کبھی
خیال و خواب کے انبار سے نکلتا ہوں

لباس بیچتا ہوں جا کے پہلے اپنا، ظفر
جو کچھ خرید کے بازار سے نکلتا ہوں

☆

یہ بھی ہے دن ہی کے ہنگامہ، حالات کا وقت
رات کا وقت بھی ہوتا نہیں اب رات کا وقت

جب بھی ہو جائے محبت کی مصیبت نازل
کوئی ہوتا نہیں اس طرح کی آفات کا وقت

اپنے اندر ہی گرا کرتے ہیں آنسو اکثر
جانے کب آ کے گزر جاتا ہے برسات کا وقت

عرضِ غم ہم تو ہمیشہ ہی کیا کرتے ہیں
خاص ہوتا ہے، مگر، اُس کی عنایات کا وقت

پوچھتا بھی رہے، دیں گے ہی نہیں اُس کو جواب
کام کے وقت میں شامل جو نہیں بات کا وقت

دوسروں کا ہی اگر رزق یہاں کھانا ہے
تو ہے اپنے لیے ہر وقت مدارات کا وقت

یہ بھی ممکن ہے کہ انصاف کبھی کا ہو جائے
آ بھی سکتا ہے کبھی سارے حسابات کا وقت

اپنی قدرت میں ہے سو طرح کی مہلت اب بھی
اپنی تحویل میں ہے ساری خرافات کا وقت

ہوئے اس طرح سے مصروفِ محبت کہ ظفر
دے نہیں سکتے ہیں اُس کو بھی ملاقات کا وقت

☆

ہمیں اُدھر کبھی ہونا نہیں، جدھر کوئی ہے
ہم اپنے گھر میں نہیں، اور، ہمارے گھر کوئی ہے

یہ کس طرح کی محبت ہے، کچھ نہیں معلوم
کہ ہم سفر تو نہیں، شاملِ سفر کوئی ہے

میں اُس کے ہونے کے آثار دیکھتا ہوں بہت
فلک پہ ہو کہ نہ ہو، اس زمین پر کوئی ہے

مرے وجود کے اندر ہی تھا اگر کوئی تھا
مرے وجود سے باہر نہیں، اگر کوئی ہے

جو وہ نہیں تو کوئی ہے ضرور، اُس جیسا
کہ ہو بہو جو نہیں بھی تو سربسر کوئی ہے

میں خود نہیں ہوں تو پھر اس سے کیا غرض مجھ کو
کہ اس نواح میں کیا، کون، کب، کدھر کوئی ہے

ہر ایک چیز فراواں ہے دہر میں، لیکن
کچھ ایسے لگتا ہے پھر بھی، کہیں کسر کوئی ہے

اُبھرتا ڈوبتا رہتا ہوں روز ہی جس میں
مرے لہو میں کچھ ایسا ہی اک بھنور کوئی ہے

کبھی ملے ہیں نہ دیکھا ہے شہر میں اُس کو
سنا ہے اس کے مضافات میں ظفر کوئی ہے

☆

کچھ ایسے لگتا ہے باہر بھی اپنا گھر کوئی تھا
ہمارے ساتھ جو ایک اور دربدر کوئی تھا

نہ راستہ تھا وہاں اور نہ سمت ہی تھی کوئی
مگر، مجھے یہ گماں ہے کہ وہ سفر کوئی تھا

وہ ایک شک تھا جو دل سے نکل چکا تھا، مگر
کچھ اُس کی طرح کا مجھ پر ابھی اثر کوئی تھا

مجھے اُسی نے اندھیرے میں کر دیا قائم
جو میرے چاروں طرف، اور، دل میں ڈر کوئی تھا

نہیں تھا وہ تو دکھائی نہیں دیا ہے مجھے
اسی نواح میں ہوتا کوئی اگر کوئی تھا

مرے علاوہ بھی اس کائنات میں کسی وقت
مجھے یقیں تو نہیں آ رہا، مگر، کوئی تھا

مجھے بھی یاد ہے، بھولے نہیں ستارے بھی
جو ایک شام تھی، اور، سامنے شجر کوئی تھا

رہی نہ تھی وہاں میری بھی کوئی گنجائش
مکانِ تنگ میں اُس رات اس قدر کوئی تھا

کئی زمانوں سے وہ بھی نہیں رہا ہے، ظفر
جو اپنے ہاتھ میں تھوڑا بہت ہنر کوئی تھا

☆

سلامت واپس آیا ہی نہیں گھر جانے والا
سو، باہر بھی نہیں ہے کوئی اندر جانے والا

کیے بیٹھے ہیں سمجھوتا سا اُس کے ساتھ بھی اب
نہیں ہے اور ابھی کچھ دن جو منظر جانے والا

یہی دیوار سے کودا تھا پچھلی رات یک دم
سحر ہوتے ہی دروازے سے باہر جانے والا

تجاویز اور منصوبے ہی دیتے ہیں یہاں سب
وہ کوئی اور ہو گا کام یہ کر جانے والا

یہ دُنیادار تُجھ کو دیکھ کر جیتے کہاں تک
وہی زندہ ہے تیرے نام پر مر جانے والا

کوئی خواب خطر میں پانو ہی دھرتا نہیں ہے
ابھی آ جائے گا وہ بارِ دیگر جانے والا

بیانِ حال اُسی کو زیب دیتا ہے سراسر
جو اُس باغِ تماشا میں ہے اکثر جانے والا

پریشاں ہوں کہ آگے کوئی کب نکلے گا مجھ سے
ابھی تک تو نہیں کوئی برابر جانے والا

ظفر، مجھ کو ہراساں کر رہے ہیں ٹھیک ہی وہ
بچا ہوں ایک میں ہی شہر میں ڈر جانے والا

☆

دو گھڑی کے لیے چلتے ہیں، ٹھہرتے ہیں کہیں
عشق ممکن نہیں، کچھ اور ہی کرتے ہیں کہیں

اِن زمینوں کو ہے درکار کوئی رنگ نیا
جابجا ٹوٹتے ہیں، اور، بکھرتے ہیں کہیں

یہ سیاہی تو نہیں دل کا مقدر یکسر
اِن اندھیروں میں ستارے بھی اُترتے ہیں کہیں

فرق ہوتا ہے کوئی آب و ہوا کا بھی ضرور
کہ یہی مٹتے ہوئے نقش بکھرتے ہیں کہیں

کیا کہیں، صورتِ احوال ہی ایسی ہے کہ ہم
بات کرتے ہیں کہیں، اور، مکرتے ہیں کہیں

کوئی اصلاح کی صورت ہے تو اب تم ہی کہو
خود بگاڑے ہوئے بھی کام سنورتے ہیں کہیں

یہ سفر وہ ہے کہ جس میں کئی چہرے، کئی نام
یاد آتے ہیں کہیں، اور، بسرتے ہیں کہیں

درمیاں کی کسی حالت میں پڑے ہیں، دیکھو
ایک مدت ہوئی، جیتے ہیں نہ مرتے ہیں کہیں

باہر آتے نہیں دریائے محبت سے، ظفر
ڈوب جاتے ہیں کہیں، جا کے اُبھرتے ہیں کہیں

☆

تھا خواب تو کیا خواب نما کرتے رہے ہم
وہ قید ہی کب تھا کہ رہا کرتے رہے ہم

رشتہ کبھی تھا ہی نہ بنا اُس سے ہمارا
اپنا کوئی ہوتا تو خفا کرتے رہے ہم

وہ آپ تو باہر تھا زمانے کی حدوں سے
ہوتا جو پُرانا تو نیا کرتے رہے ہم

وہ قول نہیں تھا کبھی کرتے عمل اُس پر
وہ قرض نہیں تھا کہ ادا کرتے رہے ہم

مصروف کہیں اور ہی رہتا تھا زیادہ
جا کر بھی وہاں خاک مِلا کرتے رہے ہم

مصرف کہیں تھا ہی نہیں اس طرح سے اُس کا
لوگوں میں وہ چلتا بھی تو کیا کرتے رہے ہم

چھایا ہُوا ہوتا وہ کوئی ہجر کا موسم
پھر وصل کے موسم کی ہوا کرتے رہے ہم

بارش کی وہ تھی دُور سے آتی ہُوئی آواز
کافی تھا بس اِتنا کہ سُنا کرتے رہے ہم

ہم سے تو وہ پہلے ہی الگ تھا، ظفر، اِتنا
بتلائیے کیا اور جُدا کرتے رہے ہم

☆

جیسا وہ سمجھتے ہیں ویسا بھی نہیں ہوں میں
جتنا نظر آتا ہوں اُتنا بھی نہیں ہوں میں

کرتے ہیں غلط مجھ کو مشہور بُرا، لیکن
حق بات یہی کچھ ہے، اچھا بھی نہیں ہوں میں

دیکھیں وہ اگر مجھ کو کچھ ٹھیک طرح سے بھی
سیدھا نہ سہی، لیکن، اُلٹا بھی نہیں ہوں میں

اب کیوں مرے پیچھے ہیں یہ لوگ، وہاں اب تو
جاتا بھی نہیں ہوں میں، آتا بھی نہیں ہوں میں

آتا ہے نظر مجھ کو، سُنتا ہوں سبھی باتیں
اندھا تو نہیں ہوں میں، بہرا بھی نہیں ہوں میں

دیکھو تو سہی مجھ کو، پرکھو تو کبھی مجھ کو
کام آ نہ سکوں کچھ بھی، ایسا بھی نہیں ہوں میں

انکار ہی کر دے گا، لے جائے گا کیا اپنا
جو بات ہے کہنے کی، کہتا بھی نہیں ہوں میں

بکھرا کے اُڑا لائی پھر کوئی ہوا مجھ کو
گرجا بھی نہیں تھا اور، برسا بھی نہیں ہوں میں

ہے شخص، ظفر شاید ایک اور زمانے کا
یہ سچ بھی نہ ہو، لیکن، جھوٹا بھی نہیں ہوں میں

☆

جھوٹا ہے نہ سچا ہے تو ہے اور بھی اچھا
اک طرفہ تماشا ہے تو ہے اور بھی اچھا

ملتے ہیں جو ہم اتنی مروّت سے تو اُس کو
وہ عشق سمجھتا ہے تو ہے اور بھی اچھا

اچھا ہے جو وہ ساتھ ہمارے تو بہت خوب
سب کے لیے اچھا ہے تو ہے اور بھی اچھا

کچھ اور تھے ہم، اور، ہمارے لیے اُس نے
کچھ اور ہی سوچا ہے، تو ہے اور بھی اچھا

ملتی ہے بہت شکل کسی اور سے اُس کی
اچھا ہمیں لگتا ہے تو ہے اور بھی اچھا

کافی ہیں، بُرا ہم کو جو کہتے ہیں، مگر، وہ
اچھا ہمیں کہتا ہے تو ہے اور بھی اچھا

اچھا تھا کبھی اُس سے جو ہوتی تھی ملاقات
اور، اب نہیں ملتا ہے تو ہے اور بھی اچھا

بھاگے ہیں جو ہم، اس سے تو بہتر تھا، بہرطور
اُس نے ہمیں چھوڑا ہے تو ہے اور بھی اچھا

صحرا سے سلامت نکل آئے ہیں ظفر، ہم
اب سامنے دریا ہے تو ہے اور بھی اچھا

☆

چیزوں کو درمیاں سے ہٹایا ہوا نہیں
کچھ دل میں یہ خیال ابھی آیا ہوا نہیں

کرنے کے سارے کام مجھے یاد ہیں، مگر
اچھی طرح سے اُس کو بھلایا ہوا نہیں

دیوارِ دل پہ جانے یہ تحریر کس کی ہے
یہ اشتہار میرا لگایا ہوا نہیں

بارش ابھی ہے دُور بیابانِ خواب سے
بادل تو ہے، مگر، ابھی چھایا ہوا نہیں

یہ خاک ابھی کسی نے اُڑائی نہیں ہوئی
پانی ابھی یہاں سے بہایا ہوا نہیں

اک نقش ہے کہ جس کو بنایا نہیں گیا
اک نغمہ وہ بھی ہے جو سُنایا ہوا نہیں

تھوڑا تھا یا زیادہ، کمایا تھا جو کبھی
اپنے لیے تو کچھ بھی بچایا ہوا نہیں

میرے ہی ذمّے ڈال دیا اہلِ شہر نے
سیلاب وہ بھی جو مرا لایا ہوا نہیں

ایسے ہے جیسے کچھ تھکن اُس کی بھی ہے ظفر
جو بوجھ میں نے سر پہ اُٹھایا ہوا نہیں

☆

پرندوں، بادلوں کا ساتھ مِل کر ایک ہونا
زمین و آسماں کا میرے اندر ایک ہونا

غبار آلود ہوتے ہیں یہ صبح و شام، لیکن
ضروری بھی نہیں دونوں کا منظر ایک ہونا

دھنسے رہنا کئی چیزوں کا وہ اک دوسری میں
جُدا ہونے کے لمحے تک برابر ایک ہونا

جو اپنے آپ میں ہی ایک رہنا چاہتا ہو
اُسے ہونا پڑے خُود سے جو باہر ایک ہونا

بکھر جانا ہوا کے دشت و در میں دور تک وہ
جہاں سے واپس آ کر بارِ دیگر ایک ہونا

ستارہ بُجھ گیا جب ٹُوٹ کر ان وسعتوں میں
تو چاہیں گے سفینہ، اور، سمندر ایک ہونا

محبت ہی نہ ہوتی اس قدر وارفتگی سے
اگر تھا ہی نہیں اپنا مُقدر ایک ہونا

اب آگے اور مُشکل ہونے والا ہے یہ موسم
جو سمجھو تو غنیمت ہے یہ دم بھر ایک ہونا

مرے جیسے، ظفر، کچھ اور ہونا چاہییں تھے
مُناسب ہی نہ تھا میرا سراسر ایک ہونا

☆

بے تعلق رکا ہوا ہے، روانی بنائے گا
یُوں خُود ہی اپنا راستہ پانی بنائے گا

پُھونکے گا ایک روح نئی مجھ میں خوابِ عشق
اور، وصلِ جاوداں مجھے فانی بنائے گا

اس عمر میں بھی وہ مری موجِ صدا کے تئیں
آوازِ بازگشت جوانی بنائے گا

پہلے بنائے گا مرے خاشاک سے مجھے
پھر، اُس کے بعد وہ مرا ثانی بنائے گا

اوروں کے روز و شب جو سجاتا ہے، ایک دن
میری بھی کوئی شام سُہانی بنائے گا

پہلے تو جو کیا وہ بہانہ تھا مختلف
اس بار کوئی اور کہانی بنائے گا

جتنا بھی لاتعلق اگر آج ہے، وہ کل
میرے نشاں کو اپنی نشانی بنائے گا

آزاد ہو کے سلسلۂ صرف و نحو سے
اب لفظ آپ اپنے معانی بنائے گا

لکھنے کی حاصل اُس کو مہارت بھی ہے، ظفر
لیکن وہ سب حساب زبانی بنائے گا

☆

میں حسن کے حالات سے غافل بھی نہیں تھا
اور قافلہء شوق میں شامل بھی نہیں تھا

اُس دائرۂ خوابِ تمنّا سے نکلنا
آساں جو نہ تھا اتنا تو مُشکل بھی نہیں تھا

کچھ اُس کی بھی دلچسپیاں تھیں اور کسی میں
کچھ اُس کی طرف میں ابھی مائل بھی نہیں تھا

کچھ ہاتھ سے دیتے بھی تو احسان جتا کر
اچھا ہے کہ میں آپ کا سائل بھی نہیں تھا

تعمیر کیے بیٹھا ہوں جس پر یہ عمارت
وہ حق تو ابھی تک مجھے حاصل بھی نہیں تھا

اب دیتا ہوں جس کے لیے بڑھ چڑھ کے دلائل
اُس بات کا میں آپ تو قائل بھی نہیں تھا

اپنے ہی کنارے پہ کھڑا تھا میں پریشاں
دُنیا جو نہیں تھی تو کہیں دل بھی نہیں تھا

ڈوبے جو سفینے ، ابھی اُترے بھی نہیں تھے
ٹوٹا جو ستارہ ، ابھی جھلمل بھی نہیں تھا

پانی تھا ظفرؔ ، چاروں طرف ، اور ، وہاں پر
دریا بھی نہیں تھا ، کوئی ساحل بھی نہیں تھا

-☆-

کرتا رہے ، انکار سے بھی کچھ نہیں ہوتا
اب اپنی راہ کی دیوار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

جو ہونا ہو تو ہو جاتا ہے اُس سے دُور رہ کر بھی
نہیں ہوتا تو پھر دیدار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

چھپا رکھا ہے دل میں راز کی صورت محبت کو
کہ ان حالات میں اظہار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

سفر ہونا ہے جب اک دائرے میں ہی بہرصورت
تو پھر اے جانِ جاں ، رفتار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

یہ ایسی رات ہے سارے بدن کو جاگتا رکھیے
کہ تنہا اک دلِ بیدار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

بج اُٹھتے ہیں کہیں پر کان اپنے آپ ہی اپنے
کہیں زنجیر کی جھنکار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

ہماری بے حسی کا رفتہ رفتہ اب یہ عالم ہے
کہ اب ہم پر خدا کی مار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

بس اب تو شاعری میں گھاس ہی کاٹا کریں گے ہم
رہا معیار ، تو معیار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

ظفرؔ ، سودا سخن کا روز بچ رہتا ہے خوانچے میں
کہ اب تو گرمیِ بازار سے بھی کچھ نہیں ہوتا

-☆-

کچھ ہے بھی سہی ، لیکن ، اتنا تو نہیں سب کچھ
جو آپ نے سمجھا ہے ایسا تو نہیں سب کچھ

اسباب ہیں دُنیا میں کچھ اور بھی پانی کے
پیاسا ہُوں بہت ، لیکن ، دریا تو نہیں سب کچھ

اِس دل کے اندھیروں میں ایک اور زمانہ ہے
دُنیا کے علاوہ بھی ، دُنیا تو نہیں ہے سب کچھ

اُس باغ تماشا سے گزرے تھے ، مگر ، ہم نے
چھوا تو نہیں کچھ بھی ، دیکھا تو نہیں سب کچھ

کچھ اور بھی ہوتا ہے وا اُس نے کسی لمحے
اِس شام کی حیرت میں چمکا تو نہیں سب کچھ

کرتے ہیں کہیں سے ہم پیدا بھی کئی چیزیں
اِس ظاہر و باطن میں ہوتا تو نہیں سب کچھ

جب خاک اُڑانا ہی تقدیر میں ہے اپنی
گھر میں ہی اُڑا لیں گے ، صحرا تو نہیں سب کچھ

کچھ خواب نُما منظر اندر سے دکھاتے ہیں
ظاہر ہے کہ یہ ہم پر اُترا تو نہیں سب کچھ

کچھ آپ کا پردہ ہی رکھتا ہے ، ظفر ، پھر بھی
سہتا ہے بھی ، لیکن ، کہتا تو نہیں سب کچھ

-☆-

آتا نہیں کوئی ، کہیں جاتا نہیں کوئی
سر پہ یہ بارِ خواب اُٹھاتا نہیں کوئی

اُس کی خبر ہو اتنے اندھیرے میں کیا مجھے
جب تک کہ اپنا آپ سُجھاتا نہیں کوئی

اندر بھی دائرے کے ہُوں ، باہر بھی ، کیا بتاؤں
میرے علاوہ مجھ کو بتاتا نہیں کوئی

یُوں زندگی گزارتے ہیں کس طرح یہ لوگ
روتا نہیں کوئی ، یہاں گاتا نہیں کوئی

اپنا ہی کارنامہ ہے یہ ورنہ اِس طرح
جو خود بنائی ہو ، اُسے ڈھاتا نہیں کوئی

تاریخ کرتی رہتی ہے ہر کام ، ورنہ آپ
اپنے لکھے ہُوئے کو مٹاتا نہیں کوئی

آمادہ میرے ساتھ بھی چلنے پہ کب ہیں لوگ
اور ، مجھ کو راہ سے بھی ہٹاتا نہیں کوئی

پھر بھی کسی کو راس نہیں چادرِ ہُنر
یہ اوڑھتا نہیں کہ بچھاتا نہیں کوئی

رکھتے ہیں واپسی کا کوئی راستہ ، ظفر
اِس طرح کشتیاں تو جلاتا نہیں کوئی

-☆-

نہ مکاں رہنے دیا ہے نہ مکیں رہنے دیا
راستہ کوئی کُھلا ہم نے نہیں رہنے دیا

اُس نے ٹکڑوں میں بکھیرا ہُوا تھا مُجھ کو جہاں
جا اُٹھایا ہے کہیں سے تو کہیں رہنے دیا

سج رہے تھے یہ شب و روز کُچھ ایسے تُجھ سے
ہم کو دُنیا ہی پسند آ گئی ، وہیں رہنے دیا

خُود تو باغی ہُوئے ہم تُجھ سے ، مگر ، ساتھ ہی ساتھ
دلِ رُسوا کو ترے زیرِ نگیں رہنے دیا

جا بجا اِس میں بھی تیرے ہی نشاں تھے شامل
ہم نے اِک نقش اگر اپنے تئیں رہنے دیا

اک خبر تھی جسے ظاہر نہ کیا ہم نے کبھی
اک خزانہ تھا جسے زیرِ زمیں رہنے دیا

خُود تو باہر ہوئے ہم خانۂ دل سے ، لیکن
وہ کسی خواب میں تھا ، اُس کو یہیں رہنے دیا

آسماں سے کبھی ہم نے بھی اُتارا نہ اُسے
اور ، اُس نے بھی ہمیں خاک نشیں رہنے دیا

ہم نے چھیڑا نہیں اشیائے محبت کو ، ظفرؔ
جو جہاں پر تھی پڑی ، اُس کو وہیں رہنے دیا

☆

اس کو آنکھوں میں لہو بنا دیا ہے
اور ، بار دگر بنا دیا ہے

دستکِ خواب ہے مری ایجاد
اور ، اِسے دربدر بنا دیا ہے

سنسنی کیوں نہ پھیلتی ہر سُو
خامشی کو خبر بنا دیا ہے

ہُوں جو آمادۂ سفر پھر سے
خُود کو رختِ سفر بنا دیا ہے

خاک پر گردباد ، اور ، مُجھ کو
پانیوں میں بھنور بنا دیا ہے

پُھول پھل سے غرض نہیں ، لیکن
شاعری کو شجر بنا دیا ہے

آسماں دُوسری طرف سے بھی
اک ذرا گُھوم کر بنا دیا ہے

کُچھ ارادہ نہ تھا بنانے کا
رُکتے رُکتے ، مگر ، بنا دیا ہے

کیا زبردست آدمی ہو ، ظفرؔ
عیب کو بھی ہنر بنا دیا ہے

☆

دھیان جس کا ہے ابھی ایک زمانے کی طرف
کبھی نکلے گا مرے خواب میں آنے کی طرف

نہ کبھی مجھ کو ملا اُس کی محبت کا سُراغ
نہ کہیں وہ بھی ہُوا بات بتانے کی طرف

کیا اب تک تو بغیر اُس کے گزارہ، لیکن
آئے ہیں آج اُسے ڈھونڈ کے لانے کی طرف

اہلِ الفت سے الگ اہلِ غرض تھے، کہ یہاں
کوئی کھونے کی طرف تھا، کوئی پانے کی طرف

جان پر کھیل بھی سکتا ہُوں کسی دن، یعنی
جا بھی سکتا ہُوں اُسے ہاتھ لگانے کی طرف

اب تو میں چاہے جدھر سے بھی روانہ ہو جاؤں
راستے ہیں سبھی اُس شہر کو جانے کی طرف

مجھ میں جو پھول کھلا کرتا ہے اکثر، اُس کو
رہ گیا ہُوں کہیں لوگوں سے چھپانے کی طرف

آ رہا ہوں میں کسی منظرِ مستوری سے
جا رہا تھا کوئی تصویر دکھانے کی طرف

دشت میں دعوۂ دیوانگی سب کو تھا، ظفر
کوئی نکلا ہی نہیں خاک اُڑانے کی طرف

☆

یہی زمین بھی اور بھی، فضا کوئی اور
مری جگہ اسی خوابِ رواں میں تھا کوئی اور

مجھے بھی ساتھ اُڑا لے گئی ہے پتّوں کے
کچھ اب کے بارِ خزاں میں چلی ہوا کوئی اور

ابھی یہ ابر سا آتا ہے سایے کی خاطر
برائے بارش ابھی چھائے گی گھٹا کوئی اور

سُنا تو کرتا ہُوں، پہچانتا نہیں اُس کو
جو میرے کان میں پڑتی ہے اب صدا کوئی اور

ہمیشہ مجھ کو توقّع رہی کچھ اور کی، اور
ہمیشہ ہی نکل آیا مُعاملہ کوئی اور

محبت اُس کو کسی اور سے رہی کچھ دن
مُغالطے میں، مگر، کوئی دن رہا کوئی اور

اُسی جگہ پہ ہے جس کو جہاں نہ ہونا تھا
ہمارے پاس کوئی اور ہے، جُدا کوئی اور

جو پاس پاس بھی تھا، اور، دُور دُور بھی تھا
مرے بغیر کہیں تھا مرے سوا کوئی اور

جو کل کے واسطے محفوظ کر رکھا ہے، ظفر
چُنا تھا اپنے لیے میں نے راستہ کوئی اور

☆

نتیجہ کوئی تو اچھا بُرا نکل سکتا
جو درمیاں سے کوئی راستہ نکل سکتا

کچھ ایک دوسرے کے ہم قریب تو آتے
کم از کم اس سے کوئی فاصلہ نکل سکتا

نہیں تھی اتنی بھی وسعت یہاں کی گلیوں میں
کہ اس طرف سے مرا قافلہ نکل سکتا

اگرچہ سچ ہے کہ ہوتی نہ یوں پذیرائی
اگر مَیں تجھ سے الگ اور جُدا نکل سکتا

مجھے نمو کی اجازت اگر یہاں ہوتی
مَیں اپنی خاکِ طلب سے ہرا نکل سکتا

ہوا کچھ اور طرف کی بھی چاہیے تھی مجھے
یہاں جو کوئی دریچہ نیا نکل سکتا

مآلِ کار تو آنا تھا لوٹ کر مُجھ کو
جو اس ہُجوم سے باہر ذرا نکل سکتا

ہے اُس کے بعد وہی خامشی مرے ہر سمت
کہ شور شور ہی تھا، اُس سے کیا نکل سکتا

ظفرؔ، تھکی ہُوئی اس شاعری کی دلدل سے
جو مَیں نہیں تو کوئی دُوسرا نکل سکتا

☆

اُگتا ہے سبزہ یہاں بھی، کہیں دکھائی تو دے
مَیں کب سے ڈھونڈ رہا ہُوں، زمیں دکھائی تو دے

اسی نواح میں آباد ہے کوئی، لیکن
مکاں نظر میں تو آئے، مکیں دکھائی تو دے

دوبارہ ہونے لگی ہے محبت اُس سے اگر
تو پھر یہ سلسلہ واپسیں دکھائی تو دے

رہوں گا نغمہ و تصویر سے جُدا کب تک
مجھے سُنائی جو دیتا نہیں، دکھائی تو دے

لہو میں لوٹ سی مچتی ہے آئے دن، لیکن
کہاں سے ہوتی ہے یہ رہزنی، دکھائی تو دے

مَیں اپنے دل کی تلاشی تو لے چکا ہُوں، مگر
اگر وہ ہے بھی کہیں جاگزیں، دکھائی تو دے

کبھی کہیں تو کبھی ہے کہیں سُراغ اُس کا
جہاں وہ ہوتا ہے اک دن وہیں دکھائی تو دے

اُس اجنبی سے مرا سامنا تو ہو کسی دن
ہے میرے اندر اگر آدمی، دکھائی تو دے

مَیں آپ ابر کی صُورت ہُوں درمیاں میں، ظفرؔ
وگرنہ مجھ کو وہ ماہِ مُبیں دکھائی تو دے

☆

محبت کام ہے ایسا جسے باری سے کرتے ہیں
اور، اس کے ساتھ ہی کافی سمجھداری سے کرتے ہیں

عنایت اُس طرف سے بیش و کم ہوتی ہی رہتی ہے
سو، ہم تھوڑی سی کہ کر ابتدا ساری سے کرتے ہیں

گزر اس خواب زارِ وصل کے باغ تماشا سے
ہو آساں جس قدر اُتنا ہی دُشواری سے کرتے ہیں

تسلسل لازمی حصّہ ہے اپنے سارے کاموں کا
کہ اکثر کچھ نہ کرنا بھی لگاتاری سے کرتے ہیں

بھلے مانس ہیں، اور، گزران اپنی اس زمانے میں
کبھی چوری پہ ہوتی ہے، کبھی یاری سے کرتے ہیں

ہماری صحت اچھی کیوں نہیں ہو گی، اگر اپنی
شفا سے جنگ ہے، اور، صلح بیماری سے کرتے ہیں

کوئی ٹکڑا زمیں کا ہم فقیروں کو جو بھا جائے
تو پہلے قبضہ اُس پر چار دیواری سے کرتے ہیں

پرانے پیڑ سارے بیچ کھائے کاٹ کر ہم نے
سو، اس ہفتے کا آغاز اب شجر کاری سے کرتے ہیں

ظفرؔ، اس حال میں کچھ اور کرنے کے نہیں قابل
کہ ہم تو عشق بھی اپنی ہی لاچاری سے کرتے ہیں

☆

اپنے انکار کے برعکس برابر کوئی تھا
دل میں اک خواب تھا اور خواب کے اندر کوئی تھا

ہم پسینے میں شرابور تھے، اور، دُور کہیں
ایسے لگتا ہے کہیں تختِ ہوا پر کوئی تھا

اُس کے باغات پہ اُترا ہُوا تھا موسم رنگ
قابلِ دید ہر اک سمت سے منظر کوئی تھا

شک اگر تھا بھی تو مٹتا گیا ہوتے ہوتے
اور، اب پختہ یقیں ہے کہ سراسر کوئی تھا

اس دلِ تنگ میں کیا اُس کی رہائش ہوتی
یعنی اندر تو نہیں تھا، مرے باہر کوئی تھا

شکل کچھ یاد ہے، کچھ بھول چکی ہے اُس کی
کوئی دن تھے کہ مکمل مجھے ازبر کوئی تھا

دائرے میں کبھی رکھا ہی نہیں اُس نے قدم
اور محبت کے مضافات میں اکثر کوئی تھا

میں اُسے چھوڑ کے خود ہی چلا آیا تھا کبھی
اور، اب پوچھتا پھرتا ہوں مرا گھر کوئی تھا

یاوہ گو تھا، ظفرؔ، اس عہدِ خرابی میں کوئی
یاوہ گو ہی اُسے کہتے ہیں، سخنور کوئی تھا

☆

[illegible] اپنے پہ [illegible] اشارہ کوئی ہے
زیرِ غور اُس کے ابھی کام ہمارا کوئی ہے

اِس اندھیرے میں مُجھے راہ سُجھاتا نہیں کیوں
اس کی آنکھوں کے اُفق پر جو ستارہ کوئی ہے

جتنا پھیلاؤ ہے پانی کا مرے چاروں طرف
اُتنا ہی مُجھ کو یقیں ہے کہ کنارہ کوئی ہے

اپنی موجوں کے مُخالف ہی چلا ہے اکثر
میرے دریا میں کُچھ اس طرح کا دھارا کوئی ہے

ایک مُدّت سے جو سُنسان پڑی تھیں آنکھیں
اک مُسافر اِسی رستے سے گُزارا کوئی ہے

اپنی آواز ہی آئی ہے پلٹ کر ہر بار
اور، ہر بار یہ سمجھا ہُوں، پُکارا کوئی ہے

دُور تک دشت میں دیوار تو موجود نہیں
پھر بھی کیوں لگتا ہے ایسا کہ سہارا کوئی ہے

نصب ہیں میرے خیالات کے خیمے سے جہاں
اُن کے پہلو میں کہیں خواب تمھارا کوئی ہے

دل کو خالی تو کیا تھا بڑی مُشکل سے، ظفر
کئی راتوں سے، مگر، اس میں دوبارہ کوئی ہے

☆

ہمارے درمیاں جو گھٹتا بڑھتا فاصلہ ہے
سمجھ میں کُچھ نہیں آتا، یہ کیسا فاصلہ ہے

کوئی اندازہ ہوتا ہی نہیں اس کا کسی طور
کہ ہے بھی، اور نہیں بھی، کیا تماشا فاصلہ ہے

یہ ہم دونوں نے جیسے خُود ہی کر رکھا ہے پیدا
محبت کے اندھیروں میں ستارہ فاصلہ ہے

قریب آ کر ہی پا سکتے ہیں کُچھ اُس کا پتا ہم
کہ یہ یکلخت ہے یا رفتہ رفتہ فاصلہ ہے

کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے آپس میں کہ اب تو
ہمارا فاصلہ ہے، یا تُمھارا فاصلہ ہے

اسے تسخیر کر لیں گے تو پھر ہو گی مُلاقات
کہ میرے اور اُس میں ایک دُنیا فاصلہ ہے

بتا سکتا ہُوں اُس کو چُوم کر ہی میں کسی دن
کہ باقی جس قدر بھی میرا اُس کا فاصلہ ہے

تھکے ہارے کھڑے ہیں، اور، سب سے پُوچھتے ہیں
کہاں تک جائیں گے، اب اور کتنا فاصلہ ہے

ظفر، کارِ محبت میں کہاں کی سُرخروئی
کہ میں ہُوں، اور، وہ ہے، اور، سارا فاصلہ ہے

☆

مل کے دیکھے ہیں، جو خوابوں میں شراکت نہیں کی
اور کیا رشتہ ہو تُجھ سے جو محبت نہیں کی

یہیں پھرتے ہیں شریف آدمیوں کی صُورت
دشت میں خاک اُڑائی نہیں، وحشت نہیں کی

خاص ہم سے تو کوئی تھا ہی نہیں تیرا سلوک
اور، ہم نے بھی ترے ساتھ رعایت نہیں کی

پُوچھ لیتے کبھی تیرا بھی ارادہ تُجھ سے
ہم نے چاہا تو کئی بار تھا، ہمت نہیں کی

بہت اچھا بھی لگا تُو، ہمیں اُس محفل میں
ہم نے دانستہ وہاں تیری حمایت نہیں کی

ظرف اتنا بھی کشادہ نہیں اپنا، لیکن
ہم نے، پیدا بھی ہوئی ہے تو شکایت نہیں کی

یہ بھی سچ ہے کہ ترے ہم بھی سوالی نہ ہُوئے
اور، تُو نے بھی کبھی کوئی عنایت نہیں کی

ہو رہا ہے جو، اسی طرح سے ہونا تھا یہاں
اس لیے ہم نے کسی بات پہ حیرت نہیں کی

جو میسّر ہُوا، تھا وہ بھی زیادہ، کہ ظفر
جو مِلا ہی نہیں، اُس کی کبھی حسرت نہیں کی

☆☆

جیتے ہیں تیرے ساتھ نہ مرتے ہیں تیرے ساتھ
اک طرح سے گزارہ ہی کرتے ہیں تیرے ساتھ

آتے جہاں کہیں سے ہوں، جاتے کہیں نہیں
ایسے بھی راستوں سے گزرتے ہیں تیرے ساتھ

آخر میں جا نکلتے ہیں اک دُوسرے سے دُور
کن گہرے پانیوں میں اُترتے ہیں تیرے ساتھ

یہ آگ دو طرح کی ہے ٹھنڈی بھی، گرم بھی
جلتے ہیں تُجھ سے دُور، ٹھٹھرتے ہیں تیرے ساتھ

کن بادلوں میں اُڑتے اُلجھتے ہیں رات دن
کس گھاس پر سمٹتے بکھرتے ہیں تیرے ساتھ

دُنیا ہماری راہ میں پڑتی نہیں کہ تُو
دنیا ہے آپ، تجھ سے ہی ڈرتے ہیں تیرے ساتھ

اپنی تو کوئی شکل و شباہت نہیں رہی
ہم تو یہاں بگڑتے سنورتے ہیں تیرے ساتھ

ہم کو ہی آشنائی کا دعویٰ زیادہ ہے
ہم جو کبھی ملے ہیں نہ برتے ہیں تیرے ساتھ

کیسا یہ آنسوؤں کا سمندر ہے، اے ظفر
ہم جس میں ڈُوبتے نہ اُبھرتے ہیں تیرے ساتھ

☆☆

آنے کی دیر ہے بس جانے کی دیر ہے
میرے اور اُس میں ایک زمانے کی دیر ہے

اُترے گی یُوں تو شام کی اپنی بھی روشنی
فی الحال تو چراغ جلانے کی دیر ہے

ہر کام اُٹھا رکھا ہے کسی اور وقت پر
رونے کی دیر ہے کہیں گانے کی دیر ہے

مُجھ پر یہ آسمان و زمیں تنگ ہی سہی
میرے بھی ان سے جان چُھڑانے کی دیر ہے

کُچھ دُوسری طرف بھی نہ ہو گا اسی طرح
پردہ یہ درمیاں سے اُٹھانے کی دیر ہے

دل کی تو جیسے رُت ہی بدل جائے گی، اسے
چھوٹا سا کوئی خواب دکھانے کی دیر ہے

کُچھ بھی نہیں رہے گا یہاں پر مرے سوا
میرے کہیں وُجود میں آنے کی دیر ہے

سُست الوُجود وہ بھی ہے میری طرح بہت
جو دیر ہے سو ملنے ملانے کی دیر ہے

ہم خود ہی درمیاں سے نکل جائیں گے، ظفر
تھوڑا سا اُس کو راہ پہ لانے کی دیر ہے

☆

بھلے ہی اب تو پُرانی ہو یا نئی تحریر
مرے سیاہ کو روشن کرے کوئی تحریر

لکھے ہوئے سے وہ الفاظ اُس کے ہونٹوں پر
جو تھی زبانی کلامی، وہی لگی تحریر

پھر ایک آدھ کرن کو ترستا رہتا ہُوں
جب اپنے ہاتھ سے کرتا ہُوں تیرگی تحریر

ہزار سعی کے باوصف مَیں بھی پڑھ نہ سکا
کٹی پھٹی سی یہ مضمونِ وصل کی تحریر

ہوا پہ تیرتی آتی ہے میرے پاس کبھی
چلی بھی جاتی ہے اُڑ کر کبھی پری تحریر

نکال رکھا ہے خُود کو تمام اس میں سے
نہیں ہے اب مری تحریر بھی مری تحریر

کوئی جو سیکھے تو مُجھ سے عبارت آرائی
مَیں اپنی راکھ پہ کرتا ہُوں زندگی تحریر

مَیں دیکھتا ہُوں تو حیران ہوتا جاتا ہُوں
ہوا پہ کندہ کبھی خواب ہے، کبھی تحریر

سلیٹ صاف تو کر دی ہے ایک بار، ظفر
اب اس پہ دیکھیں اُبھرتی ہے کون سی تحریر

☆

روا بھی ہوئی تھی ، اور ، ناروا بھی ہوئی تھی
کیا ہے جُرم تو اُس کی سزا بھی ہوئی تھی

گلاب تھے تو مہک پھیلنی بھی تھی اُن کی
جو باغ ہے تو پھر اس میں ہوا بھی ہوئی تھی

وہ بات بیچ میں رہنی نہ تھی کسی صُورت
اس ابتدا کی کوئی انتہا بھی ہوئی تھی

دُعا ہی مانگ کے ہم اُٹھ کھڑے ہُوئے ، ورنہ
ابھی نمازِ محبت ادا بھی ہوئی تھی

کدھر ہے ، جس سے مرا مُنہ ہی بند ہو سکتا
وہ مُہرِ بوسہ جو مجھ کو عطا بھی ہوئی تھی

پری تھی کوئی ، مرے خواب سے نکل کر جو
گلے بھی لگنی تھی ، مل کر جدا بھی ہوئی تھی

ابھی قریب سے بھی میں نے دیکھنا تھا اُسے
ابھی وہ شکل بہُت خُوشنما بھی ہوئی تھی

میں اُس کی یاد کو اب یاد کرتا رہتا ہُوں
جو میری قید سے اک دن رہا بھی ہوئی تھی

یہ واقعہ ہے کہ اس شور میں ، ظفؔر ، شامل
تھکی ہوئی سی یہ میری صدا بھی ہوئی تھی

☆

کبھی ترستے رہے ، اور ، کبھی بہت آئی

مرے فلک سے وہ طوفاں نہیں اُٹھا پھر سے
مری زمین میں وہ تھرتھری بہُت آئی

جدھر سے کھول کے بیٹھے تھے در اندھیرے کا
اُسی طرف سے ہمیں روشنی بہُت آئی

وہاں مقام تو رونے کا تھا مگر ، اے دوست
ترے فراق میں ہم کو ہنسی بہُت آئی

رواں رہے سفرِ مرگ پر یونہی ، ورنہ
ہماری راہ میں یہ زندگی بہُت آئی

یہاں کچھ اپنی ہواؤں میں بھی اُڑے ہیں بہُت
ہمارے خواب میں کچھ وہ پری بہُت آئی

نہ تھا زیادہ کچھ احساس جس کے ہونے کا
چلا گیا ہے تو اُس کی کمی بہُت آئی

نجانے کیوں مری نیت بدل گئی یک دم
وگرنہ اُس پہ طبیعت مری بہُت آئی

ظفؔر ، شعور تو آیا نہیں ذرا بھی ہمیں
بجائے اس کے ، مگر ، شاعری بہُت آئی

☆

اُسے کیا جانے کس دیوانہ پن سے دیکھتا ہوں
میں آنکھوں سے نہیں سارے بدن سے دیکھتا ہوں

مری خصلت بیابانی ہے اور یوں ہی رہے گی
نگر کو دیکھتا ہوں، اور، بن سے دیکھتا ہوں

مرے اطراف میں اتنا اندھیرا ہے کہ اب میں
جدھر بھی دیکھنا چاہوں کرن سے دیکھتا ہوں

فضائے جسم ہے یا اک طلسمِ خواب ہے یہ
یہ پیچ و خم تمھارے پیرہن سے دیکھتا ہوں

ہجومِ گُل ہے میرے کوچہ و بازار میں بھی
یہ نظارہ میں دیوارِ چمن سے دیکھتا ہوں

یہاں جیسے کبوتر اُڑ رہے ہیں اُس طرف بھی
میں سرحد پار بھی خاکِ وطن سے دیکھتا ہوں

زمانہ اِس کو بے شک میری کمزوری ہی سمجھے
کہ دُشمن کی طرف بھی حُسنِ ظن سے دیکھتا ہوں

نہ جانے رات بھر کیوں اپنی بے خوابی کا منظر
میں ہر کروٹ پہ بستر کی شکن سے دیکھتا ہوں

ظفر جدّت طرازی میں بھی میں چیزوں کو اب تک
اُسی معیارِ اُسلوبِ کہن سے دیکھتا ہوں

☆

ایک ہی خواب ہے آنکھوں میں، کہیں مل سکتے
اک سڑک بیچ میں ہے، پھر بھی نہیں مل سکتے

اِسی دُنیا میں کئی اور بھی دُنیائیں ہیں
میں نے یہ تو نہیں چاہا کہ یہیں مل سکتے

اپنے حالات سے مجبور تھے ہم بھی، ورنہ
وہ اگر مل نہیں سکتا تو ہمیں مل سکتے

ملتے رہتے ہیں بہت خُود سے جدا ہو کر ہم
ایک بار اُس سے اگر اپنے تئیں مل سکتے

رونق شہر پلٹتی کسی موسم کی طرح
غیرآباد مکانوں کو مکیں مل سکتے

دُور ہو سکتی کبھی تو یہ ازل کی دُوری
کہیں جا کر یہ فلک اور زمیں مل سکتے

اک تعلّق خبر و بےخبری میں رہتا
کبھی آپس میں گُماں اور یقیں مل سکتے

عُمر بھر اہلِ تماشا سے مُلاقات رہی
کبھی خُود سے بھی ترے خاک نشیں مل سکتے

کوئی بازار، کوئی باغ، کوئی بام، ظفر
جہاں مل سکتے ہیں سب لوگ، وہیں مل سکتے

☆

پھول دل میں جو کھلا ہے تو پتا لگنے دے
باہر آنے دے اُسے ، اور ، ہوا لگنے دے

خشک سالی انھیں برباد نہیں کر سکتی
اپنی فصلوں کو اگر میری دعا لگنے دے

بکھر آئے گا اسی دھند سے منظر سارا
خواب خواہش کو ابھی خواب نما لگنے دے

فاصلہ اپنی جگہ ایک تعلق ہے ، اگر
اپنی جڑتی ہوئی چیزوں کو جدا لگنے دے

آسماں کا جو ابھی رنگ ہے ، تبدیل نہ کر
اور ، اس جاگتے جنگل کو ہرا لگنے دے

سبھی کھل جائے گا کیا گزری ہے اُس پر آخر
کچھ سفینے کو کنارے سے تو آ لگنے دے

اجنبی ہی سہی میدانِ تماشا ، لیکن
جیسا لگتا ہے ، اُسے اور ذرا لگنے دے

کوئی اچھائی کی صورت نکل آئے شاید
میں بُرا ہوں تو مجھے اور بُرا لگنے دے

لوگ پہنچے ہیں یہاں تک بڑی محنت سے ، ظفر
تیرا کیا حرج ہے ، خلقت کو خدا لگنے دے

☆

اچھا ہے محبت میں سبکبار نہ ہونا
اور ، اُس سے کسی شے کا طلبگار نہ ہونا

ہر سُو وہ کبھی ڈھونڈتے پھرنا مرا خود کو
اور ، چاروں طرف ہی مرے آثار نہ ہونا

پانی میں اُتر کر بھی مری پیاس نہ بجھنی
کہہ ڈالنا سب کچھ ، مگر ، اظہار نہ ہونا

چھپنا کہیں جا کر کسی خوابِ گزراں میں
موجود بھی ہونا تو نمودار نہ ہونا

ملنا نہ سراغ اس کے مکینوں کا کئی روز
کچھ دن اسی گھر کے در و دیوار نہ ہونا

چاہا تھا بہت عشق نہ کرنا کسی صورت
اور ، عمر کے اس حصے میں یوں خوار نہ ہونا

جس میں کئی وقفوں سے نہ ہونا بھی ہے شامل
ہونا بھی ہے اپنا تو لگاتار نہ ہونا

پھرنا یونہی مال اپنا اُٹھائے ہوئے سر پر
اور ، سارے علاقے میں خریدار نہ ہونا

ہم جا نہیں سکتے ہیں کسی اور طرف بھی
ایسا ہے ، ظفر ، اُس کا گرفتار نہ ہونا

☆

موجود بھی رہتا ہے ، دکھائی نہیں دیتا
میں شور ہوں ایسا کہ سنائی نہیں دیتا

ملنا ہی تو ممکن نہیں ، مل جائے اگر وہ
پھر اس نے کبھی داغ جدائی نہیں دینا

دن ہوتے ہی چھا جائیں گے آنکھوں کے اندھیرے
اور ، ہاتھ کو بھی ہاتھ سجھائی نہیں دینا

بھٹکیں گے ابھی خود بھی بیابان ہوا میں
اوروں کو بھی کچھ سمت نمائی نہیں دینا

یہ اس کی ضرورت ہے کہ اس نے ابھی مجھ کو
اس خواب تماشا سے رہائی نہیں دینا

اک یاد کا رکھنا ہے کوئی بوجھ سا دل پر
اس قرض کی فی الحال ادائی نہیں دینا

ڈھونڈا بہت اس شکلِ جہاں تاب کا ثانی
آخر پڑا ان ہاتھوں میں آئینہ ہی دینا

اندازہ ہمارا بھی کچھ ایسا ہے کہ اس نے
آنکھوں کو ابھی رنگِ رسائی نہیں دینا

ہوں ایک پرِکاہ ، ظفر ، اس لیے اس نے
مجھ کو ہنرِ شعلہ نوائی نہیں دینا

-☆-

مرے نواح میں دنیا زیادہ ہو گئی ہے
کہ میری تاب تماشا زیادہ ہو گئی ہے

جبھی تو میرا توازن نہیں رہا ہے درست
کہ میرے دل میں تمنا زیادہ ہو گئی ہے

سہولیات بھی مجھ کو یہاں نہیں حاصل
مگر ، مرے لیے پتا زیادہ ہو گئی ہے

حسد کی آگ جلا کر ہی مجھ کو چھوڑے گی
کہ بجھتے بجھتے یہ الٹا زیادہ ہو گئی ہے

مجھے سفر کی تھکاوٹ نے آ لیا ہے کہیں
کہ آج وسعتِ صحرا زیادہ ہو گئی ہے

کبھی سفینہ الجھنے لگا ہے لہروں سے
کبھی روانیِ دریا زیادہ ہو گئی ہے

زمیں کی شکل ہی گم ہو چکی ہے چاروں طرف
یہ گھاس اصل میں پیدا زیادہ ہو گئی ہے

سنبھالنے سے سنبھلتی نہیں ہے نعمتِ خواب
مجھے یہ جیسے مہیا زیادہ ہو گئی ہے

کمی بھی کرتا رہا ہوں ، ظفر ، محبت میں
کئی دنوں سے دوبارہ زیادہ ہو گئی ہے

-☆-

خواب پر زور کی بارش ہوئی ، اور ، پھول جھڑے چاروں طرف
رنگ ہی رنگ دھڑکتے تھے ان آنکھوں میں پڑے چاروں طرف

دھوپ لاچار ہوئی ، اور ، سمٹنے لگی رفتہ رفتہ
دوپہر موج میں آئی ہے تو بادل سے چڑھے چاروں طرف

آ کے دیکھا تو کوئی چھانو کی خوشبو سی رواں تھی اب تک
پیڑ موجود رہے تھے یہاں چھوٹے نہ بڑے چاروں طرف

تیز رفتار ہوا بھی تھی اندھیرے کی فصیلوں سے الگ
شام نے آ کے چمکدار ستارے بھی جڑے چاروں طرف

وسط میں ہی کھڑا محفوظ ہوا ہوں میں ہر اک خطرے سے
دشمنوں سے مرے کون آ کے دھواں دھار لڑے چاروں طرف

میں ہی چپ ، اور ، اکیلا تھا سرِ شام وہاں پر ، ورنہ
لفظ ، اور ، لوگ تھے بروقت اسی طرح کھڑے چاروں طرف

تو بھی موجود تھا ، اور ، سب تری رعنائیاں بھی شام و سحر
پھر بھی ، مجھ پر کوئی آئے ہوئے تھے وقت کڑے چاروں طرف

خود ہی بھر جاؤں گا اللہ نے چاہا تو کسی کے اندر
میں نے اوروں کے لیے کھود رکھے ہیں جو گڑھے چاروں طرف

ہوں وہ روکا ہوا پانی کسی سفاک وڈیرے کا ، ظفر
مجھ سے آگے ہیں ابھی کھیت یونہی سوکھے سڑے چاروں طرف

☆

اتنا ٹھہرا ہوا ماحول بدلنا پڑ جائے
باہر اپنے ہی کناروں سے اچھلنا پڑ جائے

اتنا مانوس بھی ہونے کی ضرورت کیا تھی
کبھی اس خواب سے ممکن ہے نکلنا پڑ جائے

چھوڑ جائیں جو تمھارے بھی ہوتے سوتے
اور ، کبھی ساتھ ہمارے تمھیں چلنا پڑ جائے

دور سے دیکھ کے ہم جس کو ڈرا کرتے ہیں
کیا مزہ ہو جو اسی آگ میں جلنا پڑ جائے

کیا خبر جس کا یہاں اتنا اڑاتے ہیں مذاق
خود ہمیں بھی کبھی اس رنگ میں ڈھلنا پڑ جائے

دل کی یہ آب و ہوا اتنی مخالف ہے اگر
اور ، انہی موسموں میں پھولنا پھلنا پڑ جائے

کون کہہ سکتا ہے بدلے ہوئے آثار کے ساتھ
دیکھا دیکھی ہی طبیعت کو سنبھلنا پڑ جائے

اعتبار ایک دفعہ اور بھی کرتے ہوئے ، پھر
انہی وعدوں کے کھلونوں سے بہلنا پڑ جائے

شعلہ مجبور ہو دریا پہ مچلنے کو ، ظفر
کسی دن دشت سے چشمے کو ابلنا پڑ جائے

☆

بہت کچھ کہہ چکے تھے مہرباں ہونے سے پہلے ہی
کبھی احوال ظاہر تھا بیاں ہونے سے پہلے ہی

فلک لگنے لگا تھا ایک دم مٹیالا مٹیالا
زمیں چمکی ہوئی تھی آسماں ہونے سے پہلے ہی

تماشا بجھ گیا تھا درمیاں میں کس لیے آخر
طبیعت رک گئی تھی کیوں رواں ہونے سے پہلے ہی

مرا بچپن مری یادوں میں زندہ اس لیے بھی ہے
کہ بوڑھا ہو چکا تھا میں جواں ہونے سے پہلے ہی

ہوائیں چل رہی تھیں اور کی کچھ اور ہی اب کے
وہ مجھ سے خوش نہیں تھا بدگماں ہونے سے پہلے ہی

گزر کر دیکھ بھی آیا ہوں بازار تماشا سے
مری قیمت نہیں تھی رائگاں ہونے سے پہلے ہی

پھبن ہی مختلف تھی، اور، چلن ہی اور تھا اس کا
بہت اچھا لگا تھا جانِ جاں ہونے سے پہلے ہی

سمٹ سکتے اگر اتنا بکھر جاتے ہوئے ہی ہم
سنبھل جاتے اگر اتنا زیاں ہونے سے پہلے ہی

ظفر، حیرت زدہ ہوں آج تک اس پر کہ میں آخر
وہاں کس طرح جا پہنچا یہاں ہونے سے پہلے ہی

☆

نیا طریقۂ اظہار خود بناتے ہیں
اور، اس کے ساتھ ہی معیار خود بناتے ہیں

کچھ اس کے مہر و مروت پہ ہی نہیں موقوف
کہ خود کو اس کا سزاوار خود بناتے ہیں

کسی کے روکنے سے ہم کہاں رکے ہیں بھلا
ہم اپنی راہ کی دیوار خود بناتے ہیں

کچھ ان کی رائے سے کرتے ہیں اتفاق یہاں
نہ ان کو اپنا طرفدار خود بناتے ہیں

خود آپ توڑ بھی دیتے ہیں موج میں آکر
اگر پیالۂ پندار خود بناتے ہیں

ہوا ہے کارِ محبت جو اس قدر مشکل
سو، اتنے سہل کو دشوار خود بناتے ہیں

کہیں سبب کوئی بنتا ہے اس کے ملنے کا
نہیں تو عاقبتِ کار خود بناتے ہیں

ضمیر بیچتے ہیں ایک دوسرے سے الگ
ہم اپنا اپنا خریدار خود بناتے ہیں

یہاں پہ بکتا ہے اکثر انھی کا مال، ظفر
جو اپنی گرمیِ بازار خود بناتے ہیں

☆

چمکے گا ابھی میرے خیالات سے آگے
وہ نقش کہ تھا داغِ مُلاقات سے آگے

لگتا ہے کہ مُشکل ہے ابھی دن کا نکلنا
ہے رات کوئی اور بھی اس رات سے آگے

اس وہم سے واپس نہیں پلٹا ہوں کہ ہو گا
کُچھ اور بھی اس خوابِ طلسمات سے آگے

آرام سے پیچھے وہ ہٹا دیتا ہے مُجھ کو
بڑھتا ہوں اگر اُس کی ہدایات سے آگے

دورانِ سفر کرتا ہوں آرام بھی ، لیکن
ہوتا ہوں ٹھہرنے کے مقامات سے آگے

عقدہ اِسی خاطر کوئی ہوتا ہی نہیں حل
ہیں سارے سوالات جوابات سے آگے

آگاہ کیا ہے تو ہوئے اور بھی غافل
واقف جو نہیں تھے مرے حالات سے آگے

ہو سکتا ہے کیا کوئی بھلا اُن کے برابر
رہتے ہیں جو خود اپنے بیانات سے آگے

اتنا بھی بہت ہے جو ، ظفر ، قحطِ نوا میں
نکلی ہے کوئی بات مری بات سے آگے

☆

بامِ ہوا پہ کوئی اشارہ ہے یا چراغ
جھلمل اُسی طرح کی دوبارہ ہے یا چراغ

کرنے کو ہے مرے خس و خاشاک میں نمود
پل بھر کو ہی سہی ، وہ شرارہ ہے یا چراغ

دل کی منڈیر پر جو کوئی روشنی سی ہے
لگتا ہے یہ بھی خواب ہمارا ہے ، یا چراغ

چمکی ہے ایک چیز اندھیرے میں جو ابھی
یاقوتِ لب کا کوئی کنارہ ہے یا چراغ

پروانے سے یہ گھومتے ، گرتے ہیں چار سُو
اور ، وسط میں خیال تُمھارا ہے یا چراغ

پھرتا ہے آسماں کی طرف رات رات بھر
دیکھو ، ہمارے غم کا غبارہ ہے یا چراغ

اندر کی آندھیوں سے اُلجھتا ہے جو ابھی
مَیں سوچتا ہوں کوئی ستارہ ہے یا چراغ

مَیں آپ بے خبر ہوں کہ مَیں نے یہاں کہیں
اک پھول تیرگی میں اُتارا ہے یا چراغ

گرمی ہے ، اور ایک چکاچوند سی ، ظفر
یہ آتشِ سخن کا نظارا ہے یا چراغ

☆

ڈھل رہی ہے زمیں آسماں چمکتا ہے
جو مَیں نہیں ہُوں تو کیا کُچھ یہاں چمکتا ہے

ندی میں ہی یہاں سُورج نہ رہ گیا ہو کہیں
جو شام ہوتے ہی آبِ رواں چمکتا ہے

سکُون میں ہیں سمندر کی نرم خُو موجیں
فلک پہ چاند یُونہی رائیگاں چمکتا ہے

ہمارا عشق اب اُس مرحلے پہ ہے آخر
کہ آگ سرد ہے، خالی دھواں چمکتا ہے

جہاں جہاں مُجھے مُجرم دیا گیا ہے قرار
وہیں وہیں ورقِ داستاں چمکتا ہے

دراصل ہے مری آنکھوں کی روشنی کا فتور
جو میرے سامنے سارا جہاں چمکتا ہے

گُزر گئی تھی کوئی برق فاصلے سے کبھی
اور، آج تک یہ مرا آشیاں چمکتا ہے

اب اُس کے ہونے نہ ہونے کی بحث کس مصرف
کہ خُود نہ ہو بھی تو اُس کا گُماں چمکتا ہے

مری جبیں تو، ظفر، بُجھ بُجھا چکی کب کی
مگر، کہیں سے کوئی آستاں چمکتا ہے

☆

شکر ہے کچھ تو افاقہ ہوا بیماری سے
خُود ہی بیزار ہُوں اب اُس کی طرفداری سے

جب اِس کا کبھی سامانِ سفر ہوتا ہے
کبھی رُک جاتا ہُوں اپنی ہی گرانباری سے

اُس نے کرنی ہی نہ تھی میری شکایت، اور، اب
آپ بدنام ہُوا میری گرفتاری سے

جلدبازی ہمیں راس آئی نہ لالچ اِتنا
مِلی آدھی بھی نہیں تھی کہ گئے ساری سے

ہم کوئی شوق سے کرتے ہیں محبت، آخر
ہم تو کرتے ہیں کسی اپنی ہی ناچاری سے

جاگنے پر تو ہمیں کُچھ نہ مِلا، اور، اُلٹے
ہُوئے محرُوم کسی خواب کی سرشاری سے

تنگ آ کر کوئی ہم نے بھی بنا لی ہے قطار
کہ یہاں موت بھی آتی ہے کہیں باری سے

شعر میں جب بھی جہاں کوئی کمی رہ جائے
خُود ہی پُوری اُسے کرتے ہیں اداکاری سے

جیب خالی جو ہُوئی ہے تو کہیں جا کے، ظفر
باز آیا ہُوں محبت کی خریداری سے

☆

خواب خواہش کی دمک سے ہر مکاں روشن ہُوا
پھر ، اُسی عکسِ زمیں سے آسماں روشن ہُوا

رات باقی تھی کہ چمکا ایک دم چڑیوں کا شور
سایۂ اشجار میں آبِ رواں روشن ہُوا

اِس قدر گاڑھا اندھیرا تھا کہ ایسے میں کہیں
بادلوں میں برق لرزی ، آشیاں روشن ہُوا

لوگ بھی حیرت زدہ ، اور ، لفظ بھی لاچار تھے
صبح سے پہلے ہی جب سارا جہاں روشن ہُوا

چاند ، سُورج ، اور ، ستاروں نے بہُت کوشش تو کی
آخر اہلِ خاک سے یہ خاکداں روشن ہُوا

دِن چڑھے تک بُت کدے کی رونقیں باقی رہیں
بُجھ گئے جب سب چراغ ، اُن کا دُھواں روشن ہُوا

شام سے خُوش تاب تھی مرتی ہُوئی مچھلی کی آنکھ
سطح پر آئی تو بحرِ بے کراں روشن ہُوا

فُرصتِ نظّارہ ہی باقی نہیں تھی خلق میں
پُھول سا شاخِ ہوا پر رائیگاں روشن ہُوا

ساری دُنیا سے الگ تھی میری تاریکی ، ظفر
اُس کے اندر ہی مرا نام و نشاں روشن ہُوا

☆

صحرا فریب ہے کبھی دریا فریب ہے
اور ، ایک وقت میں کبھی دُنیا فریب ہے

اچھے ہم ایسے لگنے لگے کیسے ایک دم
لگتا ہے یہ بھی کوئی تُمھارا فریب ہے

تسلیم اپنی ذات میں کرتے ہو جس قدر
حق تو یہ ہے کہ اُس سے زیادہ فریب ہے

خُود ہی اِس التفات کا کُچھ کیجیے حساب
کتنی حقیقت اس میں ہے ، کتنا فریب ہے

جا کر فریب کھائیں جہاں بھی ہم ایک بار
اپنے لیے وہیں پہ دوبارہ فریب ہے

دھوکا ہی اس قدر ہے کہ ہر کوئی دُوسرا
خُود ہو نہ ہو ، مگر ، مجھے لگتا فریب ہے

باتوں میں اُس کی آگئے ہیں ہم پھر ایک بار
حالاں کہ یہ تو اُس کا پُرانا فریب ہے

ہم جس میں جا رہے ہیں سمندر ہے جُھوٹ کا
فرضی ہے سب سفینہ ، ستارہ فریب ہے

تُم خُود فریب کار ہو سب سے بڑے ، ظفر
شاکی فریب کے ہو ، یہ کیسا فریب ہے

☆

خود جسے دل سے نکالا تھا ، یہیں موجود ہے
وہ محبت ختم ہو کر بھی کہیں موجود ہے

دور تک ہے ایک گہرا ابر سا چھایا ہوا
آسماں غائب ہوا ہے ، اور ، زمیں موجود ہے

حیثیت وہ ہے جسے تسلیم دنیا بھی کرے
ورنہ کیا کچھ اپنے پاس اپنے تئیں موجود ہے

جتنی بے مصرف بھی ہو طغیانیِ طبعِ رواں
اس میں بھی اک موجۂ عہد آفریں موجود ہے

پاس اگر رہتے تو کب کے راکھ ہو جانے تھے ہم
اس کے ہونٹوں پر وہ رنگِ آتشیں موجود ہے

صورتِ امن و اماں سے ہی پتا چل جائے گا
شہر میں موجود ہے وہ ، یا نہیں موجود ہے

اور اترے گا ابھی دل میں اندھیرا سا کوئی
بام پر کچھ دیر وہ ماہِ مبیں موجود ہے

خانۂ دل ہم کو خالی سا ہی لگتا تھا ، مگر
جانے کب سے کوئی اس میں جاگزیں موجود ہے

لوگ سب اتنی ترقی کر گئے ، لیکن ، ظفر
ہم نے چھوڑا تھا جہاں تجھ کو ، وہیں موجود ہے

-☆-

بھلا بیٹھے ، نہیں تھی جو محبت بھولنے والی
اور ، اتنے تھوڑے عرصے میں وہ صورت بھولنے والی

ہم اس میں آپ رہنے لگ گئے ، تب جا کے بھولے ہیں
وگرنہ کون سی تھی یہ مصیبت بھولنے والی

بہت کچھ یاد رکھنا اب تو اچھا بھی نہیں لگتا
تقاضا عمر کا بھی ہے یہ عادت بھولنے والی

سبھی کچھ یاد ہے جو کچھ ضروری تھا بھلا دینا
ملی ہے اتنی مشکل سے یہ مہلت بھولنے والی

تمہی کہہ دو ، کہاں تک ہم بھی آخر درگزر کرتے
کہ ہوتی بھی نہیں کوئی شکایت بھولنے والی

ہم اتنے بھی گئے گزرے نہیں ، پیشِ نظر ہے سب
فسانہ یاد رکھنے کا ، حقیقت بھولنے والی

فراموش اس کو ہم کر بھی چکے ہوں گے بڑی حد تک
مگر ، شاید نہیں اس کی ضرورت بھولنے والی

نہیں ہے فرق ایسا بھولنے ، اور ، یاد رکھنے میں
مجھے ازبر ہے ساری اپنی حالت بھولنے والی

ظفر ، قربان کر سکتا ہوں میں سو حافظے اس پر
ملی ہے اپنی قسمت سے جو نعمت بھولنے والی

-☆-

رُسوا زمانے بھر میں ہمارا ہی نام ہے
جتنی ہے کارکردگی ، اُتنا ہی نام ہے

مَیں اور جانتا نہیں کُچھ اُس کے باب میں
مَیں نے پڑھا نہیں ابھی لکھا ہی نام ہے

تارے سے جھلملانے لگیں جس کو سوچ کر
شامِ سفر میں وہ کوئی ایسا ہی نام ہے

آنکھوں میں شکل اور کوئی ہے تو کیا ہُوا
ہونٹوں پہ اپنے اب بھی تُمھارا ہی نام ہے

بادل ہو، آسماں ہو، پرندے ہوں، یا پتنگ
اس منظرِ ہوا کا تماشا ہی نام ہے

بہتا رہے کہ ریت اڑے اس میں ہر طرف
دل کا تو ایک عُمر سے دریا ہی نام ہے

بے نام ہے ہر ایک جو موجود ہے یہاں
جو اصل میں کہیں نہیں، اُس کا ہی نام ہے

فکرِ سخن ہے اصل میں بے فکریِ سخن
جیسا ہے اپنا کام، سو، ویسا ہی نام ہے

اہلِ اُمید ہیں، سو، ہمارے لیے، ظفر
دیوارِ خواب کا بھی دریچہ ہی نام ہے

-☆-

نیت ہے کوئی اور، عمل اور طرح کا
ہے اب کے دماغوں میں خلل اور طرح کا

پہلے بھی ہُوا کرتا ہے معمول مُطابق
اس بار ہے یہ ردّ و بدل اور طرح کا

جینے کی بھی ہے اس میں نوید ایک طرح سے
آیا ہے یہ پیغامِ اجل اور طرح کا

یہ بات ہے سچّی، مگر، اِتنا تو کہیے
موقع ہے یہاں اور، محل اور طرح کا

مایوس نہیں ہوں ابھی اس رنگِ ہوا سے
اس آج کے بعد آئے گا کل اور طرح کا

فی الحال تو کُچھ مُجھ کو بھی معلوم نہیں ہے
اس مسئلے کا ہے کوئی حل اور طرح کا

ہو گا اثر اب اس کا کہیں اور ہی جا کر
لمحہ یہ کوئی اور ہے، پل اور طرح کا

آئیں کہ نہ آئیں، یہ ہوائیں ہیں کُچھ ایسی
ہوتا ہے، مگر، وقت اٹل اور طرح کا

کُچھ اور ہی آیا ہے، ظفر، سامنے اپنے
دیکھا تھا کبھی خوابِ غزل اور طرح کا

-☆-

مرے نشاں بہت ہیں، جہاں بھی ہوتا ہوں
مگر، دراصل وہیں بے نشاں بھی ہوتا ہوں

اُسی کے رہتا ہوں خواب و خیال میں اکثر
مگر، کبھی کبھی اپنے یہاں بھی ہوتا ہوں

اِدھر اُدھر مجھے رکھتا ہے وہ بہت، لیکن
کبھی کبھار، مگر، درمیاں بھی ہوتا ہوں

لگا بھی کرتی ہے بازار میں مری قیمت
کسی کسی کے لیے رائگاں بھی ہوتا ہوں

بنائے رکھتے ہیں سب میرِ کارواں بھی مجھے
کبھی میں گردِ رہِ کارواں بھی ہوتا ہوں

بشر ہوں مَیں، کئی مجبوریاں بھی ہیں میری
اُداس رہتے ہوئے شادماں بھی ہوتا ہوں

پڑا ٹھٹھرتا بھی ہوں برف برف موسم میں
اِسی زمانے میں آتش فشاں بھی ہوتا ہوں

بدلتی رہتی ہے میری بھی کیفیت کیا کچھ
کہ آگ ہی نہیں رہتا، دھواں بھی ہوتا ہوں

مَیں جان و جسم ہوں، گھر ہو کہ وہ گلی ہو، ظفر
یہاں بھی ہوتا ہوں مَیں، اور وہاں بھی ہوتا ہوں

☆

غرض نہیں ہے بیاباں سے، بن سے کام نہیں
بہار آئی ہے لیکن، چمن سے کام نہیں

وہ مرد ہے نہ ہی عورت ہے، اور کچھ بھی ہو
جسے یہاں پہ کسی مرد و زن سے کام نہیں

سوائے اُس میں سمانے کے، وہ بھی گاہ بگاہ
ہمارا اور کوئی اُس بدن سے کام نہیں

ہمارے پاس بچا ہی نہیں ہے کچھ اب تو
سفر سے واسطہ ہے، راہزن سے کام نہیں

یہ اپنا سر ہے، اِسے خود بھی پھوڑ سکتے ہیں
ہمیں بظاہر ابھی کوہکن سے کام نہیں

ہم اپنے آپ ہی اب اس کو جوڑ بھی لیں گے
ہمیں مزید کسی دل شکن سے کام نہیں

ہم ایک شخص کا احسان ہیں اُٹھائے ہوئے
ہمیں تمھاری کسی انجمن سے کام نہیں

ہم اپنی کھال بچا کر ہیں کب کے بیٹھے ہوئے
کہ حال مست ہیں، دار و رسن سے کام نہیں

ظفر، اب آپ ہی کچھ ہو رہے تو ہے، ورنہ
زمانہ ہو گیا سعیِ سخن سے کام نہیں

☆

جو میں کچھ نہیں آتا یہاں لیا گیا برابر ہے
کہیں سارا برابر ہے ، کہیں آدھا برابر ہے

ہماری پیاس ، اور ، دیوانگی سے آپ کو مطلب
اگر دریا برابر ہے ، اگر صحرا برابر ہے

ابھی میں اس میں رہ سکتا ہوں ، کچھ تنگی نہیں ایسی
ابھی کیوں چھوڑ کر جاؤں ، ابھی دُنیا برابر ہے

مُساوات اور کیا ہو اس گئے گزرے زمانے میں
کہیں بھوکا برابر ہے ، کہیں پیاسا برابر ہے

گڑھوں میں ، اور ، ٹیلوں پر سفر جاری تو ہے اپنا
کہ سُن رکھا ہے کچھ آگے کہیں رستا برابر ہے

ضرورت کے مطابق وقت کا گزران کرتے ہیں
کبھی اُلٹا برابر ہے ، کبھی سیدھا برابر ہے

بہت ممکن ہے اب کچھ اور بھی گھٹ جائے قدر اپنی
کہ اب تک تو یہاں انسان کے کتا برابر ہے

نہ ملنا شوخیِ تقدیر کا بھی دخل ہے کوئی
مگر ، اس ابتلا میں آپ کا حصہ برابر ہے

ظفرؔ ، نقصان جو ہونا تھا اپنا ہو چکا ، اب تو
ہمارا اُس طرف جانا ، نہیں جانا برابر ہے

☆

سینۂ دشت سے اک چشمہ اُبلتا ہوا ہے
سطحِ دریا پہ کوئی شعلہ مچلتا ہوا ہے

کچھ پرندے ہیں جو مٹی میں گڑے ہیں ہر سُو
اور ، پھر ایک شجر ہے جو اُچھلتا ہوا ہے

اس تگ و تاز میں کچھ اور تو باقی نہیں اب
ایک دل ہے کہیں ، اور ، وہ بھی دہلتا ہوا ہے

اک دیا ہے اس اندھیرے کے مقابل اس وقت
جو کہیں میرے برابر سے نکلتا ہوا ہے

اپنے باغات کی ہے اس کو نمائش بھی عزیز
جو بظاہر کہیں پوشاک بدلتا ہوا ہے

آپ ہیں اپنے شب و روز میں گم ، آپ سے کیا
کوئی اب گرتا ہوا ہے کہ سنبھلتا ہوا ہے

ہم بھی فارغ نہیں ، اور ، وہ بھی ہے مصروف بہت
ایک خطرہ تھا محبت کا ، سو ، ٹلتا ہوا ہے

میں کنواں کھودنے پر غور ہی کرتا ہوں ابھی
اور ، اک شہر مرے سامنے جلتا ہوا ہے

اپنے وقتوں میں جو ہر طرح سے باطل تھا ، ظفرؔ
اب کے بازار میں سکہ وہی چلتا ہوا ہے

☆

کالی کھا ، یا بھوری کھا
گھر میں بیٹھ ، اور ، چوری کھا

بھرتی کر مزدوروں کو
پھر اُن کی مزدوری کھا

قُرب مُیسّر ہو گا تب
پہلے اُٹھ ، اور ، دُوری کھا

آدھی کافی کھائی ہے
ٹکڑا ہو ، اور ، پُوری کھا

تُو بھی اُن ہی جیسا ہے
تُو بھی حلوہ پُوری کھا

پہلے کر کُچھئی منظور
پھر اُس کی منظوری کھا

بول چال میں وقت گزار
سارے کام ضروری کھا

جا ، معجونِ محبت پی
شربت خاص بزوری کھا

گالی ہوتی ہے گالی
پُوری خواہ اُدھوری کھا

☆

کُچھ وہ ہی زیادہ گوری تھی
یا اپنی بھی کمزوری تھی

لکھنا نہیں آتا تھا ہم کو
کاغذ کی طرح وہ کوری تھی

کُچھ میٹھا تھا ، کُچھ کڑوا تھا
وہ کس گنّے کی پوری تھی

غصّہ بھی تھا اُس کی آنکھوں میں
ویسے تو محبت خوری تھی

کرتی تھی تواضع بھی ڈٹ کر
اور ، آپ بھی بہت چٹوری تھی

روٹی تھی لفافے میں اپنے
روٹی پہ بھنڈی توری تھی

اُس کے کاندھوں پہ بچے تھے
اور ، اپنے سر پہ بوری تھی

ساتھ اُس کے لگ کر سو گئے ہم
جو ایک مجسّم لوری تھی

وہ بھوک بھولتی نہیں ، ظفر
اب ڈاکا تھا ، یا چوری تھی

☆

طلسمِ ہوش رُبا میں پتنگ اُڑتی ہے
کسی عقب کی ہوا میں پتنگ اُڑتی ہے

چڑھے ہیں کاٹنے والوں پہ لُوٹنے والے
اسی ہجومِ بلا میں پتنگ اُڑتی ہے

پتنگ اُڑانے سے کیا منع کر سکے زاہد
کہ اُس کی اپنا عبا میں پتنگ اُڑتی ہے

یہ آپ کٹتی ہے یا کاٹتی ہے دوسری کو
بس ایک بیم و رجا میں پتنگ اُڑتی ہے

کہیں چھتوں پہ بپا ہے بسنت کا تہوار
کہیں پہ تنگیٔ جا میں پتنگ اُڑتی ہے

کہیں فلک پہ سرکتی ہے سرسراتی ہُوئی
کہیں دلوں کی فضا میں پتنگ اُڑتی ہے

کُھلا ہے اُس پہ کچھ ایسے بہار کا موسم
ہے رُخ پہ رنگ، قبا میں پتنگ اُڑتی ہے

یہ خواب ہے کہ اُلجھتا ہے اور خوابوں سے
یہ چاند ہے کہ خلا میں پتنگ اُڑتی ہے

اُمیدِ وصل میں سو جائیں ہم کبھی جو، ظفر
تو اپنی خواب سرا میں پتنگ اُڑتی ہے

☆

ادنیٰ ہو یا اعلیٰ ہو
مُجھ کو جانچنے والا ہو

میرا تعارف ہو کوئی
میرا کوئی حوالہ ہو

لڑا ہُوا ہو پیچ کہیں
پڑا کسی سے پالا ہو

کسا ہُوا ہو کپڑوں میں
یا پھر ڈھیلا ڈھالا ہو

اور نہیں تو کم سے کم
رانی خاں کا سالا ہو

ایک مکمل ناواقف
یا کوئی دیکھا بھالا ہو

کہیں نکالا ہو اُس کو
کسی چیز میں ڈالا ہو

گلا ہُوا ہو کافی سا
پُورا مرچ مسالہ ہو

جہاں شیر پھرتا ہو، ظفر
وہیں شیر کی خالہ ہو

☆

دُنیا نہیں حسبِ حال
ملتا نہیں حسبِ حال

کیا دُوسرے کا گِلہ
پہلا نہیں حسبِ حال

بستر نہیں دل پسند
بوسہ نہیں حسبِ حال

کیا کیجیے ، اے بُرے
اچھا نہیں حسبِ حال

آتا ہے وہ دیر سے
جاتا نہیں حسبِ حال

بے خواب رکھتا ہے وہ
سوتا نہیں حسبِ حال

جتنا مجھے چاہیے
اُتنا نہیں حسبِ حال

ہے تو سہی مہرباں
ایسا نہیں حسبِ حال

کیسے بتائیں ، ظفرؔ
کیا کیا نہیں حسبِ حال

☆

کرتے بات سلیقے سے
ملتا اگر طریقے سے

اُچھل اُچھل کر ہوئے تمام
اک طاقت کے ٹیکے سے

کیا کچھ سہا رفیقاں نے
پُوچھو کبھی رفیقے سے

بھائی وال کا پتا کاٹ
فقرہ کاٹ وثیقے سے

شور مچاتا جا یُوں ہی
بچتا جا تفصیلے سے

دل کی تختی پر ہم نے
اُس کے نقش اُلیکے سے

بوجھ پڑا تو سب الفاظ
چیخے سے ، یا چیکے سے

آخر ہم نے سمجھایا
اُس کو خواب سہیلے سے

دیکھے آپ کے شعر، ظفرؔ
وُہی رنگ ہیں پھیکے سے

☆

اندھیرا ذرا اور گوڑھا ہُوا
مرے دل میں اک چاند بُوڑھا ہُوا

محبت بنی آج بچوں کا کھیل
پلنگ اِس طرح سے پنگھوڑا ہُوا

وہ ہڈی ہی دراصل تھی اتنی سخت
ہلا دانت ، زخمی مسوڑھا ہُوا

کہیں لپ سٹک سی جمائی ہُوئی
کہیں پاؤڈر سا وہ ڈھوڑا ہُوا

زمانے کی حرکت کہاں کھو گئی
کہ باندھا ہُوا ہے نہ چھوڑا ہُوا

مُعزز تھا یہ عشق بھی شہر میں
سو ، کٹوائی ناک ، اور ، بوڑا ہُوا

کہیں بیٹھ کر رو لیے دو گھڑی
وہ منجی ہُوئی یا کہ مُوڑھا ہُوا

دکھایا ہے جتنا کمال ہُنر
وہ سارے کا سارا ہی کوڑا ہُوا

چمک ہی گیا جا کے اُس کے تئیں
ظفر آدمی سے لسوڑھا ہُوا

☆

ریڑھی والا بھی پیار کرتا ہے
اُس کا سالا بھی پیار کرتا ہے

چاق و چوبند و چست کے برعکس
ڈھیلا ڈھالا بھی پیار کرتا ہے

کبھی معمول سے الگ ہو کر
وہ نرالا بھی پیار کرتا ہے

دل ہے مشکل میں بھی مگر ، اُس کو
لامحالہ بھی پیار کرتا ہے

چاہتے ہیں اُسے اندھیرے بھی
اور ، اُجالا بھی پیار کرتا ہے

اُس کی خالہ ہی پر نہیں موقوف
اُس کا لالہ بھی پیار کرتا ہے

محض چابی ہی جتلا نہیں کچھ
آپ تالا بھی پیار کرتا ہے

اپنے تعریف کرنے والوں سے
حق تعالیٰ بھی پیار کرتا ہے

اندر اندر بھی گھل رہا ہے ظفر
بالا بالا بھی پیار کرتا ہے

☆

چولا جو بھی ماپ کا ہے
ٹھیک ہمارے ناپ کا ہے

اُس کی محفل کا منظر
اب بھی آپو دھاپ کا ہے

صرف اشارے کرتا ہوں
باقی کام تو آپ کا ہے

آپ کا ہے یہ سازِ سخن
یا پھر آپ کے باپ کا ہے

پانی کی تصویر ہے، اور
شور شڑاپ کا ہے

خالی ڈھول ہوں، اور سارا
کیا کرایا تھاپ کا ہے

میری ساری کوشش پہ
شبہ سا اُس کی چھاپ کا ہے

کچھ ملاؤ، تُم پہ اثر
کس منتر کے جاپ کا ہے

فرق اُن میں، اور، مجھ میں، ظفر
صرف اناپ شناپ کا ہے

☆

میں نے کہا، بسنت ہے، آؤ، پتنگ اُڑاؤ
تھا اس کا یہ جواب کہ جاؤ، پتنگ اُڑاؤ

کیوں کاٹتے ہو ڈور ابھی درمیان سے
اب دو گھڑی تو سیدھے سبھاؤ پتنگ اُڑاؤ

ہے کوئی اور بھی جو تُمھاری نگاہ میں
روکا ہے کس نے جاؤ، اُڑاؤ، پتنگ اُڑاؤ

ہم کچھ مقابلہ تو نہیں کر رہے، جناب!
کچھ ہے اگر تو سامنے لاؤ، پتنگ اُڑاؤ

دل کا یہ آسمان تُمھارا ہے چار سُو
جس سمت سے بھی چاہو، بڑھاؤ، پتنگ اُڑاؤ

ہم نے سوالِ وصل کیا تھا کہ ایک دم
آگے سے ہنس دیے کہ ہٹاؤ، پتنگ اُڑاؤ

ایسے میں ہاتھ آئے جو وہ یارِ آشنا
اُس کو کہیں گھماؤ پھراؤ، پتنگ اُڑاؤ

اس آب گاہ کا یہ تقاضا ہے آج کل
پچھوے ہو تُم کہ اُوو بلاؤ، پتنگ اُڑاؤ

مانجھا نیا ہے، ڈور پُرانی سہی، ظفر
ہم سے بھی کوئی پیچ لڑاؤ، پتنگ اُڑاؤ

☆

طعنہ سا کم رہی کا
عشق وہی ہے وہی کا

آگے حالیؔ نے سنا
رولا ، پیچھے رہی کا

بڑھ کر پُوری سے بھی ہے
مطلب آدھی کہی کا

ملبہ وہی قدیم ہے
نئی عمارت ڈھی کا

کچھ تو لطف اُٹھائیے
دستر پر دوتہی کا

عیش تجاہُل کا کبھی
کبھی عذاب آگہی کا

کچھ تو نکلے گا کہیں
کھاتہ کھولیے بہی کا

کچھ تکلیف اَن سُنی کی
کچھ آرام ان سہی کا

یہی محبت ہے ، ظفرؔ
دودھ میں چھینٹا دہی کا

-☆-

آر سے پار کسی اور طریقے سے ہُوا
قابلِ کار کسی اور طریقے سے ہُوا

دل جو دھڑکا تھا اُسے دیکھتے ہی پہلے پہل
یہ لگاتار کسی اور طریقے سے ہُوا

اُس کی دُشوارگزاری تو عجب تھی ، لیکن
اتنا ہموار کسی اور طریقے سے ہُوا

اپنے اُسلوب سے کچھ ہم بھی اُسے ہٹ کے ملے
وہ بھی دوچار کسی اور طریقے سے ہُوا

عرضِ حال اُس سے کسی اور طرح چاہتے تھے
لیکن ، اظہار کسی اور طریقے سے ہُوا

کہیں مُمکن ہی نہیں تھا مرا یکسُو ہونا
پھر ، یہ انبار کسی اور طریقے سے ہُوا

ایک بار اُس کا طریقہ تھا کوئی اور ، مگر
دوسری بار کسی اور طریقے سے ہُوا

اُس کا امکاں نہ رہا اور طریقے سے تو وہ
چار و ناچار کسی اور طریقے سے ہُوا

شائبہ تھا کوئی اقرار کا بھی اس میں ، ظفرؔ
اب کے انکار کسی اور طریقے سے ہُوا

-☆-

کہا بھی، سنا بھی نکل آئے گا
کچھ اُس کے سوا بھی نکل آئے گا

اکیلے ہی نکلیں گے ہم، اور، پھر
کوئی دُوسرا بھی نکل آئے گا

بھلے ہی یہ باتیں بناتا ہے تُو
نتیجہ ترا بھی نکل آئے گا

وہ بستار تو ساتھ سونے پہ ہو
ابھی بوریا بھی نکل آئے گا

دوا نے دکھایا نہ کوئی اثر
تو دستِ دُعا بھی نکل آئے گا

یُونہی خلق برباد ہوتی رہے
کہیں سے خُدا بھی نکل آئے گا

بڑھی جس گھڑی حبس کی تیرگی
چراغ ہوا بھی نکل آئے گا

گرفتار اُسے دیکھنے کے لیے
ہما بھی، ہُما بھی نکل آئے گا

سفر کا ارادہ تو باندھو، ظفر
کوئی راستہ بھی نکل آئے گا

-☆-

دل میں داخل ہو گیا
آ کر شامل ہو گیا

سارا کُچھ دے کر اُسے
سب کُچھ حاصل ہو گیا

بات اب رُکنے کی نہیں
نمبر ڈائل ہو گیا

ایک ستارے سے فلک
جھلمل جھلمل ہو گیا

ہم تو تھے ہی فالتو
وہ بھی فاضل ہو گیا

جینا ممکن ہی نہیں
مرنا مُشکل ہو گیا

عالم تھا اک عُمر تک
پھر میں جاہل ہو گیا

بالغ بھی ہو جاؤں گا
جیسے عاقل ہو گیا

وہ تو قائم تھا، ظفر
میں ہی بُزدل ہو گیا

-☆-

یا تو آنے والا ہوں
یا میں جانے والا ہوں

ایک حقیقت ہے مجھ میں
ایک افسانے والا ہوں

پانی پینے والا تھا
کھانا کھانے والا ہوں

اعتبار کرے گا وہ
نئے بہانے والا ہوں

آگ لگا کر جنگل میں
مینہ برسانے والا ہوں

جو پیچھے ہیں، میں اُن کو
آگے لانے والا ہوں

میں نے چھپا لی تھی جو بات
وہی بتانے والا ہوں

اپنے سے طاقتور پر
ہاتھ اُٹھانے والا ہوں

رونا رو بیٹھا ہوں، ظفر
اب میں گانے والا ہوں

☆

روز ایسا تو نہیں ہوتا ہے
یہ ہمیشہ تو نہیں ہوتا ہے

نفع کچھ بھی نہیں ہوتا، نہ سہی
ضرر اتنا تو نہیں ہوتا ہے

پہلے ہوتا رہا جیسا، جو کچھ
اب بھی ویسا تو نہیں ہوتا ہے

اور اس سے بھی بُرے کیا ہو گے
تم نے اچھا تو نہیں ہونا ہے

ہو گا نقصان ہمارا ہی، چلو
کچھ تمھارا تو نہیں ہوتا ہے

قطرہ قطرہ ہے ضرورت اپنی
اس نے دریا تو نہیں ہونا ہے

نہیں ہوتا جو اُجالا سرِ دست
اور اندھیرا تو نہیں ہونا ہے

ابھی سیدھا نہیں ہوتا ہے اگر
کام اُلٹا تو نہیں ہونا ہے

ہم نے رہنا بھی ہے اس گھر میں، ظفر
آنا جانا تو نہیں ہونا ہے

☆

سیر ہو جیسے مدینے کی طرف
کبھی نکلو مرے سینے کی طرف

کبھی پتھر نہیں کھانے کے لیے
کبھی پانی نہیں پینے کی طرف

دور رہتا ہے نگینہ مجھ سے
میں تو ہوتا ہوں نگینے کی طرف

گر بلندی مری قسمت میں نہیں
کیوں لپکتا رہوں زینے کی طرف

دور موجیں مجھے لیتی جائیں
دیکھتا جاؤں سفینے کی طرف

وصل آثار جدائی میری
میرا مرنا مرے جینے کی طرف

کیا محبت کا مجھے دھیان آئے
ہے توجہ مری کینے کی طرف

کوئی اشراف کی اب قدر نہیں
سبھی جاتے ہیں کمینے کی طرف

کھل گیا دل میں دریچہ سا، ظفر
کچھ ہوا آئی پسینے کی طرف

☆

آتا جاتا رہتا ہوں
اور، پچھتاتا رہتا ہوں

کچھ تو مجھے بھی کرنا ہے
روتا گاتا رہتا ہوں

آپ بھی اک دن آ نکلیں
میں تو آتا رہتا ہوں

کوئی نہیں سنتا، لیکن
میں فرماتا رہتا ہوں

شرم نہیں آتی مجھ کو
اور، شرماتا رہتا ہوں

اک دیوار محبت سے
سر ٹکراتا رہتا ہوں

روتا رہتا ہوں دن رات
اور، ہنساتا رہتا ہوں

اپنی، اپنے دشمن کی
خیر مناتا رہتا ہوں

مجھے نہیں معلوم، ظفر
جو بتلاتا رہتا ہوں

☆

کھیلا اپنی جان پہ
اور ، اُس کے فرمان پہ

سناٹا سا گلی میں
بادل سا دالان پہ

شک بھی تھا اُس پہ مجھے
تھا بھی میرے گمان پہ

ایک اور حیران سا
ایک اور حیران پہ

رہنا مجھ سے دُور ہی
چڑھا ہُوا ہُوں سان پہ

کانوں کے پردے پھٹے
خوش بھی ہُوا اذان پہ

زور لگایا ہے بہت
آیا نہیں مکان پہ

سب کی نظریں لگی ہیں
میرے پاکستان پہ

ایک ظفر کیسے بھلا
چھا جاتا میدان پہ

-☆-

روکے نہیں رُکتے ، ہم
تُجھ سے نہیں رُکتے ہم

تُم روکتے ہو جیسے
ایسے نہیں رُکتے ہم

رُک جاتے ہیں آخر میں
پہلے نہیں رُکتے ہم

پانی ہی پلا ہم کو
پیاسے نہیں رُکتے ہم

جیسے کبھی رُکتے تھے
ویسے نہیں رُکتے ہم

روکو ہمیں آگے ہی
پیچھے نہیں رُکتے ہم

رُک کر ہی رُکیں گے اب
چلتے نہیں رُکتے ہم

سارے ہی کو روکو گے
آدھے نہیں رُکتے ہم

روکیں تو ، ظفر ، ہم کو
کیسے نہیں رُکتے ہم

-☆-

رونے سے کیا بھلا ہے
دھونے سے کیا بھلا ہے

پانے سے کیا گنوایا
کھونے سے کیا بھلا ہے

کوچے نے کیا ہے چھینا
سونے سے کیا بھلا ہے

اب جاگتا ہوں شب بھر
سونے سے کیا بھلا ہے

چاندی نے کیا دغا کی
سونے سے کیا بھلا ہے

ہوتے نہ ہم تو کیا تھا
ہونے سے کیا بھلا ہے

اک ذائقے کے علاوہ
چھونے سے کیا بھلا ہے

وہ بھی ہے صاف خالی
ٹونے سے کیا بھلا ہے

دن رات بوجھ اپنا
ڈھونے سے کیا بھلا ہے

☆

کوئی آتا ہمارے راستے میں
تو اُس کو روک رکھتے راستے میں

تمھارا راستا معلوم ہوتا
تو ہم ہوتے تمھارے راستے میں

نہیں ہے راستہ کوئی بھی آگے
ملے ہیں آ کے اچھے راستے میں

وہ جن کا ایک ہی بس راستا ہو
بچھڑ جاتے ہیں کیسے راستے میں

ہمیں منزل سے کیا شکوہ کہ ہم نے
بہت نقصان اُٹھائے راستے میں

ہمیں اندازہ ہی اس کا نہیں تھا
ہیں جتنے عیب سیدھے راستے میں

جُداگانہ سفر آغاز کر کے
کسی سے جا کے ملتے راستے میں

سفر آسان ہو جاتا ہمارا
یہی تھا اُس انوکھے راستے میں

ظفر، چھوڑو، اب اپنا راستا لو
ہے کیا رکھا کسی کے راستے میں

☆

آتا جاتا کافی ہے
یہی بہانہ کافی ہے

ایک حقیقت کے پیچھے
ایک افسانہ کافی ہے

چلو، نظر آتے تو ہو
ہاتھ نہ آنا کافی ہے

چار نئے ہیں ناکافی
ایک پُرانا کافی ہے

آئے نہ آئے ہمیں سمجھ
یہ سمجھانا کافی ہے

چُومنا کیا اُن بالوں کو
ہاتھ لگانا کافی ہے

حال بتانا ہے مشکل
ابھی چھپانا کافی ہے

چھٹنے کی اُمید رکھو
تانا بانا کافی ہے

بھینس کے آگے ابھی، ظفر
بین بجانا کافی ہے

-☆-

جو کہتے ہو، ٹھیک ہے
تُم سچے ہو، ٹھیک ہے

ہم جھوٹے ہیں، تُم ہمیں
جو سمجھے ہو، ٹھیک ہے

جلدی جانے کے لیے
آ جاتے ہو، ٹھیک ہے

مانتے نہیں اگر کوئی
سُن لیتے ہو، ٹھیک ہے

ہم کو اچھے لگتے ہو
تُم جیسے ہو، ٹھیک ہے

مَیں نے تو کچھ نہیں کہا
جو کرتے ہو، ٹھیک ہے

جیسے بھی، تُم جس طرح
خوش رہتے ہو، ٹھیک ہے

دھیان ہمارا آج کل
جو رکھتے ہو، ٹھیک ہے

جھوٹا سچا جو، ظفر
کہہ لیتے ہو، ٹھیک ہے

-☆-

سفر پہلے ہی جیسا ہے
یونہی ویسے ہی جیسا ہے

کبھی ہے مختلف اتنا
کبھی ایسے ہی جیسا ہے

کسی کی طرح کا ہوں میں
کوئی میرے ہی جیسا ہے

غنیمت جانیے اس کو
جو وہ کیسے ہی جیسا ہے

ابھی بدلا نہیں ہے وہ
ابھی آگے ہی جیسا ہے

وہ خود اچھا نہیں اتنا
چلو ، اچھے ہی جیسا ہے

ابھی پہنچا نہیں ، شاید
کہیں آتے ہی جیسا ہے

ہمارے پیار کا پہیا
وہی چلتے ہی جیسا ہے

ظفر اندھا نہیں آخر
مگر اندھے ہی جیسا ہے

☆

بھیجا خالی ہو گیا
رتبہ عالی ہو گیا

وہ بھی تہمت بن گئے
میں بھی گالی ہو گیا

کھاتے اس کو ڈال کر
خود میں تھالی ہو گیا

بجے اکیلے ہاتھ سے
ایسی تالی ہو گیا

بنجر پڑی زمین کا
آخر ہالی ہو گیا

آیا تھا مہمان وہ
یوں گھر والی ہو گیا

میں بھی اس کے باغ کا
جا کر مالی ہو گیا

بول انوکھا تھا کوئی
بات نرالی ہو گیا

عاصی تھا پہلے ، ظفر
پھر کرتالی ہو گیا

☆

کچھ پسینے کو پتا لگنے دے
سامنے آ کے ہوا لگنے دے

مجھے اچھا نہیں لگتا ہے تو
اور ابھی مجھ کو بُرا لگنے دے

دیکھ لے، مَیں نہیں اوروں جیسا
مجھے اوروں سے جُدا لگنے دے

یہ محبت کی فضا ہے، اس کو
کچھ محبت کی فضا لگنے دے

خود فریبی ہے تو میری ہے، میاں
نارسائی کو رسا لگنے دے

یہ دھواں ہے تو دھواں ہی ہو گا
تُو اِسے مجھ کو گھٹا لگنے دے

دخل انداز نہ ہو بیچ میں یُوں
وہ خُدا ہے تو خُدا لگنے دے

دیکھنا بھی بہت اُس کا ہے کہ مَیں
اُس کو جیسا بھی لگا، لگنے دے

ڈال پردہ نہ محبت پہ، ظفر
یہ خطا ہے تو خطا لگنے دے

☆

یہ ابھی ظفر، اُس کی قیمت لگائی
مرے پیچھے اُس نے مُصیبت لگائی

بہت وہ پڑا تنگ جب خودسری سے
تو گملے میں اُس نے محبت لگائی

بہت مختصر کام تھا عرضِ اُلفت
مگر، اِس میں کتنی ہی مُدّت لگائی

وہ ہارا تو تھا آپ ہی، لیکن، اُس نے
مرے ذمّے اپنی ہزیمت لگائی

کوئی اور الزام اُس پر نہ سُوجھا
تو اپنی محبت کی تُہمت لگائی

وہ مغرور جب زور و زر سے نہ مانا
تو پھر داو پر اپنی عزت لگائی

یہ رُسوائی مَیں نے خریدی ہے آخر
کسے کیا خبر کتنی دولت لگائی

ہے فرمائش اُس کی اگر بازیِ جاں
تو کہہ دو اُسے، مَیں نے وہ مت لگائی

ظفر، کام گھٹیا ہی تھا، لیکن اس پر
کبھی مَیں نے اپنی شرافت لگائی

☆

گھر کے اندر بیٹھا ہوں
جیسے باہر بیٹھا ہوں

پھر اُٹھنے کو کہتے ہو
ابھی تو اُٹھ کر بیٹھا ہوں

کبھی کبھی اُٹھنے کے لیے
اکثر اکثر بیٹھا ہوں

کبھی کھڑا ہوں دُور اُس سے
کبھی برابر بیٹھا ہوں

ایک سخی کے رستے میں
کوئی گداگر بیٹھا ہوں

جہاں سے اُس نے اُٹھایا تھا
وہیں مکرر بیٹھا ہوں

میرے لیے نشست کہاں
اپنے اُوپر بیٹھا ہوں

نوکری سے برخواست ہوا
فارغ ہوں ، گھر بیٹھا ہوں

مَیں نے کہاں جانا تھا ، ظفر
جانِ برادر ، بیٹھا ہوں

☆

اب کیا کہتے ہو
سب کیا کہتے ہو

کُچھ معلوم نہیں
کب کیا کہتے ہو

جب کہتے نہیں کُچھ
تب کیا کہتے ہو

صبحِ سخن ہے کیا
شب کیا کہتے ہو

ہار سنگار کے بعد
چھب کیا کہتے ہو

کہتے تو ہیں سبھی
ڈھب کیا کہتے ہو

چھوڑو کانوں کان
لب کیا کہتے ہو

کبھی نہا دھو کر
ٹب کیا کہتے ہو

گونگے ہو تو ، ظفر
جب کیا کہتے ہو

☆

تلخیوں کے ساتھ ہوں
ذائقوں کے ساتھ ہوں

دشمنوں کے درمیاں
ساتھیوں کے ساتھ ہوں

آئنوں سے دُور دُور
حیرتوں کے ساتھ ہوں

کِس طرح کا ہم نوا
اور، کیوں کے ساتھ ہوں

اُلجھنیں ہیں میرے ساتھ
اُلجھنوں کے ساتھ ہوں

منزلوں کو چھوڑ کر
راستوں کے ساتھ ہوں

بے چراغ و بے سُراغ
بستیوں کے ساتھ ہوں

بے تکا ہوں آپ بھی
بے تکوں کے ساتھ ہوں

صُلح کُل ہوں، اور، ظفر
باغیوں کے ساتھ ہوں

-☆-

جتنا جیسے نیچے ہے
اُتنا ایسے نیچے ہے

اُوپر اُوپر ہیں سب لوگ
کون کسی کے نیچے ہے

اُترو گے تو دیکھو گے
کیسے کیسے نیچے ہے

دیکھتے جاؤ، گِرتے جاؤ
اور بھی آگے نیچے ہے

اُوپر بیٹھ گیا ہے جو
وُہی ہمارے نیچے ہے

اُوپر اُوپر کُچھ بھی نہیں
سب کُچھ نیچے نیچے ہے

کبھی ہمارے اُوپر سا
کبھی تُمھارے نیچے ہے

میری کیا توفیق یہاں
سب کُچھ تیرے نیچے ہے

شُکر ہے، میری ذات، ظفر
میرے اپنے نیچے ہے

-☆-

گھر میں شام اندھیرا
شارعِ عام اندھیرا

بے آغاز محبت
بے انجام اندھیرا

کچھ دل گیر جدائی
کچھ کہرام اندھیرا

پھانسے، اور، پھڑکائے
دانہ و دام اندھیرا

اک دانش تنہائی
اک پیغام اندھیرا

تیرے خواب ستارے
میرا نام اندھیرا

یہ بے رنگ فضائیں
وہ گلفام اندھیرا

روشنی پختہ کتنی
کتنا خام اندھیرا

اور، ظفر، ہے کب تک
یہ ناکام اندھیرا

-☆-

گرتے پڑتے ہوئے بھی
پانو پکڑتے ہوئے بھی

کچھ تو باقی رہ گیا
گلتے سڑتے ہوئے بھی

ٹہنی کا بوسہ لیا
پھول نے جھڑتے ہوئے بھی

کچھ گنجایش رہ گئی
اتنا لڑتے ہوئے بھی

پیچھے ہٹنے کے لیے
آگے بڑھتے ہوئے بھی

باہر کا چسکا لیا
اندر ترتے ہوئے بھی

کچھ تو بن ہی جائے گی
بات بگڑتے ہوئے بھی

ہاتھ چھڑا کر گیا وہ
بچھڑتے ہوئے بھی

مطلب غائب تھا، ظفر
چہرہ پڑھتے ہوئے بھی

-☆-

کچھ تو کرنا پڑے گا
یا پھر مرنا پڑے گا

کہیں روانی رہے گی
کہیں ٹھہرنا پڑے گا

رستے سارے بند ہیں
جاں سے گزرنا پڑے گا

کبھی سرِ تسلیم خم
کبھی مکرنا پڑے گا

اُس دریا میں ڈوب کر
پار اُترنا پڑے گا

ابھی بگڑنے کے لیے
اور سنورنا پڑے گا

اُس کو جیتنے کے لیے
کیا کچھ ہرنا پڑے گا

اسی میں ہے کچھ بہتری
اُس سے ڈرنا پڑے گا

زندہ رہنے کو ، ظفر
چگنا ، چرنا پڑے گا

-☆-

شور شرابا مزے کا
جینا مرنا مزے کا

حُسن کریلا سا کوئی
کڑوا کڑوا مزے کا

روٹی بھی تھی کڑکتی
سالن بھی تھا مزے کا

آدھا پھینک آئے کہیں
تھا وہ آدھا مزے کا

مرچ مسالہ تھا وہاں
کیسا کیسا مزے کا

بدمزگی میں بھی وہی
سارا چسکا مزے کا

ہنسنا کھیلنا ، اور ، پھر
رونا دھونا مزے کا

آپ اُس کو جو بھی کہیں
تھا وہ بندہ مزے کا

اندر والے سے ، ظفر
باہر والا مزے کا

-☆-

اور کچھ کہہ نہیں سکتے فی الحال
دن ہمارے نہیں اچھے فی الحال

اتنے حیران ہوئے ہیں کیوں آپ
ہم بھی ہیں آپ ہی جیسے فی الحال

کرتے رہتے ہو پریشاں جن کو
ہیں یہی خواب ہمارے فی الحال

آپ بھی ظلم نہیں ڈھاتے ہیں
عشق ہم بھی نہیں کرتے فی الحال

تھے جو انداز ہمارے لیے صرف
ہم نے وہ بھی نہیں دیکھے فی الحال

اُس کی بجلی نہیں چمکی سرِ دست
اُس کے بادل نہیں گرجے فی الحال

مہرباں تم بھی ہو کافی ہم پر
اور، ہم بھی ہیں تمھارے فی الحال

یہ تو ٹھہریں گے بہت ناکافی
جو دکھائے ہیں تماشے فی الحال

سیکھ جائیں گے ظفر جلدی ہی
شعر اچھا نہیں کہتے فی الحال

-☆-

ایسی رات گزاری ہو گئی
پہلی بار دوباری ہو گئی

وہاں تو مان گئی تھی سب کچھ
آ کے یہاں انکاری ہو گئی

جہاں مجھے جوتے پڑتے تھے
وہیں مری سرداری ہو گئی

سارے تیرے تانے بانے
چوری ہو گئی، یاری ہو گئی

پہلے مجھ سے پیار کیا، اور
پھر اللہ کو پیاری ہو گئی

بھاؤ تاؤ کرتے ہی کرتے
بات ذرا بازاری ہو گئی

ہم پیتے ہی رہ گئے سگرٹ
اور، وہاں افطاری ہو گئی

حرف شفا پاتے ہیں مجھ سے
یہی مجھے بیماری ہو گئی

سب نے ناشاعر گردانا
پوری بات ہماری ہو گئی

-☆-

اتنی باریکیاں، مرے صاحب
چھوڑیے چھوڑیے، ارے صاحب

آپ کو سب حساب ہے معلوم
آپ کس بات میں پڑے صاحب

آپ کا عفو بھی بڑا ہو گا
آپ ہیں جس قدر بڑے صاحب

کچھ توجہ ہماری جانب بھی
ہم بھی ہیں راہ میں کھڑے صاحب

دیکھنا کیا ہمارے عصیاں کا
اپنی رحمت کو دیکھیے صاحب

ہم جو بندے تھے اور بشر بھی تھے
اور، خطاکار بھی ہوئے صاحب

اگر انصاف اپنا ہونا ہے
جیتے جی ہم تو مر گئے صاحب

اب کھڑے ہیں اگر کٹہرے میں
آئے بھی تھے اسی لیے صاحب

ہے ظفر بھی اُمیدوار کرم
یہ خزانے رہیں بھرے صاحب

☆

جس نے اک عمر دل میں شور کیا
وہ بہت کم رہا ہے آنکھوں میں
ناصر کاظمی

کچھ زاویۂ منظرِ دُنیا تو نیا ہو
آنکھیں جو پُرانی ہیں، تماشا تو نیا ہو

ہونے میں کوئی عذر نہیں ہے مجھے، لیکن
جو چل بھی سکے ساتھ زمانہ تو نیا ہو

آغاز بھی ہوتا ہے وُہی اور وُہی انجام
اس بار سُنانا ہے جو قصّہ تو نیا ہو

کچھ دیر تو ہم بھی اُسے پہچان نہ پائیں
ملبوسِ تغافل کوئی پہنا تو نیا ہو

اس گھر میں کسی اور بھی جانب سے ہوا آئے
جنگل کی طرف کوئی دریچہ تو نیا ہو

مانا کہ زباں ہو نہیں سکتی نئی، لیکن
کچھ اس کے برتنے کا طریقہ تو نیا ہو

کروٹ کوئی اِک تازہ تو بدلی ہو زمیں نے
پیغام فلک سے کوئی اُترا تو نیا ہو

اِک بار جسے دیکھ کے حیران ہی رہ جائیں
ایسا تو نیا ہو، کوئی ویسا تو نیا ہو

روزی نہیں کُھلتی تو، ظفر، خیر ہے، لیکن
قسمت کے ستارے کا چمکنا تو نیا ہو

☆

بُشریٰ منوّر، بابر نصر اللہ خاں
اور
محمد نصر اللہ خاں کے لیے

زندہ بھی خلق میں ہوں ، مرا بھی ہُوا ہوں مَیں
ہوں مختلف بھی ، ان میں پھنسا بھی ہُوا ہوں مَیں

جو اہلِ شہر کو کسی صورت نہیں ہے راس
ایسی یہاں پہ آب و ہوا بھی ہُوا ہوں مَیں

آزردہ کیوں ہیں اب مرے شیون پہ اہلِ باغ
کُچھ دن یہاں پہ نغمہ سرا بھی ہُوا ہوں مَیں

اِن بارشوں کی مُجھ کو تمنا بھی تھی بہت
دیوار سے ذرا سا مٹا بھی ہُوا ہوں مَیں

رہتا ہوں دُور اُس کے دلِ نرم سے ، مگر
پتّھر کی طرح اُس میں جڑا بھی ہُوا ہوں مَیں

زندہ ہوں پھر بھی ایک اُمیدِ بہار پر
پتا ہوں ، اور شجر سے جھڑا بھی ہُوا ہوں مَیں

رہتا نہیں ہوں بوجھ کسی پہ زیادہ دیر
کُچھ قرض تھا اگر تو ادا بھی ہُوا ہوں مَیں

رکھنے لگے ہیں کُچھ نظرانداز بھی یہ لوگ
منظر سے اپنے آپ ہٹا بھی ہُوا ہوں مَیں

اک دُور کے سفر پہ روانہ بھی ہوں ، ظفر
سُست الوجُود گھر میں پڑا بھی ہُوا ہوں مَیں

-☆-

جہاں کھڑا ہوں بہت ہی وہاں سے آگے ہے
زمین میرے لیے آسماں سے آگے ہے

ابھی تو فیصلہ ہونا ہے یہ کہ یہ دُنیا
کہاں سے پیچھے ہے آخر ، کہاں سے آگے ہے

ہوا عقب کی ہے اور کُچھ نظر نہیں آتا
کہ گردِ راہ جو ہے کارواں سے آگے ہے

کیا تھا منع جہاں پیش رفت سے اُس نے
ابھی سے اپنا قدم اُس نشاں سے آگے ہے

ابھی تو اس کی شروعات ہی نہیں ممکن
کہ شاعری تو زبان و بیاں سے آگے ہے

حریم ناز تک اُس کے مَیں آ تو پہنچا ہوں
مگر ، مَیں جانتا ہوں وہ یہاں سے آگے ہے

وہیں سے آتے ہیں موسم بدل بدل کے سبھی
وہ باغ جو مرے خوابِ گراں سے آگے ہے

پناہ چاہتے ہیں مُستقل جہاں دونوں
سو ، وہ جگہ کسی کُنجِ اماں سے آگے ہے

مرا وجُود کہ پسماندہ اس قدر ہے ، ظفر
ابھی تو میرے ہی وہم و گماں سے آگے ہے

-☆-

ٹوٹتی کیوں نہیں ، دیوار کے اندر کیا ہے
ہے جو انکار تو انکار کے اندر کیا ہے

خلق سہمی ہوئی پھرتی ہے گلی کوچوں میں
آخر اس ابرِ گراں بار کے اندر کیا ہے

لوگ اک دوسرے سے بات چھپاتے کیوں ہیں
بولتے کیوں نہیں اخبار کے اندر کیا ہے

سر پہ دیوان اُٹھائے ہُوئے پھرتے بھی ہیں ، اور
جانتے بھی نہیں طومار کے اندر کیا ہے

خود ہی کھل جائے گا پوشیدہ شرر کے دم سے
نہیں معلوم جو انبار کے اندر کیا ہے

کچھ تو ہے اور بھی پیچیدہ ہوا سے ہٹ کر
دیکھنا چاہیے ، اشجار کے اندر کیا ہے

دل جو ہے اتنا پُراُمید تو کیوں ہے ، ورنہ
ہے تو اصرار ہی ، اصرار کے اندر کیا ہے

مال بکتا نہیں کیوں اتنے خریداروں میں
یعنی اس گرمیِ بازار کے اندر کیا ہے

زیب و زینت ہے فقط ظاہری ، ورنہ تو ، ظفر
آپ ہی کہیے اِن اشعار کے اندر کیا ہے

-☆-

بے رنگ صبح و شام ابھی اور آئیں گے
ایسے ہی کچھ مقام ابھی اور آئیں گے

یہ دشمنی بھی یاد رہے گی تمام عمر
احباب میرے کام ابھی اور آئیں گے

اِس منظرِ ہوا میں کھلیں گے کچھ اور پھول
اس داستاں میں نام ابھی اور آئیں گے

ہوتی ہے ختم رونقِ ہستی ابھی کہاں
بازار اور بام ابھی اور آئیں گے

باقی ہے اُس کے دانۂ لب کی کشش ابھی
ہم اُس کے زیرِ دام ابھی اور آئیں گے

کتنی ہی خواہشوں کو ہم آزاد کر چکے
اِس طرح کے غلام ابھی اور آئیں گے

ہونا ہے اور عشق نے لاچار کچھ ابھی
ایسے کچھ انتظام ابھی اور آئیں گے

بڑھنی ہے اور تشنہ لبی اپنی صبح و شام
گردش میں اُس کے جام ابھی اور آئیں گے

اُس انجمن سے اُٹھ بھی گئے ہم تو اے ظفر
ہم جیسے خاص و عام ابھی اور آئیں گے

-☆-

جاتا کہاں تصویرِ تماشا سے نکل کر
دنیا میں ہی رہ جاؤں گا دنیا سے نکل کر

خشکی پہ بھی کافی ہیں مری موت کے اسباب
مایوس نہیں شورشِ دریا سے نکل کر

دروازہ کوئی ہو تو کسی روز، کسی شام
دیکھوں کبھی اس وسعتِ صحرا سے نکل کر

باہر بھی وہی ڈھول ہے، دھند اور دھواں ہے
دیکھا ہے بہت خوابِ تمنا سے نکل کر

اک لہر تھی اور لفظ تھے اور لوگ تھے موجود
پہنچے تھے جہاں بھی دلِ تنہا سے نکل کر

ہم خود سے نکل آئے جہاں تک نکل آئے
اب اور بھی خوش ہوں گے بقایا سے نکل کر

کیا چیز تھی اس شام جو رک رک کے رواں تھی
کچھ میری طرف اپنے سراپا سے نکل کر

پھر کوئی خبر ہی نہ پلٹ کر ملی اپنی
گم ہو گئے یوں خوابِ زلیخا سے نکل کر

لالچ کی، ظفر، مل کے ہی رہتی ہے سزا بھی
کم ہو گئے کچھ اور زیادہ سے نکل کر

☆

دوبارہ اپنے عہدِ جوانی میں آؤں گا
اس طبعِ خام کی جو روانی میں آؤں گا

فصلیں ابھی رہیں گی بہت میری منتظر
دریاؤں کے رکے ہوئے پانی میں آؤں گا

سن کر جسے یقیں ہی کریں گے نہ اہلِ دہر
اک واقعہ سا اپنی کہانی میں آؤں گا

آئندگاں کا راستہ روکوں گا تھوڑی دیر
جو جا چکے ہیں ان کی نشانی میں آؤں گا

الفاظ کے بغیر کٹے گا مرا سفر
واپس ہوا تو موجِ معانی میں آؤں گا

بھی ہیں میرے رنگ و روش، اس لیے کہیں
کچھ دن طبیعتوں کی گرانی میں آؤں گا

اس طرح سخت و سست کہیں گے مجھے یہ لوگ
تحریر سے زیادہ زبانی میں آؤں گا

کر دوں گا راکھ اپنے ہی اطراف دور تک
اک بار ایسی شعلہ بیانی میں آؤں گا

پتوں کا شور ہو گا مرے چار سو، ظفر
اس طرح کچھ ہوائے خزانی میں آؤں گا

☆

تھا سوگوار یوں تو ہمارے مآل پر
تھا خوش بھی آسمان و زمیں کے زوال پر

خواہش دھوئیں میں لپٹی ہوئی سی ہو جس طرح
اور، گرد سی پڑی ہوئی خواب و خیال پر

کیا وقت ہے کہ بندشِ بوسہ کے ساتھ ساتھ
قدغن بھی ہے لگائی ہوئی بول چال پر

ایسے میں ہم جواب کی رکھتے اُمید کیا
تھا اُس کا بھی سوال ہمارے سوال پر

پہلے تو ٹھیک تھا وہ مرے ساتھ، اور پھر
کیسا بدل گیا تھا مرے عرضِ حال پر

کُھلنے لگا کتاب کی صورت وہ آپ ہی
مَیں غور کر رہا تھا ابھی چال ڈھال پر

خُود سے ہی جیسے برسرِ پیکار ہُوں ابھی
قابو مَیں پا سکا نہ کبھی اس وبال پر

اک شخص کی جُدائی میں کاٹی تمام عمر
ساری گزر بسر رہی وہمِ وصال پر

خُود بھی وہ خُوب چوکس و چالاک ہے، ظفر
مُدت سے آپ کی ہے نظر جس کے مال پر

☆

کچھ تو ہوتا فقط آشفتہ بیانی کے سوا
واقعہ کچھ نہیں رکھتا ہے کہانی کے سوا

ہم لکھے بھی گئے دیوار ہوا پر، ورنہ
اپنے پاس اور نہ تھا کچھ بھی زبانی کے سوا

اپنے اُوپر ہی گرے گی کبھی دیوار پناہ
دوست کوئی نہیں اس دُشمنِ جانی کے سوا

کچھ علاج اس کا نہیں پاس کسی کے اب تو
یہ جو بے قیمتی اپنی ہے گرانی کے سوا

وہ بھی اک شبہ سا باقی ہے اگر سچ پُوچھو
اب یہاں کچھ بھی نہیں اپنی نشانی کے سوا

اُس کے آنے سے ہوئی اور بھی تنگی دل کو
اب کوئی چارہ نہیں نقل مکانی کے سوا

مُجھے کچھ اور ہی مطلوب تھا اے خوابِ سخن
ورنہ کیا لفظ میں رکھا ہے معانی کے سوا

اسی طوفان میں ہم ڈوب کے اُبھرے نہیں پھر
یاد سب کچھ ہے ابھی عہدِ جوانی کے سوا

شور تھا، اور، روانی تھی عجب کوئی، ظفر
اور، دریا میں ہر اک چیز تھی پانی کے سوا

☆

ساتھ ہی عزت و اکرام سے باہر ہوئے ہم
جس گھڑی دائرۂ عام سے باہر ہوئے ہم

اپنا آغاز ہی ایسا تھا کہ اے خوابِ ہوس
دیکھتے دیکھتے انجام سے باہر ہوئے ہم

اس کی شہرت ہی کچھ ایسی تھی کہ بس کیا کہیے
رفتہ رفتہ دلِ ناکام سے باہر ہوئے ہم

پختہ کاری کی تمنا ہی کبھی کی ہم نے
نہ کبھی اس روشِ خام سے باہر ہوئے ہم

طمعِ دانہ بھی اب تو نہیں دل میں باقی
خود ہی کہہ دے جو ترے دام سے باہر ہوئے ہم

کچھ ہمیں پیرہنِ خاک سے اچھا نہ لگا
نہ ہی اس جامۂ احرام سے باہر ہوئے ہم

وقت ایسا بھی اک آیا کہ بہت دیر کے بعد
شام ہم سے ہوئی اور شام سے باہر ہوئے ہم

کارِ عشق ایک طرح کی کوئی بیگار تھی کیا
کام ہوتے ہی جہاں کام سے باہر ہوئے ہم

رنگِ محفل کو، ظفر، بھانپ لیا تھا ہم نے
اور، خود ہی بڑے آرام سے باہر ہوئے ہم

-☆-

یہی پانا اگر ہے، اس کو کھوتے بھی تو کیا تھا
بچا لائے ہیں جو کشتی، ڈبوتے بھی تو کیا تھا

وہی خوابِ پریشاں گھیر لیتا ہر طرف سے
ہمارا جاگنا جو بھی ہے، سوتے بھی تو کیا تھا

کوئی تحریر ابھر آنی تھی اندر سے کہیں اور
یہ دیوارِ ندامت، اس کو دھوتے بھی تو کیا تھا

ہمیں نقلِ مکانی راس کب آئی ہے پہلے
کمر پر اپنی یہ اسباب ڈھوتے بھی تو کیا تھا

گزر جانی تھی عمرِ رایگاں ویسے بھی اپنی
جو ہنستے بھی تو کیا تھا، اور، جو روتے بھی تو کیا تھا

یہاں پالا تو پڑنا تھا اسی آب و ہوا سے
زمینِ شعر میں کچھ بیج بوتے بھی تو کیا تھا

بھڑک اٹھنی تھی اپنی پیاس پہلے سے بھی کچھ اور
ترے دریا سے ہونٹوں کو بھگوتے بھی تو کیا تھا

مزاجوں میں ہی اتنا فرق تھا اپنے کہ آخر
کسی شے میں کسی شے کو سموتے بھی تو کیا تھا

ظفر، شاعر بھی ہو جانا ہمارا تھا کوئی کام
جو ہوتے بھی تو کیا تھا، اور، نہ ہوتے تو بھی کیا تھا

-☆-

جبر کو خواب کا دمساز ہم نے کر دیا ہے
جو ممکن ہی نہ تھا اعجاز ہم نے کر دیا ہے

کبھی کر کے دکھائی ہے ہوا سے ہمکلامی
کبھی پر روشنی کو راز ہم نے کر دیا ہے

کبھی اک چیز سے چیزیں نکالی ہیں بہت سی
کبھی اک لفظ کو الفاظ ہم نے کر دیا ہے

کھڑی کی ہے رکاوٹ خود ہی اپنے راستے میں
کسی دیوار میں در باز ہم نے کر دیا ہے

اگر موجود کر لائے ہیں ناموجود کو ہم
اگر گمنام کو ممتاز ہم نے کر دیا ہے

وہی کچھ کام آیا ہے ہمارے زندگی میں
وہ اندازہ جسے انداز ہم نے کر دیا ہے

کبھی شامل نہیں تھا کھانے پینے میں کبھی جو
اسی کو دعوتِ شیراز ہم نے کر دیا ہے

کوئی تبدیلی آب و ہوا بھی چاہیے تھی
وہ راضی تھا جسے ناراض ہم نے کر دیا ہے

ظفرؔ، اک عکس تھا تو آج ہے تصویر پوری
وہ آہٹ تھی جسے آواز ہم نے کر دیا ہے

☆

ملی مخلی مجبوری جیسا
قرب تھا کوئی دوری جیسا

طبع تھی کچھ زہریلی لیکن
ذائقہ اُس کا چُوری جیسا

ہر دم رنگ بدلتے رہتا
کالی جیسا، بھوری جیسا

اک دن ہمیں کراؤ پھر سے
ناشتہ حلوہ پوری جیسا

دونوں ہی درشن ہیں اُس کے
آدھی جیسا، پوری جیسا

ناف کے اندر باہر تھا وہ
بھبکا سا کستوری جیسا

دن ڈھلتے ہی چھا جاتا ہے
بادل سا رنجوری جیسا

اُس کے ساتھ ہے کچھ راتوں سے
کام سا ہمیں ضروری جیسا

رہا، ظفرؔ، خالی پن میں بھی
نشہ سا معموری جیسا

☆

اور کچھ کہہ نہیں سکتے فی الحال
دن ہمارے نہیں اچھے فی الحال

چوما چاٹی ہی ضروری نہیں کچھ
شکل تو آ کے دکھاتے فی الحال

بات پر ہو گا عمل بھی اک دن
بات پہلے تو وہ سمجھے فی الحال

جو بھی اوپر ہے وہ ظاہر ہے، مگر
کچھ نہیں آپ کے نیچے فی الحال

آپ کو تھوڑی غلط فہمی ہے
ہم نہیں آپ کے پیچھے فی الحال

ہم کہیں اور بھی ہوں گے اس وقت
آپ کے پاس ہیں آدھے فی الحال

انہی آثار سے چل سکتے ہیں
کچھ نشانات ہمارے فی الحال

کچھ مدارات نہیں گرچہ یہاں
ہمیں جانا نہیں آگے فی الحال

حال ظاہر بھی نہیں کچھ تو، ظفر
کچھ بیاں بھی نہیں کرتے فی الحال

☆

کیوں اسے اشارہ نہیں کیا
کر کے بھی دوبارہ نہیں کیا

وہ موجِ محبت ہو کہ نہ ہو
ہم نے ہی کنارہ نہیں کیا

ہم جوڑ نہ سکتے تھے اس کو
یوں پارہ پارہ نہیں کیا

اس کو تو نہیں تھا عذر کوئی
ہم نے ہی اجارہ نہیں کیا

بیماری خود ہی رفع ہوئی
کچھ ہم نے چارہ نہیں کیا

آیا تھا پیار بہت اس پر
کچھ سوچ کے سارا نہیں کیا

اپنے حالات بھی ٹھیک نہ تھے
اس نے بھی گزارہ نہیں کیا

وعدے وہ کرتا رہا بہت
اور، کام ہمارا نہیں کیا

سوتا کیا ساتھ، ظفر، جس نے
ملنا بھی گوارا نہیں کیا

☆

دیتے ہُوئے بیان بہُت
کھاتے ہیں وہ پان بہُت

ہوتا ہے سب کُچھ معلُوم
بنتے ہیں انجان بہُت

بیٹھے ہُوئے بھی رہتی ہے
کہیں کہیں سے اُٹھان بہُت

اور نتیجہ کیا نکلے
جُرأت کم ہے ، جان بہُت

کیا صحبتیں شامیں تھیں جب
پھرتے تھے حیران بہُت

اُوپر سے ہی لگتا ہے
کام نہیں آسان بہُت

وُہی نہیں ہو گا ، اے دل!
ہے جس کا اِمکان بہُت

مِلا نہ کوئی سُراغ اپنا
کروائے اعلان بہُت

دولت جتنی کم ہے ، ظفر
اُتنے ہی دربان بہُت

☆

فِقرے کستے بھی ہیں
ہم پر ہنستے بھی ہیں

آہستہ آہستہ
دیکھو ، پھنستے بھی ہیں

اُجڑے مُجڑے بھی ہم
ہنستے بستے بھی ہیں

دیکھتے بھی ہیں اُس کو
اور ، ترستے بھی ہیں

جہاں سے کوئی نہ گزرا
ایسے رستے بھی ہیں

اُوپر اُبھرے اُبھرے
نیچے دھنستے بھی ہیں

دستیاب ہیں اب ہم
شاید سستے بھی ہیں

دل بادل یہ آخر
کہیں برستے بھی ہیں

چھانو ، ظفر ، چھائی ہے
اور ، کُھلتے بھی ہیں

☆

گھر میں اُگے ہوئے ہیں نہ باہر اُگے ہوئے
ہم ہیں کہیں خود اپنے برابر اُگے ہوئے

چھوٹے بڑے، یہاں وہاں، پھیلے ہوئے تمام
انسان خاک پر ہیں سراسر اُگے ہوئے

رکھتے ہیں شہر بھر کو تروتازہ رات دن
جھونکے سے کچھ ہوا کے زمیں پر اُگے ہوئے

کرتے ہیں سائیں سائیں بہت ساری ساری رات
میرے درختِ خواب کے اوپر اُگے ہوئے

رکھتے ہیں تھرتھری میں مجھے مبتلا بہت
میرے وجود میں یہ کئی ڈر اُگے ہوئے

باہر جو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی
آنکھوں میں تھے نئے نئے منظر اُگے ہوئے

ان کے مکیں بھی ان میں اُگ آئیں گے ایک دن
خواب و خیال میں ہیں جو یہ گھر اُگے ہوئے

پودے سے آرزو کے اکھاڑے تھے جو کہیں
وہ دوسرے ہی دن تھے مکرر اُگے ہوئے

چڑیاں سی چہچہاتی ہیں جن میں بہت، ظفر
کچھ پیڑ ہیں جناب کے اندر اُگے ہوئے

☆

میرے جیسا ہو جا
ایسا ویسا ہو جا

پیچ بڑے ہیں تجھ میں
اِک دن سیدھا ہو جا

کچھ تو چھوڑ بُرائی
کچھ تو اچھا ہو جا

فرق نہیں پڑتا کچھ
چاہے دُگنا ہو جا

مہنگائی اتنی ہے
تھوڑا سستا ہو جا

میں تجھ کو دھو ڈالوں
کچھ کچھ میلا ہو جا

آنا تو ہے یہیں پر
چاہے جتنا ہو جا

پھر غصے سے یک دم
نیلا پیلا ہو جا

گولی مار ظفر کو
اور کسی کا ہو جا

☆

جو ہم سے شاعری میں گہرائی چاہتے ہیں
گہرائی ہی نہیں ، وہ یکتائی چاہتے ہیں

عزت بہت ملی ہے اس شہر میں بہر طور
تھوڑی سی اب یہاں پر رُسوائی چاہتے ہیں

کوئی تو ہو جو ہم کو آ کر کنویں میں پھینکے
درکار دوست کچھ ہیں ، کچھ بھائی چاہتے ہیں

ہو گی اسی طرح سے کچھ پیش رفت اپنی
تھوڑی سی عشق میں ہم پسپائی چاہتے ہیں

اُتنا ہی وہ علیحدہ ہم سے لگا ہے رہنے
ہم اُس کے ساتھ جتنی یکجائی چاہتے ہیں

شام و سحر ہماری کرتا ہے وہ بُرائی
حالانکہ ہم تو اُس کی اچھائی چاہتے ہیں

البتہ کام سارا آگے ہے ، اور ، خصوصی
بوسے تو صرف اُس کے دو ڈھائی چاہتے ہیں

دُنیا کے جھگڑوں سے رہتا ہے دُور ہم کو
وہ ساتھ ہو ، اک ایسی تنہائی چاہتے ہیں

کرنی ہے کھیتی باڑی اُس سرزمیں پہ ہم نے
کچھ کام اب ظفر ، ہم آبائی چاہتے ہیں

-☆-

شاعری کا بدل چکا ماحول
پڑھیے طبعِ رسا پہ اب لاحول

مصرعہ اس طرح نکلتا ہے
جس طرح خواب میں خطا ہو بول

پوسٹنگ آج کل ہے گھر میں ہی
ہوتی رہتی ہے رات دن چھترول

شعرائے کرام آتے ہیں
پرے باندھے ہُوئے یہ غول کے غول

جس سے نیکی کر ، اُس کے شر سے ڈر
یاد رکھ حضرت علیؓ کا یہ قول

چُومنے چاٹنے پہ لعنت بھیج
بات ہی ایک دن ہماری گول

کام بے جوڑ بھی نہیں اتنا
ہم ہیں خالص کھرل تو وہ ہے تول

زور کرتی ہے اُس کے بعد ہوس
پہلے آ کر گزر چلے جب ہول

تھے جو چاول ، ظفر ، کراچی میں
کاہنہ کاچھ میں جا ہُوئے ہیں چول

-☆-

اور احساسات ہیں ، دل اور ہیں
جیسے اب لوگوں میں شامل اور ہیں

ہم کو دے سکتے ہیں کیوں کر بھیک آپ
آپ کے دن رات سائل اور ہیں

جن سے ٹکراتی ہیں موجیں بار بار
یعنی اس دریا کے ساحل اور ہیں

اور تھے جن کی تمنا ہم نے کی
اور ، آخر ہم کو حاصل اور ہیں

فالتو ہم ہی نہیں اُس بزم میں
کچھ ہماری طرح فاضل اور ہیں

چھوٹا موٹا جھوٹ تو ہے اور کچھ
اور ، دعوے اپنے باطل اور ہیں

ہم نے سوچا بھی کیا جس دن انھیں
ہم سے وہ اُس دن سے غافل اور ہیں

گھاس تو ڈالی نہیں اُس نے کہیں
ہم ہی کیوں کر اُس پہ مائل اور ہیں

ہم تو خود ہی راہ دیتے ہیں ، ظفرؔ
آپ کے رستے میں حائل اور ہیں

-☆-

اندر ہی جل رہا ہوں پھکی
بیٹھے کہیں ناک پر نہ مکھی

بے سُود کسی بہانہ جُو پر
ہم نے بھی بہت اُمید رکھی

اِک عُمر کے اِنتظار کے بعد
اُس زہر کی ایک بُوند چکھی

خالی تھی جیب اپنی اور وہ
پُوری کی پُوری تھی نولکھی

وہ زیر و زبر تھی وصل کی رات
وکھی پر چڑھ رہی تھی وکھی

واللہ کہ آنکھ مارتے وقت
وہ صاف لگی تھی ایک اکھی

مَیں بھی تھا بلوچ ، اور ، وہ بھی
پُوری تھی ہر طرف سے ڈکھی

معنی تو نہیں ہیں اُس کے معلوم
اِک لفظ ضرور ہے چونکھی

تشدید کا زور تھا ، ظفرؔ ، وہ
کہنا ہی پڑا سکھی کو سکھی

-☆-

جس قدر بھی ہو ، نہیں بھرتا
شعر سے پیٹ تو نہیں بھرتا

منزل اُس کی طرف کب آتی ہے
دو قدم آپ جو نہیں بھرتا

خالی اِتنا ہے یہ طمع کا کنواں
سی جتنی کرو ، نہیں بھرتا

جی اُسے دیکھنے سے ، اے لوگو
رات دن بھی بھرو ، نہیں بھرتا

گریہ پہ میرا اختیار نہیں
آہ میں اب سے ، لو ، نہیں بھرتا

رنگ دِل میں تمھارے ہونٹوں کا
سُن لیا ہے ، چلو ، نہیں بھرتا

خواب دِل کو تمھاری صورت سے
بھر نہ پاؤں گا ، سو ، نہیں بھرتا

آج کی رات بازوؤں میں تمھیں
تم جو ناراض ہو ، نہیں بھرتا

دم ہماری وہ دوستی کا ، ظفرؔ
مُنھ سے کہتا ہے گو ، نہیں بھرتا

☆

رستے سے اگرچہ ہٹ گیا ہے
دل کے اندر سمٹ گیا ہے

کیا تھا جو مرے وجود میں کچھ
اندر اندر ہی کٹ گیا ہے

ایسے ہے کہ میرا قامت و قد
بڑھتے بڑھتے بھی گھٹ گیا ہے

کچھ کہہ بھی رہا تھا زیرِ لب وہ
اور ، کہتے ہُوئے پلٹ گیا ہے

مَیں گرد ہُوں کارواں کی اپنے
سب راستہ مجھ سے اٹ گیا ہے

میرا جو نیازمند تھا ، وہ
میرے ہی آگے ڈٹ گیا ہے

باہر بھی کشادگی سی ہے اب
اندر کا جو ابر چھٹ گیا ہے

اچھا نہیں لگ رہا ہے وہ بھی
ہر چیز سے جی اُچٹ گیا ہے

ہوتا تھا ظفرؔ بھی جو بھی ایک
کتنے حصّوں میں بٹ گیا ہے

☆

آخر پکے پکے سے
پیار کیا ہے دھکے سے

آدمی پھنسی ہے اپنے آپ
آدمی آنکھ مٹکے سے

کبھی چڑھایا رکشے پر
کبھی اُتارا پٹکے سے

تنگ آتا ہی تھا مجھ کو
آخر اینٹ کھڑکے سے

یعنی کوئی خیر خبر
کبھی نہ آئی ملکے سے

مجھ سے ملنے آئی تھی
ہٹ کر بھیڑ بھڑکے سے

رشتے داری ہے اپنی
باندر ٹھورے ٹکے سے

مجھے گزارے گا آخر
پھر سوئی کے ٹکے سے

شعر ظفر کے ہوتے ہیں
سارے کچے پکے سے

☆

اصل تو جھگڑا اور ہے
اُس نے سمجھا اور ہے

اس سے آگے بھی سفر
ہے، اور، کتنا اور ہے

بیٹھا رہ دم سادھ کر
ابھی تماشا اور ہے

اس کے علاوہ بھی ابھی
اُلٹا سیدھا اور ہے

دیکھیں گے چل کر، اگر
اُس کے جیسا اور ہے

یہ بھی اچھا ہے، مگر
اس سے اچھا اور ہے

دیکھا بھالا اور تھا
چوما چاٹا اور ہے

عشق تو کرتے ہیں، مگر
کام ہمارا اور ہے

کہتا ہو جو بھی، ظفر
لیکن، کرتا اور ہے

☆

ذائقہ بدلنا ہے
پھر بھی ، کیا بدلنا ہے

خود نہیں بدل سکتے
راستا بدلنا ہے

اور ، ابھی تو یہ منظر
جابجا بدلنا ہے

اس گھنے اندھیرے میں
اِک دیا بدلنا ہے

ہم نے ایک پیلے سے
اب ہرا بدلنا ہے

ایک بار پھر اُس نے
فیصلہ بدلنا ہے

تھی وہ اور تبدیلی
اب جُدا بدلنا ہے

شکل کُچھ نہیں ہے ٹھیک
آئنہ بدلنا ہے

یُوں ، ظفر ، بہُت مُشکل
آپ کا بدلنا ہے

☆

ایسا نہیں کیا کرتے

موقع کوئی شکایت کا
پیدا نہیں کیا کرتے

کرتے ہیں نخرا ، لیکن
اتنا نہیں کیا کرتے

دیکھو کبھی یہاں آ کر
کیا کیا نہیں کیا کرتے

اُونچ نیچ ہو جاتی ہے
ڈانٹا نہیں کیا کرتے

مل کر کرتے ہیں ہر کام
تنہا نہیں کیا کرتے

اتنے اُلٹے پلٹے کو
سیدھا نہیں کیا کرتے

دُوسروں کے ساتھ اتنی دیر
بیٹھا نہیں کیا کرتے

بدنامی ہوتی ہے ، ظفر
غوغا نہیں کیا کرتے

☆

جیسی یہ شاعری ہے ، ویسوں میں لا رہا ہوں
لوگوں کی چیز تھی یہ ، لوگوں میں لا رہا ہوں

باہر نکل کے دیکھو میرا جُلوسِ معنی
سڑکوں پہ چل رہا ہے ، گلیوں میں لا رہا ہوں

خود تک نہیں ہے روکی یہ طبع کی روانی
سارے ہی منتظر تھے ، ساروں میں لا رہا ہوں

اچھا کوئی زمانہ آتا ہے ایک ، اُس کو
جیندوں میں بھر رہا ہوں ، اشکوں میں لا رہا ہوں

اِک موجِ مُشترک جو حیراں ہے میرے اندر
اشکوں میں چل رہی ہے ، خوشیوں میں لا رہا ہوں

خوشبوئے تازہ جس کا مَیں نے سُراغ پایا
مَیں اُس کو آج سب کی سانسوں میں لا رہا ہوں

بھیجی ہے قریہ قریہ شہروں کی سرسراہٹ
دیہات کی حرارت شہروں میں لا رہا ہوں

یہ ذائقہ جو سب کو اچھا نہیں لگا ہے
اِتنے بھی ہیں غنیمت جتنوں میں لا رہا ہوں

اُلٹے ہیں کام سارے میرے ، ظفرؔ ، جو دیکھو
باغوں کی یہ ہوائیں کمروں میں لا رہا ہوں

☆

شعر و سخن بھی چاہیے
یہ اُلجھن بھی چاہیے

اِتنی قُربت میں بھی
کُچھ اَن بَن بھی چاہیے

گھر بھی ہے درکار ایک
ساتھ چمن بھی چاہیے

پیار ہی کافی نہیں ہے
پاگل پن بھی چاہیے

اِس رُوحانی عشق میں
کہیں بدن بھی چاہیے

یعنی ساتھ لگاؤ کے
ایک لگن بھی چاہیے

بھیک تو دینے کو ہے وہ
اب دامن بھی چاہیے

اِس تاریکی میں کہیں
کوئی کرن بھی چاہیے

اور ، ظفرؔ ، اِس شیر کو
سُندربن بھی چاہیے

☆

کیا کریں ، اب زندگی ہوتی نہیں
شور ہے اور شاعری ہوتی نہیں

کوئی دشمن ہی نہیں ہے دستیاب
اب کسی سے دوستی ہوتی نہیں

اُس کی خواہش ، اُس کے باغوں کی طلب
ہو بھی جاتی ہے ، کبھی ہوتی نہیں

یہ بھی ہے کوئی عذاب اِس شہر پر
دن چڑھے تک روشنی ہوتی نہیں

شے وہی رہتی ہے اکثر دستیاب
جو ہمارے کام کی ہوتی نہیں

دسترس میں ہی نہیں اپنی یہاں
ورنہ چیزوں میں کمی ہوتی نہیں

جس قدر دعویٰ کیا کرتا ہے وہ
اِتنی اُس میں سادگی ہوتی نہیں

ڈھونڈتے ہیں رائگاں اُس چیز کو
راستے میں جو پڑی ہوتی نہیں

زور کرتی ہے وہ کیفیت ، ظفر
کچھ دنوں سے سرسری ہوتی نہیں

☆

اِس اُچھلتے ہوئے دریا سے بہت پیچھے ہوں
اپنے ہی خواب تماشا سے بہت پیچھے ہوں

اِس لیے میرا لگاتا نہیں اندازہ کوئی
کہ مَیں دُنیا میں ہی دُنیا سے بہت پیچھے ہوں

ایک دو سے کہیں آگے نکل آتا ہوں تو کیا
مَیں مُسلسل تو بقایا سے بہت پیچھے ہوں

اپنی ہی خاک اُڑاتا ہوں ابھی رہ رہ کر
اور ، ابھی وسعتِ صحرا سے بہت پیچھے ہوں

میری عزت ہے ابھی تھوڑی بہت لوگوں میں
کہ ابھی اِس دلِ رُسوا سے بہت پیچھے ہوں

ابھی ممکن ہی نہیں ہے مرا ظاہر ہونا
ابھی ہر نقشِ ہویدا سے بہت پیچھے ہوں

پردۂ رنگ ہے اِس دشت کا مجھ پر ہمہ وقت
اور ، کسی صورتِ پیدا سے بہت پیچھے ہوں

کیسے پا سکتا ہوں اُس رنگِ رسائی کی جھلک
کہ مَیں اپنی ہی تمنا سے بہت پیچھے ہوں

کہیں اُس شوخ کی خلوت سے بھی آگے ہوں ، ظفر
کہیں اُس نقشِ کفِ پا سے بہت پیچھے ہوں

☆

دھواں دھار مرغولہ کیسا
یاد آیا ، اور ، بھولا کیسا

جب پہنچے اونچائی پہ ہم
ٹوٹ گیا وہ جھولا کیسا

آج بھی ملی نہیں مزدوری
ٹھنڈا پڑا ہے چولھا کیسا

نخریلی ہے کیسی دلھن
شرمسار ہے دولھا کیسا

ٹھٹکا اُس کو دیکھ کے یہ دل
اور ، خوشی سے پھولا کیسا

ذرا سا ہاتھ لگانے پہ وہ
ہوئی ہے آگ بگولا کیسا

کافی دیر ٹھہر کر میں نے
بوسہ وہی قبولا کیسا

اپنے اندر اور باہر میں
پھرتا رہا ہیولا کیسا

رہ جاتا ہے ، ظفر ، اکثر ہی
ڈھیلا مصرع اُولیٰ کیسا

☆

ہو گئی درپیش ابھی اور بھی کیا کیا مشکل
دین پیچیدہ بہت ، اور ، ہے دنیا مشکل

اب تو حالات ہیں ایسے کہ جو سچ پوچھو تو
ہو گیا اپنا کچھ اس شہر میں رہنا مشکل

دل کے احوال رہا کرتے ہیں ابتر اکثر
اور ، ہو جاتا ہے کچھ آپ سے کہنا مشکل

کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ترے ہوتے ہوئے
جینا اپنا کبھی ہو جائے گا اتنا مشکل

دیکھ سکنے کی دعا کرتے رہے ہم ، اور ، اب
سامنے ہے کوئی ، اور ، تابِ تماشا مشکل

اور ہوں گے جو محبت کو سمجھتے ہیں مذاق
ورنہ کوئی نہیں کام اس سے زیادہ مشکل

گھر بہت دور نہ تھا اُس کا ، مگر ، کچھ ہم کو
کبھی جانا ہوا مشکل کبھی آنا مشکل

نہ رہا وہ بہت آسان زمانہ تو ، کہیں
بیت جاتا ہے کبھی یہ بھی زمانہ مشکل

ہم نے چھو کر اُسے دیکھا ہی نہیں ورنہ ، ظفر
اُس کو اتنا بھی نہ تھا ہاتھ لگانا مشکل

☆

اسی دشت میں کوئی تھا سبزہ زار
جہاں اب نہیں ہے ذرا سبزہ زار

زمیں پر ستارے چمکنے لگے
بچھا آسماں پر نیا سبزہ زار

کیا مَیں نے بوسوں سے پامال اُسے
کُچھ اب کے عجب تھا ترا سبزہ زار

کہیں پانیوں پر وہ روئیدگی
کہیں پتھروں پر اُگا سبزہ زار

ترے راستے میں ، ذرا دیکھنا
پڑا ہے جو قالین سا سبزہ زار

محبت کی بارش ہُوئی زور سے
تو دیوار و در سے اُٹھا سبزہ زار

دکھائی نہیں دے رہی تھی زمیں
تھا ہر سمت پھیلا ہُوا سبزہ زار

اُٹھی کیا نگاہِ بہار آفریں
زمیں پر بنے جابجا سبزہ زار

وہ تھا گھاس کا ایک ٹکڑا ، ظفرؔ
مجھے چاہیے تھا بڑا سبزہ زار

-☆-



درپیش ہے صحرا وُہی صحرا سے گزر کر
دُنیا میں ہی موجُود ہُوں دُنیا سے گزر کر

دریا مرے اندر تھا کنارے پہ جو پہنچا
مَیں اور پریشاں ہُوا دریا سے گزر کر

اِک ریت رواں ہے مری سنسان رگوں میں
آیا ہُوں ابھی دشتِ تمنّا سے گزر کر

صُورت ہی نہیں کوئی تلافی کی وہاں پر
دیکھا ہے بہت سختی بے جا سے گزر کر

دیوار کوئی اور بھی ہے دُوسری جانب
دیکھے کوئی دیوار تماشا سے گزر کر

احوال تو یہ ہے کہ مَیں خُود ہی نہیں باقی
حیران ہُوں موجُود و مُہیّا سے گزر کر

مَیں کوئی کرن بن کے اندھیروں کی ہوا میں
دیکھوں گا کبھی اُس کے سراپا سے گزر کر

مُجھ سے تو سب اچھے تھے ، یقیناً بہت اچھے
آیا ہُوں بہت ادنیٰ و اعلیٰ سے گزر کر

یہ طبعِ رواں کیا ہے کہ ہر بار ، ظفرؔ ، مَیں
رُکتا ہُوں بہت مصرعِ اُولیٰ سے گزر کر

-☆-

جہاں تہاں مرا ہونا ہی تھا خسارے میں
وگرنہ میں ہی نہ تھا کاروبار سارے میں

میں اُس کو اپنی طرف کھینچتا رہا بے سُود
کہ پہلے پہلے کشش تھی بہت ستارے میں

پھر اُس کے بعد تو میں جیسے ڈھونڈتا ہی رہا
کہ ایک بار تو میں خود بھی تھا نظارے میں

بھٹک رہا تھا میں راتوں کی رہگزر پہ ، مگر
مرے لیے تو وہی شام تھی شرارے میں

میں ایک بار تو بس یوں ہی اُس سے درگزرا
وگرنہ تھی کوئی حیرت بھی استعارے میں

مجھے سمجھنے میں کچھ دیر لگ گئی تھی وہاں
کہ اب کے تازہ معانی تھے اُس اشارے میں

میں درمیاں سے ہی واپس پلٹ پڑا اُس رات
کہ فاصلہ تھا بہت دُوسرے کنارے میں

مجھے بہت ہے وہ دیوار ہو کہ دوست کوئی
وگرنہ فرق بھی ہوتا ہے کچھ سہارے میں

بس اب تو جیسے بہت دیر ہو چکی ہے ، ظفر
کچھ اختیار ہی باقی نہیں ہمارے میں

☆

اندھیرا ہوا یا اُجالا ہوا
کوئی کام اب کے نرالا ہوا

کسی اور میں جا سمائے گا اب
کہیں اور سے یہ نکالا ہوا

ہوا ہے جو اب اس قدر ستر پوش
ہمارا بھی ہے دیکھا بھالا ہوا

جو نیچے کا تھا کام ، ہم آپ سے
وہی ایک دن بالا بالا ہوا

چلو ، ہم نہیں ہیں تو اُس پر یہاں
کسی نے تو ہے ہاتھ ڈالا ہوا

نکل آئے گا ، دیکھنا ، ایک دن
کسی اور سانچے میں ڈھالا ہوا

غنیمت ہے جو اتنی مُدّت کے بعد
وہاں سے کوئی آنے والا ہوا

سروں پر جو گرتا نہیں آسماں
کسی نے تو ہے یہ سنبھالا ہوا

مصیبت ، ظفر ، آئے گی آج ہی
جسے ہم نے کل پر ہے ٹالا ہوا

☆

خدائی نے پوچھا کیا دیر تک
مجھے یاد آیا خدا دیر تک

وہ آندھی تھی یا کوئی طوفان تھا
چلی میرے اندر ہوا دیر تک

خوشامد ذرا اُس کی مطلوب تھی
مجھے مُسکرانا پڑا دیر تک

کوئی دھوپ تھی کڑکڑاتی ہوئی
کوئی ابر سر پر رہا دیر تک

کوئی بات پلّے نہیں پڑ سکی
کہا دیر تک ، اور ، سُنا دیر تک

بدل کر ذرا دیکھیے زاویہ
لگے گا یہ پیلا ہرا دیر تک

کوئی انقلاب آنے والا نہیں
رہے گا یہی سلسلہ دیر تک

جھلکتا ہے باغ بدن دوگھڑی
دھڑکتا ہے رنگِ قبا دیر تک

رسیلے غضب تھے ظفر اُس کے ہونٹ
وہ شہتوت مُنہ میں گھلا دیر تک

☆

دیکھنے میں یوں تو یہ سارے کا سارا پھول ہے
اصل میں کچھ اور ہے ، ایسا تماشا پھول ہے

پھڑپھڑاتا ہے مرے باہر کی ہریالی میں چاند
میرے اندر کی ہواؤں سے اُلجھتا پھول ہے

ایک ہی رنگت ہے اور خوشبو بھی دونوں کی وہی
دُور سے کھلتا نہیں یہ زخم ہے یا پھول ہے

آج کل خصلت بھی آپس میں یہ ہے کیا بدلی ہوئی
دل مہکتا ہے شب و روز ، اور ، دھڑکتا پھول ہے

دشت کیا دایم شگفتہ ہے مرے پیشِ نظر
اور ، دریا جلد ہی مُرجھانے والا پھول ہے

پتّی پتّی بن رہا تھا بادلوں میں جو کہیں
اب اگر دیکھو تو کچھ آگے دوبارہ پھول ہے

استعارہ اصل سے ہونے نہ پائے گا الگ
اس طرح سے پھول پر اُس نے سجایا پھول ہے

ہونٹ یوں شیر و شکر ہیں ، کچھ پتا چلتا نہیں
یہ تمھارا پھول ہے یا وہ ہمارا پھول ہے

مَیں وہ غنچہ ہوں ، ظفر ، جس کو نہیں کوئی خبر
جو برآمد ہو گا مجھ میں سے وہ کیسا پھول ہے

☆

اُس کا گلاب ، اپنا گریبان جائے گا
دونوں کا اس نزاع میں سامان جائے گا

پہلا پڑاو اپنا بھی ہو گا وہیں کہیں
جس باغِ سبز تک یہ بیابان جائے گا

آنے میں ، اور ، جانے میں اُس کے یہی ہے فرق
مُشکل جو آئے گا بہت آسان جائے گا

آیا تو جانتا ہے وہ مجبوریاں مری
حیران جائے گا نہ پریشان جائے گا

ہو جس لباس میں بھی ، وہ جس کے بھی ساتھ ہو
یہ دل ہزار میں اُسے پہچان جائے گا

اُس کو تو کوئی شوقِ پرستش نہیں ، مگر
ان حرکتوں سے اپنا ہی ایمان جائے گا

یُوں بار بار اُس سے تقاضا نہیں دُرست
اتنی سی بات آپ بھی وہ مان جائے گا

تشویش کی کسی کو ضرورت نہیں یہاں
میری حُدود تک ہی یہ طوفان جائے گا

اب اُس سے کیا کہیں کہ محبت میں ہیں ، ظفر
ملتا رہا تو خُود ہی کبھی جان جائے گا

☆

کوئی شعبدہ تھا کہ اعجاز تھا
کُچھ ایسا ہی وہ رنگِ آواز تھا

مری یاد میں جلسۂ تعزیت
مُجھے بُھول جانے کا آغاز تھا

ہوا ایک دیوار تھی سامنے
نہ کوئی دریچہ نہ در باز تھا

کہیں تھی کوئی کوششِ دار و گیر
کہیں ایک خوابِ تگ و تاز تھا

مری دسترس میں نہیں تھی کبھی
وُہی چیز جس پر مجھے ناز تھا

وُہی تھا طریقِ تغافل ابھی
وُہی مُسکرانے کا انداز تھا

محبت سے اُس نے پکارا اگر
تو اِس میں بھی اُس کا کوئی راز تھا

نہ دیکھا ہمیں کھول کر خلق نے
پڑا ایک طومارِ الفاظ تھا

مَیں تنہا نہیں تھا ، ظفر ، میرے ساتھ
کوئی دُوسرا بھی سخن ساز تھا

☆

کوئی باقی ہے ابھی دل میں تماشا لگنا
تھا یہ اتنا جو تمھارا ہمیں اچھا لگنا

دل کا پھیلاؤ ہی ایسا ہے کہ اِس کا ہر وقت
ہُوا ممکن کبھی صحرا ، کبھی دریا لگنا

کتنا مشکل ہے ابھی شام کا ہونا شبنم
کتنا آساں ہُوا سارے کا سراپا لگنا

برف ہے کوئی پگھلتی کسی کُہسار سے دُور
بات ہے کوئی ترے ساتھ ہمارا لگنا

ایک تصویر چمکتی وہ نظر سے ہٹ کر
ایک تحریر کا آنکھوں سے دوبارہ لگنا

کبھی اسرار زمانے کے کبھی کُھل جانے
کُچھ سمجھ ہی میں نہ آنا ، کبھی ایسا لگنا

نصلت خواب تھی ہنگامۂ ہستی میں وُہی
کبھی کُچھ بھی نہیں لگنا ، کبھی کیا کیا لگنا

اتنی دُوری کا دھڑکنا وہ تعلّق بن کر
انجم و ماہ کا اپنا ہی قبیلہ لگنا

یہ تو معمول کا اِک واقعہ ٹھہرا ہے ، ظفر
اپنا ہونا بھی ہمیں آج نہ ہونا لگنا

-☆-

کا خواب اسے آرزو ہونے والا
وہ گُل ہے کبھی گفتگو ہونے والا

کوئی اور ہی شکل ہو گی کہ ہے وہ
نہ میں ہونے والا نہ تُو ہونے والا

وہ خود ہو نہیں پائے گا بھی تو اِک دن
سمجھ لو اُسے ہُوبہُو ہونے والا

کہیں سامنے سب کے ہوتا ہے ظاہر
کسی کی ہے وہ جستجو ہونے والا

زمانوں سے پوشیدہ ہے میرے اندر
کسی دن مرے رُوبرُو ہونے والا

رہے گا یُونہی ماورا موسموں سے
یہاں پر کوئی رنگ و بُو ہونے والا

کسی دن اچانک ہی آ جائے گا وہ
کسی سمت سے سُوبسُو ہونے والا

ابھی دل میں دن رات پھرتا رہے وہ
نہیں ہے ابھی آرزو ہونے والا

ظفر ، یہ تو اُسلوب ہے خاص اُس کا
مرا دوست ہے وہ عدو ہونے والا

-☆-

کسی نجوم ہوا کو تلاش کرتا ہوں
میں ایک طرز ادا کو تلاش کرتا ہوں

وہ اک جہاں سے الگ ہے میں ڈھونڈتا ہوں جسے
زمانے بھر سے جدا کو تلاش کرتا ہوں

کبھی پکار کے دیکھا تھا ایک بار اُس کو
سو ، اب تک اپنی صدا کو تلاش کرتا ہوں

اُدھیڑ ڈالتا ہوں اپنے آپ کو کسی وقت
اور ، اپنی طبعِ رسا کو تلاش کرتا ہوں

جہاں بھی جاؤں وہاں پھنس کے بیٹھنا ہے مجھے
ہمیشہ تنگیِ جا کو تلاش کرتا ہوں

میں کرنا چاہتا ہوں خود ہی بات کی تکمیل
جبھی تو بے سروپا کی تلاش کرتا ہوں

جہاں کچھ اپنا تماشا دکھا سکوں کھل کر
یہاں میں ایسی فضا کو تلاش کرتا ہوں

کبھی تو کھوجتا ہوں گم شدہ وجود اپنا
کبھی میں ارض و سما کو تلاش کرتا ہوں

خدا سے پوچھ رہا ہوں ، ظفر ، پتا اُس کا
کہ ایک اور خدا کو تلاش کرتا ہوں

☆

طلوع سا کوئی صبح صدا کے ساتھ آیا
سو ، ایک اور بھی جھونکا ہوا کے ساتھ آیا

مہک جو آئی تو ایسے مجھے لگا اُس دن
کہ جیسے باغ ہی سارا صبا کے ساتھ آیا

کھلے تو کھلتے گئے سارے بند دروازے
ہنر اِک اور بھی دستِ رسا کے ساتھ آیا

جو اجنبی تھا وہ خود اپنے ہم رکاب تھا ، اور
جو آشنا تھا کسی آشنا کے ساتھ آیا

زمین دیر سے اُس کے بھی انتظار میں تھی
کوئی تو اور بھی تھا جو خدا کے ساتھ آیا

وہی ہیں کچھ مرے بکھراو کے تقاضے بھی
میں اس دفعہ بھی یہاں جابجا کے ساتھ آیا

فتور سر میں وہ آیا نہیں کبھی ، لیکن
جب آ گیا ہے تو پھر انتہا کے ساتھ آیا

مناسب اس دفعہ اُس نے ہی کی پذیرائی
نہ میں ہی بار محبت اُٹھا کے ساتھ آیا

میں اب کے اُس کا بھی احسان مند ہوں جو ظفر
غریب خانے پہ اُس خوش نما کے ساتھ آیا

☆

کنارے تھے، لیکن، کنارے سے کم
کوئی روشنی تھی ستارے سے کم

بُلاؤ نہ آواز دے کر اُسے
کہ آتا ہے اب وہ پکارے سے کم

ابھی تک اُسے ڈھونڈتی ہے نظر
وہ منظر تھا ایسا نظارے سے کم

محبت اُسی طرح مانوس تھی
کہ ہم سے زیادہ، تُمھارے سے کم

یہ رنجِ سفر جو گھٹا سو گھٹا
نہیں ہونے والا دوبارے سے کم

نہاں خس کے اندر بھی ہوتی ہے آگ
یہ خود بھی نہیں ہے شرارے سے کم

وہی دھوم رنگِ تماشا کی ہے
کہ ہوتا نہیں یہ اُتارے سے کم

کوئی بات کھل کر نہیں کہہ سکے
اشارہ بھی تھا، اور، اشارے سے کم

گھمائیں پھرائیں اُسے کیا، ظفر
ہے تنخواہ اپنی گزارے سے کم

-☆-

نہ تھے اِس قدر اپنی باری سے کم
ہوئے ہیں بہت رازداری سے کم

جو دیکھا تو سینے میں دل ہی نہیں
سو، کچھ ہو گیا ریزگاری سے کم

وہاں جا کے ہونا مرا باریاب
نہ تھا کچھ خرابی و خواری سے کم

محبت نہ کرتے کبھی اختیار
جو ہوتی یہ خدمت گزاری سے کم

گلستاں تو سارا نہیں چاہتے
کہ درکار ہے آج کیاری سے کم

اندھیرا سفر تھا جو کارِ ہوس
ہوا بوجھ کچھ تو سواری سے کم

تبھی جا کے اُس میں سماتا کہیں
اگر سانپ ہوتا پٹاری سے کم

بہت کام دیتی رہی طبعِ خام
ہنر ہو گیا جانکاری سے کم

ظفر، کر رہے ہو جو کارِ سخن
نہیں یہ بھی گوٹا کناری سے کم

-☆-

دمک رہا تھا لگاتار سے اُترتا ہُوا
وہ خواب سا تری دیوار سے اُترتا ہُوا

ہے کوئی دُھوپ زمیں سے بلند ہوتی ہُوئی
تو ایک ابر ہے کُہسار سے اُترتا ہُوا

بُجھا بُجھا مُجھے لگنے لگا تھا لمحۂ جاں
کبھی کبھی تو چمک دار سے اُترتا ہُوا

دکھائی دینے لگے پھر سے شہر اور جنگل
کہ سیلِ آب تھا زنہار سے اُترتا ہُوا

وہ رنگ پھیل رہا تھا نواحِ دِل میں کہیں
نہ میرے دیدۂ خُوں بار سے اُترتا ہُوا

جھجک رہا تھا عجب طرح سے نہ جانے کیوں
غُبار سا مرے آثار سے اُترتا ہُوا

چڑھا ہُوا ہے یہ دریا اُسی طرح سے، مگر
دکھائی دیتا ہے اُس پار سے اُترتا ہُوا

ہوائے شہر میں پت جھڑ کا شور ہے ہر سمت
کہ ایک بوجھ ہے اشجار سے اُترتا ہُوا

رُکا ہُوا ہے کہیں بیچ درمیاں میں، ظفر
خیال زینۂ اظہار سے اُترتا ہُوا

-☆-

حقیقت جو بھی ہو، اِنکار کر کے دیکھنا ہے
یہ دریا ہے تو اس کو پار کر کے دیکھنا ہے

یہ فرمائش تو پہلی بار ہی کرنی ہے اُس سے
کوئی منظر بہت اصرار کر کے دیکھنا ہے

زمین و آسماں کو کاٹتی جائے سراسر
ہوائے تُند کو تلوار کر کے دیکھنا ہے

یہ ممکن ہے وہاں کُچھ بھی نظر آئے نہ ہم کو
اگرچہ کوششِ بسیار کر کے دیکھنا ہے

کہیں سیلِ سفر کا روکنا بھی ہے ضروری
تُمہارے خواب کو دیوار کر کے دیکھنا ہے

بہت آسانیاں در آئی ہیں کارِ ہوس میں
کسی صورت اِسے دُشوار کر کے دیکھنا ہے

جو اپنی بھی سمجھ میں آ نہیں پائی ابھی تک
اِک ایسی بات کا اظہار کر کے دیکھنا ہے

ابھی اُس تک رسائی تو ہے کافی دُور کی بات
ابھی تو راستہ ہموار کر کے دیکھنا ہے

نئی تعمیر کے شوقِ فراواں میں کسی دن
محبت کو، ظفر، مسمار کر کے دیکھنا ہے

-☆-

ممکن ہی نہ ہو سکا سوال کرتے جاتے
اور، اُس کے جواب کا ملال کرتے جاتے

مُشکل تھا یہ کارِ عشق، اے خیال و خواب
پُورا جو نہیں تو خال خال کرتے جاتے

یہ شیشۂ وہم یُوں نہ پارہ پارہ ہوتا
اس کی بھی ذرا سی دیکھ بھال کرتے جاتے

معمول تھا جن کا آسماں پہ آنا جانا
مُجھ کو اِسی خاک پر بحال کرتے جاتے

مفقُود خبر ہے جس کو ڈھونڈ لیتے آخر
موجُود نہیں جو وہ مثال کرتے جاتے

مصروفیتیں بھی تھیں ہزار ہم سے ہٹ کر
کر سکتے بھی تھے اگر خیال کرتے جاتے

ہوتا جو کُچھ انتظار، اور، کوئی اُمید
لمحوں کو بھی لوگ ماہ و سال کرتے جاتے

وہ طائرِ بوسہ شاید آ بھی پھنستا، اے دل!
گُزرے جو وہاں سے، خُود کو جال کرتے جاتے

دیتا رہا جو، ظفر، فریب ہم کو اب تک
ہم بھی کوئی اُس کے ساتھ چال کرتے جاتے

-☆-

سرسراتے ہیں مرے پتے، صبا پوشیدہ ہے
جیسے خلقت ہے نُمایاں، اور، خُدا پوشیدہ ہے

اتنے پردے پڑ چکے ہیں میری آنکھوں پر کہ جو
جابجا تھا سامنے اب جابجا پوشیدہ ہے

کُچھ تو غائب ہے مضافاتِ محبت سے، مگر
کہہ نہیں سکتا مری آنکھوں سے کیا پوشیدہ ہے

ایک بس میں ہی نہیں، محرُوم ہیں سارے یہاں
سب کی نظروں سے وہ منظر ایک سا پوشیدہ ہے

مُنکشف ہونا تھا ہم دونوں پہ جو، وہ آج بھی
آپ سے مخفی الگ، مُجھ سے جُدا پوشیدہ ہے

واپسی کی بھی کوئی تدبیر کرتے ہیں کہیں
جس طرف سے آئے ہیں وہ راستا پوشیدہ ہے

جھانکتی ہے خاک کے اندر سے خُوشبُوئے ہوس
بادلوں کے درمیاں خوابِ ہوا پوشیدہ ہے

دُشمنوں کی وضع اپنی ہے ستاروں کی طرح
ایک ظاہر ہے تو کوئی دُوسرا پوشیدہ ہے

کُچھ مزاحم بھی وہ ہوتا ہے زیادہ ہی، ظفر
اور، کُچھ اُس شوخ کا بندِ قبا پوشیدہ ہے

-☆-

کچھ نظر آتا نہیں ، سب کچھ نہاں پوشیدہ ہے
مَیں ہی گم گشتہ نہیں ، سارا جہاں پوشیدہ ہے

گھاس کی بُہتات ہے ، اور ، بادلوں کا جمگھٹا
یعنی غائب ہے زمیں ، اور ، آسماں پوشیدہ ہے

یُوں تو سب کردار کرتے پھر رہے ہیں اپنا کام
لیکن ، اب کے درمیاں سے داستاں پوشیدہ ہے

کِس طرف جاتا ہے ، دیکھیں ، جا کے رُکتا ہے کہاں
گرد میں اپنی ہی سارا کارواں پوشیدہ ہے

غائبانہ ہی پرستش کا کوئی ہو اہتمام
سجدہ ہے بے تاب ، لیکن آستاں پوشیدہ ہے

شہر سے باہر تو جانے کی نہیں اُس کی خبر
کچھ اِنہی اطراف میں وہ بدگماں پوشیدہ ہے

مُطمئن کیوں کر نہ ہوں اہلِ زمانہ سربسر
ایک مُدّت سے ہمارا ہر نشاں پوشیدہ ہے

تھا ابھی کل تک اِنہی گلیوں محلّوں میں کہیں
شہر ہے موجُود ، بس میرا مکاں پوشیدہ ہے

مُفت ہی شرمندہ شرمندہ سے رہتے ہیں ، ظفؔر
مَیں وہاں رُوپوش ہُوں ، اور ، وہ یہاں پوشیدہ ہے

-☆-

باہر بھی خواب تھا ، مرے اندر بھی خواب تھا
اور ، اس نواحِ نرم سے ہٹ کر بھی خواب تھا

یُوں اصل بے سُراغ رہا ہے کہ ہر طرف
اس خوابِ زندگی کے برابر بھی خواب تھا

ظاہر تمام میری پریشانیوں سے ہے
مَیں ایک بار تھا تو مکرّر بھی خواب تھا

جو میرے ساتھ سوئی رہی اک پری تھی وہ
یعنی وُہی نہیں ، مرا بستر بھی خواب تھا

دیوار دوستی بھی کوئی واہمہ ہی تھی
دیوار میں جڑا ہُوا منظر بھی خواب تھا

آیا نہیں پلٹ کے وہ موسم تو یُوں کہو
وہ عہدِ بوسہ ہائے مُعطّر بھی خواب تھا

تعبیر اُس کے بوجھ تلے دب کے رہ گئی
کیا کیجیے کہ خواب کے اُوپر بھی خواب تھا

دُشوار راستوں کے سفر میں تمام عُمر
میرا رفیق بھی ، مرا رہبر بھی خواب تھا

آنکھوں میں وہم سی کوئی تصویر تھی ، ظفؔر
دل پر پڑا ہُوا کوئی پتھر بھی خواب تھا

-☆-

چمن میں رنگ تھے، لیکن کبھی پھولوں سے باہر تھے
کہ جو بھی خواب تھے اب کے مری آنکھوں سے باہر تھے

طریقے زندگی آسان کرنے کے یہاں ہر سُو
بُروں کی دسترس میں تھے، مگر، اچھوں سے باہر تھے

ہماری کوششیں ہر دم رہیں ظاہر زمانے پر
نتیجے اِن کے لیکن سارے اندازوں سے باہر تھے

پہنچنا منزلِ مقصود پر کیا تھا کہ اکثر ہم
کبھی رستوں کے اندر تھے، کبھی رستوں سے باہر تھے

سراسر اب تو مرنے کے تقاضے ہی نہیں ہیں وہ
اُنہی کو ڈوبتے دیکھا جو دریاؤں سے باہر تھے

سُراغ آبادیوں کا اُن کے اندر مل سکے شاید
مضافاتِ محبت جو ترے نقشوں سے باہر تھے

وہ گھما گھمیاں ہم کو بھی راس آ ہی گئیں آخر
کہ تُم کتنوں میں شامل، اور، ہم کتنوں سے باہر تھے

شُمار اپنوں میں کر لیتے بہر صُورت ہمیں، لیکن
جو سچ پُوچھو تو ہم ہی قافلے والوں سے باہر تھے

ظفر، اِک شور سا برپا کیے رکھتے ہیں کیوں دل میں
ہوس کے مُنہ زور دھارے جو ہم دونوں سے باہر تھے

ریزہ ریزہ بکھر رہا ہوں میں
شکر ہے، کُچھ تو کر رہا ہوں میں

صبح سے شام ہو گئی شاید
اور، ابھی تک گُزر رہا ہوں میں

کبھی خُود سے کلام کرنے کو
سیڑھیاں سی اُتر رہا ہوں میں

مُجھ سے کہنا ہے جو بھی، کہہ ڈالو
چلتے چلتے ٹھہر رہا ہوں میں

وہ بدن لہلہا رہا ہے ابھی
اور، وُہی گھاس چر رہا ہوں میں

اور تو سب سے آگہی تھی مُجھے
خُود سے ہی بے خبر رہا ہوں میں

اک طرف مست ہو کے بیٹھا ہوں
کر رہا ہُوں نہ بھر رہا ہوں میں

میں زمیں زادہ تھا، مگر افسوس
آسماں سے اُبھر رہا ہوں میں

اپنا دُشمن تو مار آیا ہوں
دوست ہے جس سے ڈر رہا ہوں میں

شاید اس سے ہی کچھ مُیسّر ہو
جیب اپنی کُتر رہا ہُوں مَیں

خُود مُجھے بھی یقیں نہیں آتا
جس قدر بے اثر رہا ہُوں مَیں

اب بھی چڑیوں کا شور یاد ہے وہ
چار دن جو شجر رہا ہُوں مَیں

بھر گئی تھی مرے اندھیرے سے
ایک ایسی سَحَر رہا ہُوں مَیں

لیٹ جاتا تھا ساتھ آ کر وہ
اس قدر بے ضرر رہا ہُوں مَیں

کبھی رو کر دیا ہُنر نے مُجھے
کبھی ردِ ہُنر رہا ہُوں مَیں

یہی دیوار تھی جو قسمت میں
کیوں یہاں دربدر رہا ہُوں مَیں

چھوڑتا ہے اگر مُجھے پانی
خاک پر پانو دھر رہا ہُوں مَیں

دن تو ہوتے نہیں یہاں ، لیکن
اتنی راتیں کدھر رہا ہُوں مَیں

تھک گیا ہُوں جو اپنے ہونے سے
کیا کہوں کس قدر رہا ہُوں مَیں

مَیں نہیں تھا جدھر رہا ہے وہ
وہ نہیں تھا جدھر رہا ہُوں مَیں

حَبس تھا مَیں ، اور ، آپ اپنا کفیل
خُود ہی اپنا شرر رہا ہُوں مَیں

اپنے گھٹیا ، فضول چیتل پر
چار دن آبِ زر رہا ہُوں مَیں

کوئی تحت الثریٰ ہی کاٹے ہیں
چار دن چاند پر رہا ہُوں مَیں

کبھی مَیں اُس کے پانو دھوتا تھا
جس کے آگے بِچھر رہا ہُوں مَیں

یہی دُنیا کا ہے چلن ، اے دوست
یاد رہ کر بِسر رہا ہُوں مَیں

درمیاں سے رہا ہُوں غائب ہی
پانو تھا ، اور ، سر رہا ہُوں مَیں

کُچھ خطائیں مُجھے بھی کرنا تھیں
کُچھ تو بندہ بشر رہا ہُوں مَیں

اسے رہنا تو کہہ نہیں سکتے
یہی رہنا اگر رہا ہوں میں

جہاں میں ایک بار بھی نہ رہا
وہیں بارِ دگر رہا ہوں میں

درمیانی سی ہے کوئی صورت
جی رہا ہوں نہ مر رہا ہوں میں

تھا تو میں درمیاں میں ہی سب کے
سب سے چھپ کر، مگر، رہا ہوں میں

کہیں نورِ نظر تھا اپنے تئیں
کہیں لختِ جگر رہا ہوں میں

اب تو بے برگ بھی ہوا آخر
عمر بھر بے ثمر رہا ہوں میں

اپنا ضعفِ دماغ ہوں یکسر
پہلے دردِ کمر رہا ہوں میں

کہیں کریاکرم ہوا آخر
ورنہ اب تک امر رہا ہوں میں

میں یہ سوکھا سڑا نہ تھا پہلے
خواب سے تربتر رہا ہوں میں

تھا تو آخر یہیں کی پیداوار
خیر تھا یا کہ شر رہا ہوں میں

غیر محفوظ شہر میں ہوں بہت
دشت میں بے خطر رہا ہوں میں

مجھے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا
اور، صاحب نظر رہا ہوں میں

گھر میں سویا ہوا تھا بے حرکت
یعنی گرمِ سفر رہا ہوں میں

میں نے لکھا ہے جو بھی کچھ اب تک
آج اسی سے مکر رہا ہوں میں

کیا چمکتی ہے منہ پہ یہ کالک
کیسا کیسا نکھر رہا ہوں میں

آج کل میں ادھر ہی رہتا ہوں
پہلے بے شک اُدھر رہا ہوں میں

ماہرِ سنگ تھا ہمیشہ سے
اور، آئینہ گر رہا ہوں میں

گھر سے باہر رہا ہوں جتنی دیر
اصل میں اپنے گھر رہا ہوں میں

کم رہا گرچہ اعتبار مرا
شہر میں معتبر رہا ہوں میں

جس کی سیڑھی ہے صرف ایک ہی کل
ایک ایسا شجر رہا ہوں میں

خاص دلال تھا محلے کا
اور، کبھی نامہ بر رہا ہوں میں

چال بھی کوے کی اور کیا چلتا
ہنس کے زیرِ پر رہا ہوں میں

جھریاں دیکھتے ہو کیا میری
اس سے بھی زود تر رہا ہوں میں

سردیوں میں پسینے چھوٹتے تھے
گرمیوں میں ٹھٹھر رہا ہوں میں

اتنا گمراہ کیوں نہیں ہوتا
آپ اپنا خضر رہا ہوں میں

کام اپنا ہے، کرنا پڑتا ہے
رنج اُس کا ہے، جر رہا ہوں میں

باربردار ہر طرح کا تھا
ایک ساتھ اسپ و خر رہا ہوں میں

کیسی کیسی بگڑ رہی ہے شکل
کیسا کیسا سنور رہا ہوں میں

جس میں ڈوبی تھی میری اپنی ناو
ایک ایسا بھنور رہا ہوں میں

چل رہا ہوں ٹٹول کر رستا
ایک ہی دیدہ ور رہا ہوں میں

ابھی کچھ بھی پتا نہیں چلتا
جیتتا ہوں کہ ہر رہا ہوں میں

کبھی مانوس ہیں پرندے، پیڑ
جیسے کچھ دن ادھر رہا ہوں میں

منتظر تھا کسی کبوتر کا
ایک ٹوٹی کگر رہا ہوں میں

تھاہ پائی نہیں کسی کی بھی
سب سے شیر و شکر رہا ہوں میں

اپنے اعدا ہی میں رہا، لیکن
بے سپاہ و سپر رہا ہوں میں

اُس کے دل میں رہا تو ہوں آخر
گو بہت مختصر رہا ہوں میں

اُس نے جانے کو کہلوایا ہے
اور ، در پہ پسر رہا ہوں میں

گالیاں کچھ زیادہ کھا لی ہیں
دیکھنا ، کیا اپھر رہا ہوں میں

وہ بھی لیچڑ تھا ایک ہی ، لیکن
کر کے اُس سے مفر رہا ہوں میں

جابجا چومتا تھا گردن کو
کوٹ کے اُس کی فر رہا ہوں میں

پہلے اُس سے فقط گھسرتا تھا
اب تو کافی بھسر رہا ہوں میں

اُس کے ، اور ، اِک رقیب کے مابین
اک طرح کا بفر رہا ہوں میں

ایک دیوار کی طرح اب تو
اپنے آگے اُسر رہا ہوں میں

تنگ اتنی جگہ نہیں ، لیکن
ساتھ اُس کے گھُسر رہا ہوں میں

اور کیا کر رہا ہوں ، یار ، اگر
ار رہا ہوں نہ بر رہا ہوں میں

کچھ بھی میرا سراغ مل نہ سکا
عُمر بھر منتشر رہا ہوں میں

ستّر اور ایک سال کا ہو کر
اب ذرا سا سُدھر رہا ہوں میں

خلق پرہیز مجھ سے کرتی تھی
الحذر الحذر رہا ہوں میں

رہ گئی تھی جو میرے ہونے میں
کوئی ایسی کسر رہا ہوں میں

قبرِ دل میں ہزاروں کیڑوں کا
عُمر بھر ماحضر رہا ہوں میں

کہو ہونا ہے کس کے ساتھ مجھے
جاگتا رات بھر رہا ہوں میں

جس پہ کوئی نہ چل سکا اب تک
ایک ایسی ڈگر رہا ہوں میں

چاند کی سطح سب نے دیکھی ہے
صاف رشکِ قمر رہا ہوں میں

کسب ہے گو چمارگیری کا
راؤ ہوں ، اور ، کنور رہا ہوں میں

اور ، حرص و ہوس کے جنگل کا
کبھی شیرِ ببر رہا ہوں میں

لولے لنگڑے کہ اندھے کانے ہوں
ان سبھوں میں سُپر رہا ہوں میں

ابھی یہ فیصلہ بھی ہونا ہے
قتل رہا ہوں کہ تھر رہا ہوں میں

ڈھل رہا ہے غبار چہرے کا
آنسوؤں سے نتھر رہا ہوں میں

عمر کا بھی یہ کچھ تقاضا ہے
موٹھ ہوں ، اور ، مٹر رہا ہوں میں

لوگ کس طرح ، اور ، کیا سمجھے
کوئی گونگی گجر رہا ہوں میں

مجھ پہ تشدید کوئی تھی ہی نہیں
پہلے دن سے بکھر رہا ہوں میں

اور اسی طرح سے تمام و کمال
پتھروں میں پتھر رہا ہوں میں

کوئی گری تھی اور ہی مجھ میں
شام تک دوپہر رہا ہوں میں

مجھ سے کیا فلسفہ بگھارتے ہو
خود قضا و قدر رہا ہوں میں

کر دیا عاق تو مجھے ہر چند
خوب کچھ دن پسر رہا ہوں میں

میں رہا ہوں اگر یہاں آزاد
بسکہ مادر پدر رہا ہوں میں

گھر جوائی سے پوچھ لو جا کر
کس طرح کا سُسر رہا ہوں میں

کوئی اس کی بھی اب کرے تحقیق
مونگ تھا یا مسر رہا ہوں میں

ایک ہی بات ہے کہ دوجے میں
یا کسی شب قطر رہا ہوں میں

آپ یہ بھی نہ اب خیال کریں
کہ کبھی کاشغر رہا ہوں میں

گھومتا کیا ہے اُس کے چاروں طرف
سامنے بھی گھمر رہا ہوں میں

سحر و شام اک گراری سا
اُس کے اندر گرر رہا ہوں میں

ذائقہ اُس کا تھا الگ سب سے
جس ٹماٹر کی تَر رہا ہُوں مَیں

میرا کُچھ بھی نہیں بچے گا یہاں
ایسی چھلنی سے چھَر رہا ہُوں مَیں

کوئی پہچان ہی نہیں میری
ایک جُھرمٹ میں جھر رہا ہُوں مَیں

جس کو ڈھونڈا نہیں گیا ہے کبھی
یعنی ایک ایسا بَر رہا ہُوں مَیں

مُجھے کروا دیا گیا خصّی
جو کبھی شیرِ نر رہا ہُوں مَیں

چار و ناچار بھاپ کی صُورت
اُس کی ڈھکنی سے ڈھر رہا ہُوں مَیں

خوف ہے ، اور ، خرخراتا ہُوں
یاس ہے ، اور ، یَر رہا ہُوں مَیں

پیچ سا ہو رہا ہُوں پیچیدہ
کسی ڈھبری میں ڈھر رہا ہُوں مَیں

ہُوا مُجھ سے حساب تو آغاز
یہ بھی سچ ہے صِفر رہا ہُوں مَیں

ہو کے صرصر ہی مُجھ کو چلنا تھا
یعنی دوبار صر رہا ہُوں مَیں

خُود تو کُچھ بھی نہیں تھا مَیں ، لیکن
آپ کا کرّ و فر رہا ہُوں مَیں

جہاں اُس کے جہاز اُترتے تھے
ایسا اِک مستقر رہا ہُوں مَیں

کوئی اٹکاؤ تھا مرے آگے
ایک اُبلتا گٹر رہا ہُوں مَیں

پُھوٹ بہنا ہے جس نے اندر ہی
کوئی پھوڑا سا پھر رہا ہُوں مَیں

کہیں باہر سے جو ہُوئی تھی کبھی
اُسی حرکت سے حر رہا ہُوں مَیں

ایک بجلی سی مُجھ میں دوڑتی ہے
ساتھ اُس کے گھسر رہا ہُوں مَیں

کبھی ہموار ہو نہیں سکتا
اِتنا زیر و زبر رہا ہُوں مَیں

جہاں ڈُوبا تھا ایک بار کبھی
اُسی جانب کو تر رہا ہُوں مَیں

اُسے باریک چُننا ہی کہیں
تھوڑا تھوڑا چھِڑ رہا ہوں میں

مُجھے خُود بھی نہیں ہے کُچھ معلوم
کس ذریعے سے ڈر رہا ہوں میں

ورق بینی مُلاحظہ ہو مری
اُوپر اُوپر ہی اُڑ رہا ہوں میں

جیسے آزاد ہو رہا ہُوں، ظفر
ایسے پھندے میں پھر رہا ہُوں میں

☆

گلاب سا کوئی گلزار ہونے والا تھا
جو ایک تھا وُہی انبار ہونے والا تھا

جو ایک بار ہُوا تھا مغالطے میں کہیں
وُہی یہاں پہ لگاتار ہونے والا تھا

ہمارے عہد میں بھی مانتا نہیں تھا کوئی
ہمارے بعد بھی انکار ہونے والا تھا

ہمیں نے مُفت میں الزام اُٹھا لیا، ورنہ
یہ شہر آپ ہی مسمار ہونے والا تھا

جو گلفروش تھے، اُن کی بھلی کہی، کہ وہاں
تو سارا باغ ہی بازار ہونے والا تھا

ابھی یقیں ہی نہیں آ رہا تھا اِس دِل کو
ابھی وہ میرا مددگار ہونے والا تھا

اِک اور خواب کی گلیوں میں گھومنے کے لیے
مَیں ایک خواب سے بیدار ہونے والا تھا

مَیں انتظار نہیں کر سکا، خبر تھی مُجھے
کہ راستا ابھی ہموار ہونے والا تھا

ابھی ابھی کوئی آیا ہے درمیاں میں، ظفر
مَیں اپنے آپ سے دوچار ہونے والا تھا

☆

تھی ابھی بھی ہمیں کارگزاری اپنی
تنگ پڑیا ہے جہاں کار گزاری اپنی

بسترِ وصل بچھا رکھا ہے کب سے ہم نے
نہیں آنا ہے تو مرضی ہے تمھاری اپنی

خطۂ حُسن پہ دعوے کئی اوروں کے بھی ہیں
ہم تو سمجھے تھے یہ اقلیم ہے ساری اپنی

دُھند ہے ، اور ، دُھواں پھیلا ہُوا ہر جانب
کیا کرے گی یہاں اب آئنہ داری اپنی

دائرہ وار سفر ہے کوئی درپیش ہمیں
اپنے اندر ہی گزرتی ہے سواری اپنی

سب کو تلقین تھی اپنی ہی کہ مل جُل کے رہو
صحن میں ہم نے ہی دیوار اُساری اپنی

عُمر بھر اور تو کُچھ بن نہیں پایا ہم سے
دُوسروں کی ، تو ، کبھی نقل اُتاری اپنی

ایک بادل کے سبب دُھوپ سے رہتا ہے بچاو
کسی پانی سے ہری رہتی ہے کیاری اپنی

اب کریں جو بھی سلوک اِن سے ، بجا ہے کہ ظفر
گلستاں اپنا ہے ، اور ، بادِ بہاری اپنی

☆

شورش بھی رات بھر جہاں دریائے خواب کی
باقی تھی اک جھلک سی وہاں رنگِ آب کی

تاریک صفحہ صفحہ تو روشن تھا لفظ لفظ
بُھولی نہیں ہے اب بھی وہ قرأت کتاب کی

خوشبو کا عکس پڑتا رہا آسمان پہ
پانی پہ کانپتی رہی پتّی گلاب کی

اک سرخوشی کا زور تھا چاروں طرف ، مگر
اُس میں بھی ایک تہ تھی کہیں اضطراب کی

کب سے رُکا ہُوا ہے جہاں موسمِ سیاہ
حیرت وہاں ہے اب بھی کسی آب و تاب کی

دُنیا نے بھی کہیں مری جمنے نہ دی ہوا
اِس دل نے اور بھی مری مٹی خراب کی

یہ نشہ وہ ہے جو کہ اُترتا نہیں کبھی
سینے میں ہے رکھی ہُوئی شیشی شراب کی

اچّھا وُہی ہے کام جو دل کو پسند ہو
تفریق مٹ چکی ہے گناہ و ثواب کی

گُم ہو گئی ہے جیسے کہیں راہ میں ، ظفر
آواز آ رہی تھی جو ایک انقلاب کی

☆

حشر الفاظ کا بپا کیا جائے
قرض واجب ہے جو ادا کیا جائے

اپنی اپنی الگ رہے پہچان
خاک سے خواب کو جدا کیا جائے

تازہ کی جائے کوئی یاد کہیں
یا کسی زخم کو ہرا کیا جائے

ذائقہ ہو نیا کوئی ایجاد
اور، پھر اُس کو جا بجا کیا جائے

کام ہر طرح کا ضروری ہے
کبھی اچھا، کبھی بُرا کیا جائے

زندگی اس قدر بُری بھی نہیں
کچھ اِسے اور خوشنما کیا جائے

کچھ اگر ہے ہمارے حصے کا
تو ہمیں ایک دم عطا کیا جائے

کچھ نہیں کر سکے ہیں زندگی بھر
یہی ممکن تھا، اور کیا کیا جائے

کسی بُت سے لپٹ کے اب تو، ظفر
پڑ رہیں، اور، خدا خدا کیا جائے

☆

کرن کرن مرا سورج ہے روشنی کے بغیر
یہی بہت ہے کہ زندہ ہوں زندگی کے بغیر

دھڑک رہا ہوں پڑا اپنے دل سے دور کہیں
بھٹک رہا ہے مرا شعر شاعری کے بغیر

میں ایک عمر سے روتا ہوں رنج سے ہٹ کر
کبھی کبھار جو ہنستا ہوں گدگدی کے بغیر

جڑی ہو جیسے ہر اک دن کے ساتھ رات یہاں
جہاں تہاں کوئی نیکی نہیں بدی کے بغیر

سبھی نے دیکھ لیا اس دفعہ تو محفل میں
جما نہیں کوئی رنگ اُس کی سادگی کے بغیر

اُڑائے پھرتی ہے کیا اپنے ساتھ ساتھ مجھے
سو، میں بھی رہ نہیں سکتا ہوں اُس پری کے بغیر

میں اپنے آپ سے خالی ہی پھر رہا تھا وہاں
کہیں پہ کچھ بھی نہیں تھا مری کمی کے بغیر

زیادہ فرق نہیں نفرت اور محبت میں
نہ دوستی کوئی ممکن ہے دشمنی کے بغیر

خلاف قاعدہ ہوتا ہوں آج کل تو، ظفر
کبھی کسی کے بغیر، اور، کبھی کسی کے بغیر

☆

نہیں کسی اور کے اشارے سے آنے والا
مرا ستارہ ترے ستارے سے آنے والا

اگرچہ دریا بھی اب تو پایاب ہو چلا ہے
کوئی نہیں دُوسرے کنارے سے آنے والا

الگ الگ جا کے جذب ہو گا کسی زمیں میں
کبھی یہ پانی ہمارے دھارے سے آنے والا

اسی پہ کرنا پڑے گا اب اکتفا سبھی کو
اسی قدر ہے یہ رنگ سارے سے آنے والا

مجسّم آواز بن چکا ہوتا آج تک میں
اگر وہ ہوتا مرے پکارے سے آنے والا

خود آ کے لے جائے کوئی مجھ کو اگر تو لے جائے
کہ میں ہوں اب تو کسی سہارے سے آنے والا

یہ جس کسی کا بھی ہے اُٹھا تو رکھا ہے میں نے
مزہ نہیں بوجھ یہ اُتارے سے آنے والا

جو میری آنکھوں پہ وا نہیں ہو سکا ابھی تک
ہے کوئی پیغام اُسی نظارے سے آنے والا

ظفر، جو آیا نہیں کبھی ایک بار بھی، تو
اُسے سمجھتا ہوں کیوں دوبارے سے آنے والا

☆

عجب خرابہ ہے، دن ہے یہاں نہ رات ہماری
کہیں کہیں پہ جھلکتی ہیں باقیات ہماری

ہم اپنی ہستیِ فانی پہ فکرمند نہیں تھے
کہ موت بھی ہے اسی طرح بےثبات ہماری

ہے یہ بھی جیسے کوئی تازہ تر فریب تمہارا
جو اِتنے غور سے سُننے لگے ہو بات ہماری

پڑے ہیں اور کہیں ہم، کھڑا ہے اور کہیں وہ
اسی طرح سے گزرتی ہے اُس کے ساتھ ہماری

سمجھ سکا نہیں اب تک جو مشکلات ہماری
اُسی کے پاس ہیں ساری سہولیات ہماری

یہ دل، یہ دھول بھرا راستا، یہ دھوپ، یہ سایے
یہیں سے روز گزرتی ہے کائنات ہماری

پتا چلا ہے کہیں اب ہمیں کہ ہو بھی چکی ہے
ہماری بےخبری میں ہی واردات ہماری

دھواں سا اُجڑے ہوئے گانو کے نواح میں کیوں ہے
اگر نہیں کوئی آباد شاملات ہماری

نکل گئے تھے کسی اور ہی طرف کو، ظفر، ہم
وہ کھوجتے رہے بےسُود شش جہات ہماری

☆

پانو کے نام پہ سر لکھنا ہے
یہی صورت ہے اگر لکھنا ہے

اُس نے مامور کیا ہے ہم کو
نہیں آتا ہے، مگر، لکھنا ہے

تیز تر دھوپ میں سایے کے لیے
صِرف کاغذ پہ شجر لکھنا ہے

روشنی کے لیے اُس چہرے کو
شمس کہنا ہے، قمر لکھنا ہے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا اب تو
کہاں پڑھنا ہے، کدھر لکھنا ہے

ایک انداز پہ نادم ہیں ابھی
کیا باندازِ دگر لکھنا ہے

خوب اندازِ نگارش ہے، اگر
قفس و قید کو گھر لکھنا ہے

ہر غزل عذرِ غزل ہے بے شک
کچھ تو، اے جان و جگر، لکھنا ہے

عیب تحریر دکھاتے ہیں، ظفر
یعنی اپنا تو ہنر لکھنا ہے

-☆-

جو بندۂ خدا تھا، خدا ہونے والا ہے
کیا کچھ ابھی تو جلوہ نما ہونے والا ہے

یہ بھی دُرست ہے کہ پیمبر نہیں ہوں میں
ہے یہ بھی سچ کہ میرا کہا ہونے والا ہے

کچھ اشکِ خوں بچا کے بھی رکھیے کہ شہر میں
جو ہو چکا ہے اُس سے سوا ہونے والا ہے

وہ وقت ہے کہ خلق پہ ہر ظلمِ ناروا
اللہ کا نام لے کے روا ہونے والا ہے

اِک خوف ہے کہ ہونے ہی والا ہے جاگزیں
اِک خواب ہے کہ سب سے جُدا ہونے والا ہے

رنگِ ہوا میں ہے عجب اَسرار سا کوئی
کوئی بھی جانتا نہیں کیا ہونے والا ہے

خوش تھا سیاہ خانۂ دل میں بہت لہو
اس قید سے، مگر، یہ رہا ہونے والا ہے

یہ تیر آخری ہے، بس اُس کی کمان میں
اور، وہ بھی دیکھ لینا، خطا ہونے والا ہے

اک لہر ہے کہ مجھ میں اُچھلنے کو ہے، ظفر
اک لفظ ہے کہ مجھ سے ادا ہونے والا ہے

-☆-

کیوں کر نہ ہو پانا یہاں کھونے کے برابر
ہونا ہی جو اپنا ہے نہ ہونے کے برابر

وہ بھی وہاں موجود تھا، اور، ہم نے بھی کچھ دیر
دیکھا تھا اُسے آنکھ بھگونے کے برابر

ہر شام جہاں بیٹھ کے رو سکتے ہوں دم بھر
گھر اپنے لیے ہے کسی کونے کے برابر

اک خواب کی خوشبو تھی رہا جس کا تعاقب
اک عمر گزاری ہے جو سونے کے برابر

ثابت ہُوا آخر کہ محبت کا علاقہ
ہر طرح سے ہے ایک بچھونے کے برابر

درپیش ہے کب سے یہ اندھیرا، یہ اُجالا
یا کوئی کھلونا ہے کھلونے کے برابر

پیتل سے بھی کم تر جو سمجھتے رہے مُجھ کو
تولیں گے مری لاش کو سونے کے برابر

اِک لفظ تھا الفاظ کے انبار میں شامل
یا لہر سی لہروں میں سمونے کے برابر

طوفاں سے جو ٹکرا کے رکھی ہے، ظفر، اب تک
لایا ہُوں وہی ناؤ ڈبونے کے برابر

☆

وہاں ہونا بھی ہے اب تو یہاں کی دُوسری جانب
کہیں موجود ہے وہ آسماں کی دُوسری جانب

ذرا دیتی ہے پانی کی چمک مُجھ کو اندھیرے میں
کھڑا ہوں شام سے آبِ رواں کی دُوسری جانب

حقیقت میں سراسر واقعہ ہی اور ہے کوئی
کبھی دیکھو جو میری داستاں کی دُوسری جانب

حفاظت اِس قدر بھی راس آ سکتی نہ تھی مُجھ کو
پسند آئی مجھے کُنجِ اماں کی دُوسری جانب

نظر آتا نہ تھا اِس بار دل کے دشت میں کُچھ بھی
غُبارِ کارواں تھا کارواں کی دُوسری جانب

نہ تھی وہ شاخ ہی باقی سفر سے واپس آنے تک
دکھائی دے رہی تھی آشیاں کی دُوسری جانب

مرے چاروں طرف رونق لگا رکھی تھی جب اُس نے
کہیں رُوپوش تھا وہ درمیاں کی دُوسری جانب

جگا دیتی تھی مُجھ کو بار بار آواز پتّوں کی
کوئی کُہرام تھا خوابِ خزاں کی دُوسری جانب

یہی کُچھ ہے، ظفر، جو سطح پر ظاہر ہے پہلے سے
نہیں کُچھ بھی مرے طرزِ بیاں کی دُوسری جانب

☆

چھپا ہوا جو دوبارہ دکھائی دے رہا تھا
مجھے وہ سارے کا سارا دکھائی دے رہا تھا

تُمھیں بھی کوئی خیال آ رہا تھا رات گئے
مجھے بھی خواب تُمھارا دکھائی دے رہا تھا

مجھے ہی کوئی خبر تھی کہاں پہ رُکنا ہے
نہ صاف اُس کا اشارہ دکھائی دے رہا تھا

جہاں پہ لوگ بہت راست رو تھے پہلے پہل
اثر وہاں بھی ہمارا دکھائی دے رہا تھا

بدن کے اِس خس و خاشاک میں کسی جانب
یہ دل ہی ایک شرارہ دکھائی دے رہا تھا

فلک پہ پھول نظر آ رہے تھے چاروں طرف
زمیں پہ ایک ستارہ دکھائی دے رہا تھا

ابھی ابھی مری آنکھیں تھیں آس پاس کہیں
ابھی ابھی جو نظارا دکھائی دے رہا تھا

کیا جو فیصلہ اُس کی طرف نہ دیکھیں گے
تو وہ کچھ اور بھی پیارا دکھائی دے رہا تھا

جہاں پہ ڈوب رہا تھا مرا سفینہ، ظفر
مجھے وہاں سے کنارہ دکھائی دے رہا تھا

☆

ملا جلا کے ہمارا تُمھارا ہو رہا تھا
جو کام چل رہا تھا، اور، گزارہ ہو رہا تھا

نظر کے سامنے ترتیب ہی بدل رہی تھی
چراغ چشم تھا، لیکن، ستارہ ہو رہا تھا

بظاہر ایک تغافل تھا، اور، خاموشی
مگر، کہیں نہ کہیں کام سارا ہو رہا تھا

عجیب صورتِ احوال تھی کہ روز بروز
جو ناگوار تھا وہ بھی گوارا ہو رہا تھا

نکل رہی تھی ہمارے لیے بھی گنجائش
اگرچہ صاف نہیں تھا، اشارہ ہو رہا تھا

ابھی ہُوا ہے نہ ہوگا کبھی، مگر، اِس بار
یہ لگ رہا ہے کہ سب کچھ دوبارہ ہو رہا تھا

ابھی تھی دیر سمندر کے پانیوں میں کہیں
ابھی تو چاروں طرف سے کنارہ ہو رہا تھا

زمین ذرّوں میں تقسیم ہو رہی تھی یہاں
اور، آسمان وہاں پارہ پارہ ہو رہا تھا

ظفر، یہ رونقِ شہر انتہا پہ تھی جس روز
یہاں سے کوچ اُسی دن ہمارا ہو رہا تھا

☆

یہ کاروبار صرف خسارے میں ہی نہیں
یُوں ہے کہ زندگی مرے وارے میں ہی نہیں

پانی جو اس کو کاٹتا رہتا ہے صبح و شام
اگلی سی کوئی بات کنارے میں ہی نہیں

لوگوں کو وہ بھی جانے کہاں تک بتاؤں گا
جو بات اصل میں مرے بارے میں ہی نہیں

ہم بھی ہیں کام چور بڑے اپنے وقت کے
یہ خُوئے خاص محض تُمھارے میں ہی نہیں

یہ ہمّتِ سفر ہے جو غائب ہُوئی تمام
یا سمت کا سُراغ ستارے میں ہی نہیں

دریا میں راستا نہیں ملتا جو بعض وقت
اگلا سا زور شور وہ دھارے میں ہی نہیں

الزام کیا دھریں گے کسی رات پر، کہ اب
اُس خواب کا خُمار ہمارے میں ہی نہیں

جس پر کسی اُمید کی بستی بسائیں ہم
ایسا کوئی کنایہ اشارے میں ہی نہیں

خود سنگ دل بھی ٹوٹنے والا ہے، اے ظفر
سارا یہ اضطراب شرارے میں ہی نہیں

-☆-

اگرچہ تھا کوئی بستر نہ بوریا مرے پاس
وہ پھر بھی آ کے یہاں چار دن رہا مرے پاس

وُہی پسینہ پسینہ تھی ساری آبادی
رُکی ہُوئی تھی بہت دیر سے ہوا مرے پاس

کوئی اُلجھتا ہُوا خواب تھا الگ مرے تئیں
کسی خیال کی تصویر تھی جُدا مرے پاس

وہ خُود تو جا ہی چُکا تھا، مگر، کہیں نہ کہیں
لرز رہا تھا ابھی کوئی رنگ سا مرے پاس

وہ مُجھ سے دُور بھی رہنا نہ چاہتا تھا، مگر
کسی سبب سے بالآخر نہ ہو سکا مرے پاس

کُچھ آج کل تو یہ عالم ہے میرے ہونے کا
کہ مَیں نہیں، کوئی ہوتا ہے دُوسرا مرے پاس

کسی طرح کا نہیں انحصار اُس پر بھی
مرا وُجُود کہ اب ہے بچا کُھچا مرے پاس

وہ ہے تو اُس کی اجازت نہیں ہے میرے لیے
جو دُور ہے تو نہیں دُور کا بُرا مرے پاس

بُھلا کے اُس کو مَیں خُوش تو نہیں، ظفر، لیکن
سوائے اِس کے نہ تھا کوئی راستا مرے پاس

-☆-

قریب و دور نہیں کوئی بھی یہاں مرے پاس
زمین دور ہے اس بار، آسماں مرے پاس

کمی سی آ رہی تھی رفتہ رفتہ کیا مجھ میں
ہو جس طرح سے کوئی کاہشِ رواں مرے پاس

سفینہ ہے مرا پانی کے زور پر خالی
کہ رہ گیا ہے بدن کا ہی بادباں مرے پاس

سنا چکا ہوں جسے بار بار پہلے بھی
بچی ہوئی ہے وہی ایک داستاں مرے پاس

کرایہ دار مناسب سا کوئی ہے درکار
مرے وجود میں خالی ہے اک مکاں مرے پاس

کچھ اب تو سانس بھی لینا محال ہے مجھ کو
ہے ایک یاد کا پھیلا ہوا دھواں مرے پاس

جو ہے تو صرف اشاروں پہ انحصار مرا
کہ سچ کہوں تو زباں ہے نہ ہے بیاں مرے پاس

اسی میں گم ہوں کہیں، اور، خود کو ڈھونڈتا ہوں
جو میرے چاروں طرف ہے غبارِ جاں مرے پاس

یہی بہت ہے کہ اس بے نوائی میں سرِ دست
جو رہ گئی ہے، ظفر، یہ مری فغاں مرے پاس

-☆-

نہیں جو حوصلۂ عرضِ آرزو مرے پاس
تو رہ گیا ہے فقط خواب گفتگو مرے پاس

رہا تھا میری اسیری میں ایک گام کا فرق
تنا ہوا تھا کوئی دامِ رنگ و بو مرے پاس

شراب خانۂ دل سے ہی مست پھرتا ہوں
لہو سے پُر ہے کوئی دن جو یہ سبو مرے پاس

ہوا میں وصل کی خوشبو سی کیوں ہے پھیلی ہوئی
اگرچہ میں ترے نزدیک ہوں نہ تو مرے پاس

پڑا تھا میں خس و خاشاک و خار میں اپنے
بھلا ہوا کہ نہ آیا وہ شعلہ خو مرے پاس

میں کوچ کر رہا تھا اس دیار سے جس وقت
عجیب طرح کی رونق تھی سو بسو مرے پاس

میں چوبِ خشک تو تھا ہی یہاں، مگر، دراصل
ابھی کچھ اور بھی تھی خواہشِ نمو مرے پاس

میں اور گریہ ابھی کرنا چاہتا تھا، مگر
رہا نہیں ہے کہیں اس قدر لہو مرے پاس

مجھے یقیں ہی نہیں آ رہا ابھی کہ ظفر
وہ آ کے بیٹھ بھی سکتا ہے روبرو، مرے پاس

-☆-

رکھا ہوا تھا جو کاندھوں پہ میرا گھر مرے پاس
نہیں تھی اور کوئی صورتِ سفر مرے پاس

بُرے بھلے کئی کاموں سے روک سکتا تھا
تری جدائی میں ہوتا کوئی اگر مرے پاس

اگرچہ تھا، میں اکیلا تو اس قدر بھی نہ تھا
رہا ہے خوابِ مُلاقات شب بھر مرے پاس

سُنا ہے شہر میں آیا ہوا تھا وہ کب سے
چلا گیا ہے تو پہنچی ہے اب خبر مرے پاس

غریبِ شہر کو بھی آزماؤ تو کسی دن
میں خالی ہاتھ سہی کچھ تو ہے مگر، مرے پاس

ابھی تو جیسے فراغت نہیں مجھے کچھ دن
کہ چند روز تو میں خود ہوں سربسر مرے پاس

مجھے کچھ اور بہت اُلجھنیں ہیں، اور، اُلجھاؤ
کوئی دن آ کے ٹھہر جاؤ بے خطر مرے پاس

ابھی گدائی کی فرصت نہیں مجھے، ورنہ
بہت خرابۂ دل میں ہے مال و زر مرے پاس

کچھ ایسی طرز ہے اُس کی نہ کوئی طور، ظفر
برائے نام سا ہے یہ جو اک ہنر مرے پاس

☆

ہے کیفیت کوئی جیسے بھلی بھلی مرے پاس
کہ آج کل ہے اندھیرا نہ روشنی مرے پاس

میں اُس کے ہوں بھی شمار و قطار میں کسی طرح
ثبوت اس کا نہیں کوئی ابھی مرے پاس

کبھی کبھار ہی مہمان بن کے رہتی ہے
لُٹی پٹی ہوئی سی میری زندگی مرے پاس

کوئی تو چیز یہاں یادگار رہ جاتی
کہ دوستی ہے نہ ہے اُس کی دُشمنی مرے پاس

وہ ایک شے جو کسی کے لیے بچا رکھی ہے
مجھے خبر نہیں اچھی ہے یا بُری مرے پاس

اِدھر اُدھر کی، چلا بھی گیا وہ کہہ سُن کر
یہ عرضِ حال یونہی رہ گئی پڑی مرے پاس

خدا کا شکر ادا کیجیے کہ نعمتِ وصل
کبھی ہے اور کسی کے لیے، کبھی مرے پاس

میں اجتناب ہی کرتا رہا سدا جس سے
وہ ایک رات کئی دن رُکی رہی مرے پاس

ظفر، مرے لیے کچھ کم نہ تھے جو رہ جاتے
وہ میرے دیکھے ہوئے چند خواب ہی مرے پاس

☆

میں آسمان کا مالک نہ ہے زمیں مرے پاس
کہ اپنا آپ بھی میرا تو اب نہیں مرے پاس

کہیں غُبار سا اُڑتا ہوں آس پاس اپنے
مرا وُجود ہے شاید یہیں کہیں مرے پاس

میں ایک عُمر سے باہر کہیں نہیں جاتا
قریب و دُور کی چیزیں ہیں سب یہیں مرے پاس

وہ سانپ بھی مجھے، مُدّت ہُوئی کہ چھوڑ گیا
سو، رہ گئی ہے یہی میری آستیں مرے پاس

مری یہ بے سروسامانیاں نئی بھی نہیں
کہ جانتے ہو یہی کُچھ تھا پیش ازیں مرے پاس

اُمید و بیم کی سرحد پہ تھا کہیں مَیں بھی
وہ آ کے بیٹھ گیا دوبدو وہیں مرے پاس

برائے نام سا اک فاصلہ بھی تھا موجود
مرا گُماں مرے اندر تھا، اور، یقیں مرے پاس

اثاثہ اور کوئی مجھ کو چاہیے بھی نہیں
یہی بہت ہے مرا خوابِ اوّلیں مرے پاس

تُم اِک طرح سے ہو میرا ہی دردِ سر کہ ظفر
مآلِ کار تو رہ جاؤ گے تمہیں مرے پاس

☆

جو عکس دُور تھے آ کر وہی پڑے مرے پاس
جھلک رہے تھے ہر اک سمت آئنے مرے پاس

بہار تھی نہ خزاں، رنگ سے رواں تھے کئی
عجیب طرح کے موسم رُکے رہے مرے پاس

خیال ہی کوئی دن چل سکے نہ ساتھ مرے
نہ میرے خواب ہی کُچھ روز رہ سکے مرے پاس

وہ خود تو مجھ سے جُدا ہو کے چل دیا، لیکن
یہی بہت ہے کہ رہنے دیا مجھے مرے پاس

کُچھ اس طرح کا بھی منظر میں چاہتا ہوں کہ جو
مرے قریب نہیں ہو، مگر، لگے مرے پاس

زمیں تو سخت ہے مجھ پر بہت، سو، وہ کُچھ دن
یہ آسماں ہی کسی طرح چھوڑ دے مرے پاس

مرے سوا تو یہاں اور کوئی بھی نہیں تھا
تو شور اُٹھتا رہا ہے یہ کس لیے مرے پاس

سفر کی بابت اگر سوچتا بھی تھا میں کبھی
تو چل کے آپ ہی آتے تھے راستے مرے پاس

میں زندگی سے، ظفر، دُور ہی بہت خوش تھا
کسی نے بھیج دیا ہے یہاں کسے مرے پاس

☆

اتنا شاداب اور شگفتہ جو تمھارا باغ ہے
اور بھی کچھ ہے کہ یہ سارے کا سارا باغ ہے

وہ تمھارے پھول ہیں ، اور ، یہ ہمارے زخم ہیں
وہ تمھارا باغ ہے ، اور ، یہ ہمارا باغ ہے

ایک دم کیا کیا مہک اُٹھتی ہے اندر کی فضا
مسکراتی آنکھ میں کیسا اشارہ باغ ہے

یوں لہو میں پھلجڑی سی پھوٹتی ہے بعض وقت
اندر اندر ہی کوئی جیسے شرارہ باغ ہے

سبزہ و گل ہیں زمینِ زر کے اندر ہی کہیں
آسمانِ خواب سے باہر بچارہ باغ ہے

یہ جو نظروں سے ابھی غائب ہُوا ہے دفعتاً
بند آنکھوں سے اگر دیکھو ، دوبارہ باغ ہے

اک طرف ہے زندگی ، اور ، دوسری جانب ہے موت
اور ، اُن کے درمیاں میں کیا کنارہ باغ ہے

پھول پھل کیا ڈھونڈتا پھرتا ہوں ایسے میں یہاں
جانتا ہوں یہ تو سارا استعارہ باغ ہے

شام کی دہلیز سے اُترے تو کیا دیکھا ، ظفر
پُرزہ پُرزہ رات ہے ، اور ، پارہ پارہ باغ ہے

☆

اُس پری وش کا بدن تھا یا سراسر باغ تھا
جتنا باہر تھا ، ظفر ، اُتنا ہی اندر باغ تھا

پیڑ پودے بھی جُدا تھے ، پھول پتے بھی الگ
باغ کے ایک اور بھی جیسے برابر باغ تھا

کچھ رہا اپنی نظر کا زاویہ جب تک دُرست
جو بیاباں تھا یہاں پر ، وہ بھی اکثر باغ تھا

کھل رہے تھے کچھ نرالے ہی شگوفے چارسُو
اس دفعہ دیکھا تو آئینے سے باہر باغ تھا

اِک اُداسی کی فضا چھائی ہوئی تھی اردگرد
ورنہ اب کی بار تو پہلے سے بہتر باغ تھا

تھا اثر اک دوسرے پر جیسے دونوں کا بہت
نہر سے حالاں کہ تھوڑا سا وہ ہٹ کر باغ تھا

وہ بھی کیا دن تھے یہاں پھرنے پھرانے کے لیے
تھوڑا تھوڑا ہی سہی ، سب کو میسّر باغ تھا

سیر کی خاطر گیا تھا چند لمحوں کے لیے
اور ، مجھ کو واپسی پر سارا ازبر باغ تھا

کیا ہوا تھی جو اُڑا کر لے گئی سب کچھ ، ظفر
اور ، آخر میں کہیں نیچے نہ اُوپر باغ تھا

☆

سوال رُوبرُو ہے کہ جواب چل رہا ہے
کچھ اسی طرح کا مجھ میں کوئی خواب چل رہا ہے

کوئی اک معاملہ ہے ضرر و زیاں سے بڑھ کر
یہ کسی کے ساتھ اپنا جو حساب چل رہا ہے

یہ وہ باغ ہے کہ جس کے سبھی ڈھنگ ہیں نرالے
جو ہوا رُکی ہوئی ہے تو گلاب چل رہا ہے

کوئی اور شے ہے اب کے جو گزر رہی ہے مجھ میں
کہ سرک رہا ہے صحرا نہ سراب چل رہا ہے

ہے کہیں اسی کے پیچھے کوئی مُستقل محبت
یہ ہمارے درمیاں میں جو حجاب چل رہا ہے

یہ سفر ہے وہ کہ جس سے نہیں نااُمید بھی میں
کہ ابھی مرا سفینہ تہِ آب چل رہا ہے

کہیں اور لے گئے ہیں مجھے کھینچ کر یہاں سے
یہ حباب کے برابر جو حباب چل رہا ہے

ابھی تک اُٹھا رکھی ہے وہی زندگی کی زحمت
ابھی ساتھ ساتھ اپنے یہ عذاب چل رہا ہے

ظفر، ایک جیسے پرزے بھی اس مشین کے ہیں
کہ دُرست کارگر ہے نہ خراب چل رہا ہے

-☆-

خبر نہ تھی کہ یُونہی بند راستا رہے گا
یہ خواب جیسے پڑا ہے یہیں پڑا رہے گا

معاملہ تو رکھے گا مُسلسل اور کے ساتھ
مگر، ہماری طرف بھی وہ دیکھتا رہے گا

مُصالحت ہوئی اس بات پر محبت میں
کہ میں الگ رہوں گا اور وہ جُدا رہے گا

سدا بہار ہے کیا لاتعلقی اپنی
یہ پیڑ وہ ہے کہ پت جھڑ میں بھی ہرا رہے گا

میں بے خبر ہوں نشیب و فراز سے، لیکن
یہ آسمان زمیں کی طرف جُھکا رہے گا

کچھ انحصار نہیں موسموں پہ اس کا ابھی
کہ باغ اپنی ہواؤں سے ہی بھرا رہے گا

یہاں پہ آ نہیں سکتا ہے انقلاب کبھی
کہ خلق خلق رہے گی، خُدا خُدا رہے گا

یہ لوگ پھر کہیں مل جل کے گفتگو کریں گے
یہ شہر پھر کسی آفت میں مُبتلا رہے گا

سو، ہم ہی اور کہیں جا کے لگ رہیں کہ ظفر
وہ لگ گیا ہے جہاں پر، وہیں لگا رہے گا

-☆-

یہیں کہیں تھا ابھی ، نا کہاں کہاں گیا ہے
یہ مجھ کو چھوڑ کے سارا جہاں کہاں گیا ہے

ابھی مَیں سو کے اُٹھا ہوں تو کچھ نہیں موجود
زمیں کدھر گئی ہے ، آسماں کہاں گیا ہے

مَیں اپنے پیڑ کو پہچانتا ہوں سر تا سر
وہی ہے شاخ ، مگر ، آشیاں کہاں گیا ہے

رُکا بھی ہو گا ، مجھے کچھ خبر نہیں ، لیکن
مَیں جانتا ہوں کہ وہ بعدازاں کہاں گیا ہے

بھٹکتی ہے اِنھی آثار میں تلاش مری
مکیں کدھر کو سدھارے ، مکاں کہاں گیا ہے

مَیں واپسی پہ یہی پوچھتا ہوں اب ہر بار
فلاں نظر نہیں آتا ، فلاں کہاں گیا ہے

جو مَیں نہیں تو چلو یہ بھی کوئی بات نہیں
یہاں جو تھا مرا خوابِ رواں ، کہاں گیا ہے

یہ کاروبار مرے نام سے ہُوا تھا یہاں
تو اِس کا نفع کدھر ہے ، زیاں کہاں گیا ہے

سفینہ سمت بدلتا ہے اپنے آپ ، ظفر
کوئی بتاؤ ، مرا بادباں کہاں گیا ہے

☆

تمھارے دل میں ارادہ نہیں تو رہنے دو
ہمیں جو ٹوٹ کے ملنا نہیں تو رہنے دو

ہمارے خواب کو چھوڑو کہ چل رہا ہے ابھی
اگر خیال تمھارا نہیں تو رہنے دو

یہ رات چھائی ہوئی ہے جو اپنے چاروں طرف
مگر اِس میں کوئی ستارہ نہیں تو رہنے دو

کوئی نہیں ہے یہاں ، کیا خبر کہ ہم بھی نہ ہوں
کچھ اِس نواح میں دُنیا نہیں تو رہنے دو

سفر ہے اور ، تقاضے بھی اِس کے ہیں کوئی
یہ بارِ خواب اُٹھانا نہیں تو رہنے دو

کمی نہیں ہے دیہاڑی یہاں ہماری بھی
تمھارے پاس کرایہ نہیں تو رہنے دو

تم آ رہو گے تو پھر ہم کہاں رہیں گے بھلا
کبھی جو آن کے رہنا نہیں تو رہنے دو

یہ گفتگو تو بہت ہو چکی ہے پہلے بھی
کچھ اور اِس کے علاوہ نہیں تو رہنے دو

معاملہ کوئی پیچیدہ بھی نہیں تھا ، ظفر
اگر وہ بات سمجھنا نہیں تو رہنے دو

☆

دیر تک سلسلۂ صبح و صبا میں ہونا
کسی خوشبو کا مرے دشتِ ریا میں ہونا

کیا رہائش کرے وہ حُسن دو عالم دل میں
کس کو راس آئے گا اس تنگیِ جا میں ہونا

پھوٹ سکتا ہے مری رُوح کا سُوکھا ہوا پیڑ
شرط ہے لیکن اُسی آب و ہوا میں ہونا

درگزرنا سروسامانِ سفر سے یک دم
پھر ترے خواب کا اس برگ و نوا میں ہونا

رات کی ساری مسافت بہت آساں رہتی
روشنی کا ترے نقشِ کفِ پا میں ہونا

دل کے اندر سے کسی شور کا اُٹھنا سرِ صبح
کسی شیون کا مرے دستِ دُعا میں ہونا

درخورِ ناز نہیں ہوں تو یہ لازم ہے ابھی
کوئی توفیق مری طبعِ رسا میں ہونا

مست پھرنا کبھی اُن سوچتی راہوں پہ کہیں
کبھی اُس شہرِ دلآرا کی فضا میں ہونا

بھیک وہ بھیج بھی سکتے ہیں بُلاوے کی، ظفر
کچھ اثر چاہیے ہے اپنی صدا میں ہونا

☆

بھٹک رہے ہیں فضاؤں میں دھیان کے ٹکڑے
یہ کیا طلسم ہے، اے میری جان کے ٹکڑے

سفینہ ڈوب رہا ہے تو اب کہیں جا کر
میں سی رہا ہوں کھڑا بادبان کے ٹکڑے

بظاہر ایک ہے، لیکن مکین بڑھتے گئے
مکان ہی میں ہوئے ہیں مکان کے ٹکڑے

کہیں جمائی گئی میری بات کی دھجّی
کہیں لگائے ہیں اُس کے بیان کے ٹکڑے

ہُوا ہے سلسلۂ واقعات جب یکسُو
کیے ہیں جمع کسی داستان کے ٹکڑے

میں توڑ پھوڑ کے اس کو یہاں تک آیا ہوں
لیے پھروں گا کہاں تک زبان کے ٹکڑے

میں لخت لخت رہا ایک عُمر تک، اور، اب
کہیں سے جُڑنے لگے ہیں، یہ آن کے ٹکڑے

خدا کا آئنہ اپنے ہی زور سے ٹوٹا
سو، چُن رہا ہوں اُسی بے نشان کے ٹکڑے

فلک پہ پھیلے ہوئے خطّہ ہائے خاک، ظفر
زمیں پہ بکھرے ہوئے آسمان کے ٹکڑے

☆

ہم نے دیکھا ہی نہیں ایسا تماشا کام تھا
رہ گیا ویسے کا ویسا جو بھی سارا کام تھا

چھوڑ دی ہے اُس کی خواہش چاہتے تھے جس کو ہم
کچھ بُرا یہ بھی نہیں ہے، وہ بھی اچھا کام تھا

دل سے باہر تھی زمیں، اور، آسماں آنکھوں میں ہے
جو ہمیں سونپا گیا وہ ایک دُنیا کام تھا

کچھ تو ناممکن ہُوا کرتے ہیں ویسے ہی، مگر
آپ سے ہم کو پڑا ہے جو یہ پہلا کام تھا

شعر کا اچھا بُرا ہونا نہیں ہے کوئی شرط
دُوسروں سے مختلف البتہ اپنا کام تھا

مسئلے جو بھی تھے اپنے، کیسے ہو سکتے تھے حل
جس جگہ دیوار تھی ہم کو دریچہ کام تھا

کام چوری سے ہُوا کارِ محبت کا یہ حال
حل کے ہو سکتا تھا آخر، تھوڑا تھوڑا کام تھا

دل لگا کر کر نہیں پائے ہیں اُس کو بھی کبھی
ورنہ ہم تو خود بھی ویسے ہی تھے جیسا کام تھا

ہم وہ قسمت کے دھنی ہیں، سربسر اپنا، ظفر
وہ بھی یُوں ہی رہ گیا جو ہونے والا کام تھا

☆

کس طرح کی یہ تاک ہے اور جھانک
دیکھنے سے بکھر رہی ہے آنکھ

کچھ حجاب و حیا بھی چاہیے ہے
چھاتیاں کھول دی ہیں، سر تو ڈھانک

شور اتنا بپا تھا ہر جانب
عشق نکلا ہے صرف ایک چھٹانک

سیبِ رُخسار کا جو ہے چرچا
کہیں اپنے لیے بھی ہے کوئی پھانک

واہ رے قافیے کی مجبوری
کہ اچانک بھی ہو رہا ہے اچانک

آسمانوں پہ جا کے پھُول کھِلا!
اور، اِس خاک پر ستارے ٹانک

سب زرِ عمر خرچ کر دیا ہے
سربسر ہو کے رہ گیا ہوں پھانک

دُور ہے سبزہ گاہِ معنی، ابھی
اور الفاظ کا یہ ریوڑ ہانک

جو بھی ہو، ایک ہی اثر ہے، ظفر
بوسہ ملتا نہیں تو زہر ہی پھانک

☆

دکھائی دی ہوا جیسے ہوا کی دوسری جانب
اُسی صورت خدا ہی تھا خدا کی دوسری جانب

میں آنکھیں بند کر کے دیکھ بھی سکتا ہوں اُن سب کو
مناظر اور بھی ہیں اِس فضا کی دوسری جانب

یہ گُل بُوٹے بھی فردوسِ نظر سے کم نہیں ، لیکن
کرشمہ اصل ہے بندِ قبا کی دوسری جانب

نہ جس کو دیکھ سکتے ہیں نہ اُس کو چوم سکتے ہیں
کوئی ہو گی ضرور اُس نقشِ پا کی دوسری جانب

غنیمت جانیے فی الحال تو یہ ایک رُخ اُس کا
اگر ہے بھی کہیں اُس کم نما کی دوسری جانب

کبھی گزرو جو اُس کی نرم خُو پایاب لہروں سے
کبھی دیکھو جو دریائے فنا کی دوسری جانب

اِدھر رہتا ہوں شب بھر ہاتھ پھیلائے ہُوئے ، لیکن
اثر دیکھا ہے دیوارِ دُعا کی دوسری جانب

کبھی نکلے گی خلقت مطلب و معنی سے آگے بھی
کبھی بکھرے گی اِس نقشِ نوا کی دوسری جانب

ظفرؔ ، خوابِ سخن مجھ سے جدا ہو ہی نہیں سکتا
کہ خود موجود ہوں اپنی صدا کی دوسری جانب

☆

ایک تھا دراصل ، اور ، دو کے برابر کام تھا
اُس کو باہر کی پڑی تھی ، میرا اندر کام تھا

کیسے ہو سکتا تھا فرصت کا کوئی لمحہ نصیب
جس قدر مصروفیت نیچے تھی ، اُوپر کام تھا

خواب کے ٹکڑے ہی تھے پھیلے ہُوئے چاروں طرف
جمع کیا تھی ، اِک طرح سے کوئی خنجر کام تھا

بوجھ سے اُس کے میں نکلا ہی نہیں پھر عمر بھر
سوچنا بھاری کچھ اتنا تھا کہ پتھر کام تھا

بھول کر اُس نے اگر کر ہی دیا تھا ایک بار
بعد میں اُس کے تئیں مجھ کو مکرّر کام تھا

جو بظاہر کام لگتا ہی نہیں تھا سربسر
جب وہی کرنے پہ آئے تو سراسر کام تھا

تھا وہ ہونے سے زیادہ دیکھنے کا کاروبار
ایک تصویرِ طلب تھی ، ایک منظر کام تھا

ویسے کہنے کو نہیں یہ بھی بُرا ایسا کوئی
تھوڑا تھوڑا سا ، مگر ، وہ اِس سے بہتر کام تھا

خوشبوئیں ہی خوشبوئیں بکھری تھیں ہر جانب ، ظفرؔ
کیا پسینے تھے رواں ، کیسا معطّر کام تھا

☆

جاگتے میں بھی عجب خواب دکھاتے ہوئے دن
کیوں نہ ٹھہرے وہ مجھے چھوڑ کے جاتے ہوئے دن

صبح تک وہ کسی صحرا میں بھٹکتی راتیں
شام تک وہ کسی دریا میں نہاتے ہوئے دن

تھکے ہارے ، وہ کسی خواب سفر کے مارے
گرتے پڑتے وہ کہیں خود کو اٹھاتے ہوئے دن

کھیلتے ، ہنستے کسی اور کی صحبت میں کہیں
مجھ سے شرماتے ہوئے ، آنکھ چراتے ہوئے دن

مجھے گھیرے میں لیے رکھتی ہیں راتیں ہر وقت
رک گئے ہیں کہیں رستے ہی میں آتے ہوئے دن

میری خاموش اداسی کی طرف سے ہو کر
شور کرتے ہوئے اور دھوم مچاتے ہوئے دن

کام کرتے ہوئے مجھ سے کوئی بالا بالا
اندر اندر کوئی شے مجھ سے چھپاتے ہوئے دن

آج تک میری سمجھ میں نہیں آئے ہیں کبھی
مجھ سے نکلے ہوئے ، اور ، مجھ میں سماتے ہوئے دن

ظفر ، اب اور مرے ساتھ نہیں چل سکتے
آپ سوئے ہوئے ، اور ، مجھ کو جگاتے ہوئے دن

☆

گزرا ہے مرے حالِ پریشاں کی طرف سے
جو عکس اڑا صبحِ گریباں کی طرف سے

ایک ایسی کرن جو کہ اندھیری ہے نہ روشن
اچھلی ہے چراغِ تہِ داماں کی طرف سے

قسمت جو کھلی بھی تو کچھ اس طرح کہ مجھ تک
دریا کی ہوا آئی بیاباں کی طرف سے

ہوں قید بھی ، آزاد بھی اس دل کی بدولت
زنداں کو رواں ہوں کبھی زنداں کی طرف سے

میرا بھی سفر مفت میں طے ہونے لگا ہے
خوش ہوں بہت اس خاکِ خراماں کی طرف سے

رہتا ہوں کسی تازہ مصیبت میں گرفتار
مشکل کی بدولت کبھی آساں کی طرف سے

خود سے ہوا خالی تو سبھی خوف ہوئے ختم
بےفکر پڑا ہوں سروساماں کی طرف سے

مہلت سی کوئی تندیِ طوفاں کی طرف کو
موسم سا کوئی خوابِ گلستاں کی طرف سے

میرا یہ ، ظفر ، مظہرِ موجود پہ رہنا
ہے ایک اشارہ کسی امکاں کی طرف سے

☆

گرنے کا مرحلہ نہ سنبھلنے کا وقت ہے
یہ اس جگہ سے تیز نکلنے کا وقت ہے

ویراں ہے رہگزار تو سنسان ہیں درخت
کچھ ایسی خامشی میں دہلنے کا وقت ہے

نصف النہار پر ہوں ، مجھے کوئی غم نہیں
میں جانتا ہوں یہ مرے ڈھلنے کا وقت ہے

یہ راز ہے تو اب اسے ہونا ہے آشکار
یہ رنگ ہے تو اس کے بدلنے کا وقت ہے

باہر کی بارشوں کا نہیں ہے کچھ اعتبار
اندر سے کوئی چشمہ اُبلنے کا وقت ہے

ساکن ہوئی ہے شام اسی واسطے کہ یہ
شاخِ ہوا کے پھولنے پھلنے کا وقت ہے

اس چاند کے کہیں پہ چمکنے کی ہے گھڑی
پانی کا ساحلوں سے اُچھلنے کا وقت ہے

ہونے کی تھرتھری سے نہ ہونے کا اک سفر
یہ آتشِ وصال میں جلنے کا وقت ہے

دھرنا ہی دے کے بیٹھ گئے ہیں یہاں ، ظفر
حالاں کہ یہ تو آپ کے چلنے کا وقت ہے

-☆-

کم تر کی ہوس میں جو برابر کی ہوا تھی
اپنی تو سمجھ سے ہی وہ باہر کی ہوا تھی

کیا سبزۂ بیگانہ بچھا تھا مرے اندر
کیا چاروں طرف سرو و صنوبر کی ہوا تھی

اُس شام تو کچھ اور بھی روشن تھے ستارے
ایسی کوئی اُس ماہِ منوّر کی ہوا تھی

اک چھاؤں رہی دھوپ کی چادر لیے دن بھر
صحرا کے ٹیلوں میں سمندر کی ہوا تھی

زنجیرِ زیاں بھی تھی مرے پانو میں ، لیکن
ہاتھوں میں کسی خوابِ معطّر کی ہوا تھی

میں بھی تھا کسی اور طرف محوِ تماشا
وہ بھی کسی مٹتے ہوئے منظر کی ہوا تھی

ٹکنے نہیں دیتی تھی زمیں پر جو مرے پانو
کھینچے لیے پھرتی وہ مرے سر کی ہوا تھی

باہر کی طرف رُخ تھا مری سعیِ سخن کا
لیکن یہ کسی گنبدِ بے در کی ہوا تھی

مُدت سے ظفر، روک رکھا تھا جسے میں نے
تنہا کے مُقابل کوئی اکثر کی ہوا تھی

-☆-

یہاں کے چاروں طرف یا وہاں کے چاروں طرف
کوئی کنارہ نہیں بے کراں کے چاروں طرف

کچھ اور سلسلۂ رائگاں ملے گا ابھی
کسی بھی سلسلۂ رائگاں کے چاروں طرف

اک اور مرحلۂ زرگری بھی ہے موجود
ہمارے آپ کے سُود و زیاں کے چاروں طرف

کسی خیال نے یُوں دل کو گھیر رکھا ہے
کہ ایک شور ہے اس بے زباں کے چاروں طرف

مری تلاش میں نکلو تو دستیاب ہوں مَیں
عیاں کے ایک طرف ، اور ، نہاں کے چاروں طرف

کسی کا اُس کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا
جو بات بکھری ہوئی ہے بیاں کے چاروں طرف

چمکتے رہتے ہیں دن رات آئنوں کی طرح
نقوشِ پا ہیں جو اُس آستاں کے چاروں طرف

اُسی طرف کہیں ممکن ہے بُود و باش مری
مری گرفت میں ہوں گے جہاں کے چاروں طرف

ہنوز میری بحالی اسی میں ہے کہ ، ظفر
مَیں گرد گرد رہُوں کارواں کے چاروں طرف

☆

طبع رسا تھی ، اور ، روانی کا رنگ تھا
الفاظ میں جو خوابِ معانی کا رنگ تھا

جو داستاں تھی اُس پہ حقیقت کا تھا گماں
جو واقعہ تھا اُس میں کہانی کا رنگ تھا

عرضِ ہوس کہ عرضِ ہوس ہی نہ تھی فقط
اُس میں بھی ایک یاددہانی کا رنگ تھا

بس ریت رہ گئی تھی گزرگاہِ آب پر
پانی نہیں تھا اب وہاں پانی کا رنگ تھا

رہنا ہمارا اپنے ہی گھر میں رہا ، مگر
سارا ہی اس میں نقلِ مکانی کا رنگ تھا

آنکھوں کے آئنے تو سبکسار تھے یہاں
دل کے نواح میں ہی گرانی کا رنگ تھا

اُوپر سے چل رہی تھیں ہوائیں بھی تند و تیز
خاشاک یُوں پہ شعلہ بیانی کا رنگ تھا

مَیں جس جگہ نہیں تھا وہاں دُور دُور تک
آب و ہوا پہ میری نشانی کا رنگ تھا

وہ سرزنش تھی نامۂ انکار میں ، ظفر
تحریر سے زیادہ زبانی کا رنگ تھا

☆

پہلے دیکھی نہیں ایسی بھی دن رات پہ دُھند
ہے کسی ذات کی ہر وقت مری ذات پہ دُھند

کہیں کُھلتا ہی نہیں اصل حقیقت کیا ہے
ہیں کسی دُھند میں حالات کہ حالات پہ دُھند

کون ہے، کیوں ہے، کہاں پر ہے کوئی، کُچھ نہ کُھلا
اور، پھر، گِرنے لگی سارے سوالات پہ دُھند

دُھوپ نکلے تو کہیں کھوج لگائیں جا کر
ہے بہت پھیلی ہُوئی اُس کے نشانات پہ دُھند

گُلِ نظارہ کبھی گُم نہ ہُوا تھا ایسے
آج اُتری ہے یہ کیسی ترے باغات پہ دُھند

اپنا اپنا سا نظر آتا ہے کیوں دُور سے وہ
اجنبیت کی جو رکھتا ہے مُلاقات پہ دُھند

راستہ کوئی سُجھائی نہیں دیتا اب کے
چھائی رہتی ہے محبت کے مُضافات پہ دُھند

یہ بھی ہو سکتا ہے اُس شوخ کا مطلب، وہ بھی
کُچھ عجب طرح کی ہے اُس کے اِشارات پہ دُھند

بات کِس طرح، ظفرؔ، صاف سمجھ میں آئے
ڈھونڈتا رہتا ہُوں خُود اپنے بیانات پہ دُھند

☆

خاص کر چھپایا ہُوا یہ عام جیسا رنگ ہے
بلکہ یُوں کہیے، برائے نام جیسا رنگ ہے

صبح سی ہر دم لیے رکھتا ہے جو چاروں طرف
دیکھنے میں اُس کا اپنا شام جیسا رنگ ہے

آ نکلتا ہے گھڑی بھر کے لیے دو ایک بار
دل کے اندر کوئی اُس کے بام جیسا رنگ ہے

ہے عجب نیرنگیِ کارِ محبت، کیا بتائیں
رنگ جیسا کام ہے، اور، کام جیسا رنگ ہے

کتنی آسایش بہم ہوتی ہے اُس کو دیکھ کر
اِس تھکاوٹ میں وہ کیا آرام جیسا رنگ ہے

کر رہا ہُوں مَیں تو کتنی دیر سے اُس کا گُماں
چارسُو، لیکن، خیالِ خام جیسا رنگ ہے

یہ بھی ہو سکتا ہے مر مِٹنا مرا اُس شوخ پر
جو بظاہر تو کوئی الزام جیسا رنگ ہے

کِس طرح کی یہ خوشی ہے کہ اِس کے گرد و پیش
دُور تک پھیلا ہُوا کُہرام جیسا رنگ ہے

اِتنی ویرانی ہے کیوں خوابِ تمنّا پر، ظفرؔ
کِس لیے آغاز کا انجام جیسا رنگ ہے

☆

روز روز یہ لمبی تان کے سونا ، اور ، نہ ہونا
کب کا ہُوا برابر اپنا ہونا اور نہ ہونا

ایک ہی وقت میں دونوں باتیں کیوں کر ہو سکتی ہیں
یعنی شام کنارے بیٹھ کے رونا ، اور نہ ہونا

سب کا ڈھونڈتے رہنا وہ بے سُود یہیں ہر جانب
اپنے آپ کو اِسی بھیڑ میں کھونا اور نہ ہونا

جیسے دو رنگوں کا مِلنا اور مِٹ جانا مِل کر
ہونے کو کسی اَن ہونے میں سمونا اور نہ ہونا

میل کی صُورت رہنا اپنے پہنے ہُوئے کپڑوں میں
اور ، پھر اُن کو کہیں اُتار کے دھونا اور نہ ہونا

اپنا مرہُونِ منّت ہی رہنا مرتے جیتے
اِسی وُجُود میں بیج عدم کے بونا اور نہ ہونا

شام اور شہر کے ساتھ ہی دُھند میں گُم ہو جانا اکثر
اُس کی دید سے آنکھیں روز بھگونا اور نہ ہونا

بِک جانا بازارِ خیال میں پُوری قیمت لے کر
سوچتے جانا اُس کے جسم کا سونا اور نہ ہونا

رُک جانا لہروں کا سارا شور ، ظفر ، اُس لمحے
خوابِ سمندر میں خُود کو وہ ڈبونا اور نہ ہونا

☆

ایک پہاڑ کی چوٹی ہے ، اور ، اُس کے رُخ پر شُعلہ
اُسی پہاڑ کی وادی سی ، وادی کے اندر شُعلہ

بہت ٹھٹھرتے ہُوئے لوگ تھے ، اور ، بجھے ہُوئے لفظ
دروازہ تھا برف سے بند ، اور ، گھر کے باہر شُعلہ

رات کے اندر بھی اور ، رات سے باہر بھی تھی رات
لرزا ، اور ، بُلند ہُوا شُعلے کے اُوپر شُعلہ

وُہی گھاس تھی ، وُہی گھاٹیاں ، اور ، وُہی جھلمل
پتّی پتّی شبنم تھی ، اور ، پتھر پتھر شُعلہ

ایسا ہی موسم ہے گِرتا ہُوا کب سے ہر سَمت
چلی ہے کبھی کبھار ہوا ، اور ، بُجھا ہے اکثر شُعلہ

آہ تھی جو آہستہ آہستہ آندھی ہی کہلائی
شیون تھا جو رفتہ رفتہ ہُوا سراسر شُعلہ

رہتے ہیں تاریک تماشے سامنے ، دائیں بائیں
رقص دکھا جاتا ہے ان آنکھوں میں گھڑی بھر شُعلہ

آگ سے مَیں ، اور ، وہ ، دونوں محفوظ تھے اب کے لیکن
خوابوں خواب الاؤ رہے ، اور منظر منظر شُعلہ

شام اندھیری تھی ، لیکن ، اِتنی بھی نہیں تھی ، ظفر
پہلے روشن رہا درخت ، پھر اُس کے برابر شُعلہ

☆

دھوپ سے انکار ہے ، اور ، دھوپ ہے
اک عجب اسرار ہے ، اور ، دھوپ ہے

سبزہ ہے ، اور ، ابر ہے ، اور ، آب جُو
اور ، گُل و گلزار ہے ، اور ، دھوپ ہے

ذائقے دونوں مُیسّر ہیں یہاں
سایۂ دیوار ہے ، اور ، دھوپ ہے

تپ رہے ہیں راستے صحراؤں کے
قافلہ تیار ہے ، اور ، دھوپ ہے

کوئی بھی خاموش رہنے کا نہیں
گرمیِ گفتار ہے ، اور ، دھوپ ہے

چھاؤں یہ مُجھ تک بھی آنی چاہیے
بس یہی اصرار ہے ، اور ، دھوپ ہے

ہم سفر وہ ہے تو پھر کیا ہے ، اگر
آتشِ رُخسار ہے ، اور ، دھوپ ہے

ایک مُدّت سے مرے اندر کہیں
برف کا بازار ہے ، اور ، دھوپ ہے

شہر کے اُونچے مکانوں پر ، ظفر
اک دُھوئیں کی دھار ہے ، اور ، دھوپ ہے

☆

نکلا ہے زور میں کسی جھرنے سے ماہتاب
اچھا ہے بچ گیا جو بکھرنے سے ماہتاب

اُس رشکِ آفتاب کا شُہرہ تھا اس قدر
منکر ہُوا زمیں پہ اُترنے سے ماہتاب

مجبور آپ بھی ہے ، بھلا کیسے باز آئے
ان پانیوں کو زیر و زبرنے سے ماہتاب

ہے کِس کی جستجو جو مُسلسل سفر میں ہے
ڈرتا ہے ڈوبنے نہ اُبھرنے سے ماہتاب

چلتا ہے میرے ساتھ ، چلوں جس طرف ، مگر
رُکتا نہیں ہے میرے ٹھہرنے سے ماہتاب

موسم ہے جس طرح کا بھی ، رہتا ہے تازہ تر
اُس کی گلی سے روز گزرنے سے ماہتاب

سُورج کے ساتھ رابطہ رکھتا ہے مستقل
محفوظ ہو سکے جو ٹھٹھرنے سے ماہتاب

زندہ ہے سبزہ گاہِ فلک پر ، شبانہ روز
مُنہ مارنے ، یہاں وہاں چرنے سے ماہتاب

تھی جیتے جی بھی ایسی ہی اُس کی چمک دمک
بدلا نہیں ، ظفر ، مرے مرنے سے ماہتاب

☆

خشکی پہ دُھوپ دھار ہے، پانی میں آفتاب
رُکتا نہیں جو اپنی روانی میں آفتاب

قصے میں ہے کہیں نہ کہانی میں آفتاب
موجود ہے تو مطلعِ ثانی میں آفتاب

نکلا سُبکسری کی ہوا میں کہیں اگر
ہو گا غروب دل کی گرانی میں آفتاب

رکھتا ہے تازہ موسمِ خواب و خیال کو
چمکے جو ایک یادِ پُرانی میں آفتاب

ہیں اور بھی اگرچہ دمکتے ہوئے نشاں
روشن ہے میری پہلی نشانی میں آفتاب

ہوتی کہیں جو میرے تسلّط میں دُھوپ چھاؤں
رہتا اگر مری نگرانی میں آفتاب

سامان ہے سڑک پہ تو خود بے سُراغ ہوں
حائل ہُوا ہے نقلِ مکانی میں آفتاب

الفاظ کا خُود اپنا اندھیرا ہے اِس قدر
بے کار ڈھونڈتا ہوں معانی میں آفتاب

تپتے ہیں میرے ہونٹ بُڑھاپے میں بھی، ظفر
چُوما تھا ایک بار جوانی میں آفتاب

☆

اندر کے ستارے ہیں نہ باہر کے ستارے
یہ تو ہیں کسی اور ہی منظر کے ستارے

گردش ہے جو ایک اور خلا میں کہیں ان کی
ہیں یہ بھی ستاروں کے برابر کے ستارے

اب جا کے چمکتے ہیں کسی اور فلک پر
میں جن کو سمجھتا تھا کبھی گھر کے ستارے

کچھ دیر سے ہے علق بھی تقدیر کی ہیٹی
کچھ اوج پہ ہیں یُوں بھی ستمگر کے ستارے

آتے ہی شبِ وعدہ جو مُنہ اُس نے چھپایا
چمکے بہت اُس زُلفِ معطّر کے ستارے

یکساں ہے سبھی کے لیے یہ خواب سا ماحول
مدھم ہیں بہت ماہِ مُنوّر کے ستارے

کچھ مجھ سے ہی مخصوص نہیں ہے یہ تماشا
گم ہیں یہاں میری طرح اکثر کے ستارے

میں ہوں ادھر اس بھیڑ میں گم گشتہ و حیراں
تُو ہے کدھر، اے میرے مقدّر کے ستارے

ایسا ہی تھا موسم، ظفر، ایسی ہی فضا تھی
جب ٹُوٹ رہے تھے مرے اندر کے ستارے

☆

جمع ہونے لگے رستوں پہ بکھرتے ہوئے رنگ
بُجھ بھی سکتے ہیں یہ آنکھوں میں اُترتے ہوئے رنگ

کیسی دم توڑتی جاتی ہے گزرتی ہوئی رات
مُجھ سے دیکھے نہیں جاتے ہیں یہ مرتے ہوئے رنگ

شام ہے، اور، سرِ راہ کھڑا ہوں کب سے
ہیں مرے سامنے تیزی سے گزرتے ہوئے رنگ

مَیں کہیں وسط میں تھا بھی کہ نہیں تھا، لیکن
تھے مرے چاروں طرف ڈوبتے ڈرتے ہوئے رنگ

آگ تھی ایک طرف تیز، بھڑکتی ہوئی آگ
اور، اُدھر دُوسری جانب تھے ٹھٹھرتے ہوئے رنگ

عید کے نقش پہ ٹھہرا ہوا تاریک دُھواں
خاکۂ خواب میں وہ دیر سے بھرتے ہوئے رنگ

میرے ہمراہ روانہ ہیں کسی خواب کی طرح
مَیں جو ٹھہروں تو مرے ساتھ ٹھہرتے ہوئے رنگ

اک زمانے سے وہ تصویر ابھی تک ہے نئی
اور، تروتازہ ہیں کب کے مرے برتے ہوئے رنگ

اُوپر اُوپر سے تو ایسے نہیں لگتے تھے، ظفر
اور ہی طرح کے نکلے ہیں یہ پڑتے ہوئے رنگ

☆

ملتی نہیں اب اُس کی نشانی زمین میں
گُم ہو گئی ہے کوئی کہانی زمین میں

ممکن ہے آسماں کی طرف دیکھتا رہوں
اور، بھول جاؤں آگ لگانی زمین میں

پہنا کے اُن کو اُونگھتے الفاظ کا کفن
پھر دفن کر دیے ہیں معانی زمین میں

گردش میں اس کی کون سے اَسرار ہیں نہاں
کس خاکِ خفتہ کی ہے روانی زمین میں

اس گھر کے بعد پھر کوئی جاتا نہیں کہیں
ہوتی ہے ایسی نقلِ مکانی زمین میں

رہتا ہے اُس کا ذائقہ اپنا ہی برقرار
مُشکل ہے کوئی چیز ملانی زمین میں

ہم نے بھی کھیلنا ہے وہاں جا کے اپنا داؤ
ہم نے بھی ہے بساط بچھانی زمین میں

آنکھوں میں آنسوؤں کا ذخیرہ ہے جس طرح
ایسے ہی بے حساب ہے پانی زمین میں

کیا فصلِ تازہ اس میں اُگاؤں گا، اے ظفر
کیسے غزل لکھوں گا پُرانی زمین میں

☆

کہیں لکھا ہُوا ہے یا زبانی فاصلہ ہے
جو تیرا اور میرا درمیانی فاصلہ ہے

یہ پہلے تو نہیں محسوس ہوتا تھا کچھ اتنا
مجھے لگتا ہے کوئی ناگہانی فاصلہ ہے

بہت کم لوگ ہیں اس پر یقیں کرنے کو تیار
کہ آپس میں ہمارا داستانی فاصلہ ہے

کہیں پیرایۂ پندار ہے اپنا بھی حائل
کہیں اُس بدگماں کی سرگرانی فاصلہ ہے

فضا میں دوریاں پھیلی ہُوئی ہیں میرے باہر
مرے اندر ہواؤں کی روانی فاصلہ ہے

مَیں اُس کو روک بھی سکتا نہیں ساحل پہ بیٹھا
مسلسل بہہ رہا ہے، اور، پانی فاصلہ ہے

ہم اپنی قدر و قیمت سے تمھارے پاس آتے
زمانے میں ہماری رایگانی فاصلہ ہے

قریبِ الفاظ کے آنا تو چاہوں گا کسی طور
مگر، میرے لیے مرگِ معانی فاصلہ ہے

پتا چلتا نہیں کچھ بھی، ہمارا، اور، اُس کا
زمینی ہے، ظفر، یا آسمانی فاصلہ ہے

☆

جاتے ہیں آرام پہ
جدّی پشتی کام پہ

اپنا کام ہی نہیں تھا
نکلنا ایک مقام پہ

ہو نہ سکا کچھ بھی اگر
جا پہنچیں گے لام پہ

وہ نہیں آیا تو ہمیں
خود جا پہنچے بام پہ

زندہ کس کے لیے ہیں
مرے تھے کس کے نام پہ

ہم نے دام اک اور بھی
پھیلایا ہے دام پہ

کیا شروع حلال سے
ہے انجام حرام پہ

بدلی باتوں کی روش
خاص بھی آ گئے عام پہ

یہ کیا مسلک ہے، ظفر
خوش ہونا دشنام پہ

☆

بات سُن ، بات ہے جواب طلب
اب مری ذات ہے جواب طلب

آخری رات کی بھی کر کوئی فکر
آخری رات ہے جواب طلب

گفتگو خامشی میں ڈال ، کہ یہ
بے سوالات ہے جواب طلب

آئنے کی نہیں ضرورت اب
عکسِ حالات ہے جواب طلب

کیوں نکلتا نہیں ہے جبر کا جن
دفعِ آفات ہے جواب طلب

بھوک مٹتی نہیں ہے کس خاطر
یہی خیرات ہے جواب طلب

یہ غریبی ہی مستقل کیوں ہے
یہ بھی سوغات ہے جواب طلب

اُلجھنوں کا سوال جو بھی کرے
اکثر اوقات ہے جواب طلب

مشکلوں اور مصیبتوں کی ، ظفر
ساری بہتات ہے جواب طلب

☆

دیکھ بھال کر
کچھ خیال کر

یا جواب دے
یا سوال کر

اس مثال کو
بے مثال کر

مر گیا ہوں میں
کچھ ملال کر

کچھ نکال بھی
اس میں ڈال کر

ساتھ ساتھ جاگ
ٹال ٹال کر

میرے ساتھ آ
گول مال کر

تھی اُداس بھی
مجھ کو ٹال کر

کیا ملا ، ظفر
روگ پال کر

☆

آشنا کا نہ اجنبی کا مزاج
سمجھ آتا نہیں کسی کا مزاج

ایک ہی طرح کا ہے ، دیکھ لیا
دوستی اور دشمنی کا مزاج

موت ہی ڈالتی ہے گھاس ہمیں
نہ ہی ملتا ہے زندگی کا مزاج

بات کرنا بھی اب ہے ناممکن
سر سے اونچا ہوا سبھی کا مزاج

دیر سے ہم کو دستیاب ہوا
تھا اندھیرے میں روشنی کا مزاج

تجربے سے ہمیں ہوا معلوم
سخت رنگیں ہے سادگی کا مزاج

یعنی مر مٹ چکے ہیں جس پر ہم
ہم سے ملتا نہیں اسی کا مزاج

کرو میرے لیے سزا تجویز
میں نے بدلا ہے شاعری کا مزاج

ماسوائے فرشتگاں کے ، ظفر
کس سے اٹھتا ہے آدمی کا مزاج

☆

ایک جنگل ہے دو شیر ہیں
کام انہی کا ہے جو شیر ہیں

ان کو آئے گا تب ہی یقیں
سارے مل کر کہو ، شیر ہیں

پھر کبھی ہانک لینا انہیں
اب انہیں چھوڑ دو ، شیر ہیں

شیر اصلی نہیں ہیں تو کیا
تم اگر چپ رہو ، شیر ہیں

جا کے تم کو دکھاتے وہاں
دیکھنے آئے ہو ، شیر ہیں

ان میں خصلت نہیں ہے ذرا
کوئی شیروں کی ، گو شیر ہیں

دو گھڑی میں گزر جائیں گے
راستے سے ہٹو ، شیر ہیں

اس سے پہلے کہ ہو جائیں بھیڑ
تم انھیں دیکھ لو ، شیر ہیں

آپ کیوں ڈر رہے ہیں ، ظفر
آپ ہی آپ تو شیر ہیں

☆

پھر جنگل میں ناچا مور
ہو گا یہ بھی اُس کا مور

کوئی کہانی تھی ، ورنہ
کیسا جنگل ، کیسا مور

ناچنے والا ، ہم کو بھی
لا دیتا اچھا سا مور

کیسے ناچتا پھرتا ہے
اِتنا موٹا تازہ مور

آپ کو ہے کیسا درکار
بُرا مور یا اچھا مور

یہ تو آپ کا ہے شاید
کہاں گیا ہے میرا مور

اِک دن مِل کر ناچے گا
میرے ساتھ تُمھارا مور

ناچے گا یہ اُتنا ہی
ہو گا جتنا بھُوکا مور

ہم مجبور تھے آپ ، ظفرؔ
چوروں کو کیا پڑتا مور

-☆-

مانتا ہوں ، وہ بھی کہیں مانتا
دُور کی چیزوں کو قریں مانتا

آپ تو کہتے ہیں اُسے آسماں
مَیں ہوں ، مگر ، اُس کو زمیں مانتا

ہوتے ہیں میرے تو گزارے یُونہی
مَیں کہ ہوں دُنیا کو ہی دیں مانتا

کُچھ اُسے مَیں مانتا بالا ، بُلند
کُچھ وہ مُجھے زیرِ نگیں مانتا

مانے اگر دُوسروں کے سامنے
آپ تو ہے اپنے تئیں مانتا

اِس قدر انکار تو کرتا نہ وہ
مَیں نہیں کہتا کہ یہیں مانتا

لوگ تو کہتے ہیں وفادار اُسے
مَیں ہی نہیں اُس کا یقیں مانتا

دُوسرے مانیں گے مُجھے کِس طرح
خُود کو تو مَیں خُود بھی نہیں مانتا

مانا ہے کیا اُس نے گھر آ کر ، ظفرؔ
بات تو جب تھی کہ وہیں مانتا

-☆-

اوسطاً چھوٹی کہ لمبی بحر میں
شعر کہہ سکتے ہو کیسی بحر میں

شعر کچھ میں نے کہے ہیں ان دنوں
دیکھ لو، سیدھی کہ اُلٹی بحر میں

میرا اپنی بحر سے آغاز تھا
اور، جا نکلا تمھاری بحر میں

یہ غزل سُن کر کچھ اپنی رائے دو
کس قدر باہر ہے، کتنی بحر میں

اور ابھی باقی ہے کتنا اختلاف
جس قدر ہے، اور، جتنی بحر میں

ایک تو ہوتی ہے اپنی شاعری
دُوسری ہوتی ہے پچھلی بحر میں

کتنے پانی میں ہیں، اندازہ لگاؤ
ہے غزل اپنی پرائی بحر میں

ہوں بڑا شاعر اگر تو یہ غزل
کیسے کہہ ڈالی ہے چھوٹی بحر میں

گر کبھی موقع ملا تو، اے ظفر
میں غزل لکھوں گا اُس کی بحر میں

☆

بے گھر ہے، جگہ کوئی ٹھکانے کے لیے دو
بھوکی ہے یہ مخلوق، اسے کھانے کے لیے دو

یہ حق ہے انھی کا جسے بیٹھے ہو دبائے
آئے ہیں تو حصّہ ہی چُکانے کے لیے دو

حاصل ہے یہ توقیر تمھیں جن کی بدولت
کچھ تو انھیں عزّت ہی بچانے کے لیے دو

ہے زیورِ تعلیم پہ قبضہ جو تمھارا
اوروں کو بھی یہ سجنے سجانے کے لیے دو

کرنے کے لیے کیوں نہیں، کھانے کے لیے کیوں
بہتر ہے کہ یہ ہاتھ کٹانے کے لیے دو

چوروں کی کمائی ہے زر و مال تمھارا
پکڑے گئے ہو، جان چھُڑوانے کے لیے دو

دو گے جو نہیں، چھین کے لے جائیں گے سب کچھ
اُس وقت سے بھی بچنے بچانے کے لیے دو

خُدّام تمھیں چاہیے ہیں حسبِ ضرورت
اُٹھنے کے لیے ایک، بٹھانے کے لیے دو

میں آپ کے جیسوں میں، ظفر، رہ نہیں سکتا
ہٹ جاؤ، مجھے راستہ جانے کے لیے دو

☆

کیا رہے گا یہاں نہ کیا بالفرض
تیز اگر چل پڑے ہوا بالفرض

چھوڑنا چاہیے زمیں یہ اُسے
آسماں پر نہیں خُدا بالفرض

اصل کیا ہے یہاں ، کسے معلوم
ہے یہ سارا ہی سلسلہ بالفرض

میں بفرضِ مُحال ہی تھا وہاں
وہ بھی موجود تھا کہ تھا بالفرض

کُچھ وضاحت بھی چاہیے ہم کو
ہے یہ پہلا کہ دُوسرا بالفرض

پھر اُسے کون روک سکتا ہے
ایک دن روک بھی لیا بالفرض

کون اُس پر چلے گا ، جانِ عزیز
میں بتاتا ہُوں راستا ، بالفرض

پھر کہاں لے کے جاؤں گا اُس کو
میرے دل میں وہ آگیا بالفرض

آپ کی پھر سزا ہے کیا کہ ، ظفر
ہُوا پُورا مرا کہا بالفرض

☆☆

کھیل تو کھیلا پیار کا
رہا جھمیلا پیار کا

ساتھ بہا لے گیا ہے
سب کچھ ریلا پیار کا

موسم بُوڑھی خاک پر
نیا نویلا پیار کا

آدھی رات لڑائی کی
سرگھی ویلا پیار کا

رنگ چڑھا ہے شوخ پر
کیا نخریلا پیار کا

وہ للیانی حُسن کی
میں لسیلا پیار کا

ٹھنڈا میٹھا کس قدر
تھا گجریلا پیار کا

کب تک پڑے دھکیلنا
دیکھیں ، ٹھیلا پیار کا

لگا ہے آ کر دُور سے
ہمیں ہی ڈھیلا پیار کا

زور و زوری کھلا ہے
پھول البیلا پیار کا

سب سے کڑوی نیم پر
چڑھا کریلا پیار کا

پتا نشانی کچھ نہیں
بوجھ پہیلا پیار کا

وہی لہو کی ندیاں
وہی کسیلا پیار کا

رات کٹیلی دن بدن
کام بڑھیلا پیار کا

بچھڑی گوکی روپ کی
سانڈ مجھیلا پیار کا

باستی انکار کی
اوپر سہیلا پیار کا

رہتا ہے ہر وقت ہی
ویل کویلا پیار کا

ہریالی کے کھوج میں
نٹ کھٹ چھیلا پیار کا

چلتے چلتے ایک دم
پانو اڑیلا پیار کا

تچھوں بیچ ہی پھر کہیں
کام پھنسیلا پیار کا

قصہ سن کر ہنس دیے
آپ وکھیلا پیار کا

پھیلایا بے کار ہی
وہاں جھمیلا پیار کا

پکڑ قصائی لے گئے
گم صم لیلا پیار کا

راس ہے سوکھے سڑے کو
نرم گدیلا پیار کا

خرمستوں پر کھلا ہے
ابھی طویلہ پیار کا

تن کی ہری کپاس کو
پڑ گیا تیلہ پیار کا

پھول کھلے جس جس جگہ
پانو پڑیلا پیار کا

تو ہم نے کہاں پر
آ کر ٹھیلا پیار کا

گورا بہت قریب سے
تیز غُلیلا پیار کا

سُکھ تو سپنا ہے مگر
دُکھ پتھریلا پیار کا

پُھول ، ستارے ، اور ، وہ
اور ، سجیلا پیار کا

پُھولا کُچھ دن لہُو میں
ایک چمپیلا پیار کا

کام کسوتر ہے وُہی
نام بڑیلا پیار کا

سردی ، گرمی ، دُھوپ ، چھاؤں
دُکھ سُکھ جھیلا پیار کا

جلدی جلدی حلق میں
زہر اُنڈیلا پیار کا

ماں اُوھلاک ازل کی ہے
پیو سوتیلا پیار کا

جیب کاٹ کر لے گئے
پیسا دھیلا پیار کا

چھوڑ کے آخر چل دیے
بھریا میلا پیار کا

اُکھڑا آندھی میں وُہی
پیڑ اکیلا پیار کا

مر گئیں پریت کی داسیاں
رہ گیا چیلا پیار کا

ہم نے کتنے جتن سے
اُونٹ نکیلا پیار کا

گھات میں ہے پھرے کہیں
کوئی بگھیلا پیار کا

غارت گر بھی ہے وُہی
وُہی رکھیلا پیار کا

لکڑی چور ہی کھا گئے
جنگل بیلا پیار کا

کیوں احسان اُٹھا لیا
ہم نے وسیلا پیار کا

سات سنگاری پدمنی
چھیل چھبیلا پیار کا

کیسا ہم نے رات دن
لنگر پیلا پیار کا

مُرغی ضِدّی حُسن کی
مُرغ ہٹیلا پیار کا

آنکھوں میں پھر رات دن
دھواں پھریلا پیار کا

توڑا ہے بے کار ہی
کچا ڈھیلا پیار کا

چھلکے سے پھسلے، ظفر
کھا کر کیلا پیار کا

☆

دیکھے نہیں پال کے کبوتر
ہوتے ہیں کمال کے کبوتر

اب ڈھونڈتے پھر رہے ہو بے سُود
رکھتے تھے سنبھال کے کبوتر

پکڑے تو اُڑا دیے اُسی وقت
اُس زہرہ جمال کے کبوتر

رُکتی ہوئی شام دم بخود ہے
نزدیک ہیں جال کے کبوتر

کُچھ آپ کے خواب کی منڈیریں
کُچھ میرے خیال کے کبوتر

مر کھپ گئے راستے ہی میں کیا
پیغام وصال کے کبوتر

اُترا بھی کر اُس کے آسماں سے
اے میرے سوال کے کبوتر

سب تیرے نشیب کے پرندے
یا میرے زوال کے کبوتر

کب سے، ظفر، اُس کی قید میں ہیں
دیکھو جو نکال کے کبوتر

☆

گل ہیں سیاہ پوش ، صبا سوگوار ہے
ہر باغ ، اور ، باغ نما سوگوار ہے

سرسبز وادیوں کا فسوں ہے شکستہ رنگ
شاداب جنگلوں کی ہوا سوگوار ہے

ماتم کناں الگ ہے یہ گردش زدہ زمیں
اور ، ساکت آسمان جدا سوگوار ہے

یادِ حسینؓ کوچہ بہ کوچہ ہے خیمہ زن
سارے گھروں میں ساری فضا سوگوار ہے

ویسا ہی شرمسار ہے آبِ فرات ابھی
جیسا یہ دشتِ کرب و بلا سوگوار ہے

بھرتی ہوئی دلوں میں وفا ہے لہو لہو
گرتی ہوئی لبوں سے دُعا سوگوار ہے

ہر انتظامِ خواب و خبر ہے اُداس اُداس
ہر اہتمامِ برگ و نوا سوگوار ہے

تنہا یہ لوگ ہی نہیں آہ و بکا میں گم
خلقت کے ساتھ خود بھی خدا سوگوار ہے

شیون ہے ایک شہر کے باہر بھی ، اے ظفر
دُور و دراز کوئی صدا سوگوار ہے

☆

کچھ نہیں ہے چرا و چوں صاحب
کہ یہ سب کیا ہے اور کیوں صاحب

اپنی کوتاہیاں جو ہیں اتنی
رحمتیں بھی تو ہیں فزوں صاحب

بہتری کی اُمید لائی یہاں
حال پہلے ہی تھا زبوں صاحب

کیا بدلتی سرشت پھر اپنی
آپ بھی تو ہیں جوں کے توں صاحب

سرد مہری کی ابتدا میں ہی
جم رہا ہے رگوں میں خوں صاحب

ہے معافی سے میری بات شروع
یعنی اب اور کیا کہوں صاحب

کاش میرے لیے بھی ہو موجود
ہے یہاں پر بہت سکوں صاحب

میری فردِ عمل نہیں ایسی
کہ اُسے پیش کر سکوں صاحب

سوجھتا کچھ نہیں ہے جانِ ظفر
اب کروں بھی تو کیا کروں صاحب

☆

ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے نام

دل سے اُٹھتا ہے صبح و شام دھواں
کوئی رہتا ہے اس مکان میں کیا
انجم رومانی

یہ بھلاوا سا اگر بار دگر شیشے کا ہے
اس دفعہ شیشے کے اندر سے گزر شیشے کا ہے

میں بھی چکنا چور ہو سکتا ہوں اس کے ساتھ ہی
مجھ پہ بھی ظاہر ہے یہ سارا سفر شیشے کا ہے

یوں تو پہلے بھی بہت حیراں رہا کرتا تھا میں
شاید اب کی بار یہ مجھ پر اثر شیشے کا ہے

سنگ سے پرہیز میں بھی یوں تو ہے کافی بچاؤ
اصل میں تو ہر گھڑی شیشے کو ڈر شیشے کا ہے

کب نظر آتے تھے پتے اور پرندے صاف صاف
اس قدر شفاف ہے گویا شجر شیشے کا ہے

ٹوٹ بھی سکتا ہے دیکھو گے اگر یوں بار بار
چاند جو نکلا ہوا ہے بام پر، شیشے کا ہے

احتیاط اپنی سی جتنی بھی روا رکھیں، مگر
کارگاہِ شوق میں سارا ضرر شیشے کا ہے

شاعری کام اتنا نازک ہے اگر سمجھے کوئی
یہ ہنر شیشے کا ہے، اور، سربسر شیشے کا ہے

دوسروں کی سمت پتھر پھینکتا ہوں جب، ظفر
بھول جاتا ہوں کہ میرا اپنا گھر شیشے کا ہے

☆

میں تو سمجھا تھا کہ خالی آسماں شیشے کا ہے
غور سے دیکھا تو یہ سارا جہاں شیشے کا ہے

کیا خبر کب کرچیاں رہ جائیں میرے چار سُو
سنگ زادہ ہوں، مگر، میرا مکاں شیشے کا ہے

ڈرتا رہتا ہوں کوئی مجھ سے کہیں ٹکرا نہ جائے
میں ہوں شیشے کا، مرا طرزِ بیاں شیشے کا ہے

سخت بھی ہوں، اور، بہت کمزور بھی ہوں ایک دم
ہوں تو سب لوہے کا، میرا درمیاں شیشے کا ہے

اُس کو چھونے سے بھی ڈرتا رہا ہوں میں بہت
ہے تو شیشے کا، مگر، پھر بھی کہاں شیشے کا ہے

زندہ ہیں اِک دوسرے سے بچ بچا کر ہی یہ لوگ
ورنہ تو جتنا بھی ہے، سب کچھ یہاں شیشے کا ہے

ٹوٹنے والا کوئی خواب ملاقات ایک دن
کچھ یہاں شیشے کا ہے، اور، کچھ وہاں شیشے کا ہے

اور تو کوئی کسی کے منہ نہیں آتا یہاں
جو نظر آتا ہے شیشے پر نشاں شیشے کا ہے

ایک وقت اُس پر چٹخنے کا بھی آتا ہے، ظفر
پہلے پہلے سنگ ہے جو، بعدازاں شیشے کا ہے

☆

کبھی خطا ، کسی لمحے سزا گزرتا ہوں
ابھی میں ایک ، ابھی دوسرا گزرتا ہوں

گزر بسر مری ہوتی ہے اب اسی ڈھب سے
گلی سے شام ، شجر سے ہوا گزرتا ہوں

گزر رہا ہے کوئی شور میرے چاروں طرف
یہاں سے میں بھی اک اپنی صدا گزرتا ہوں

ابھی مجھے بھی نہیں کوئی اس کا اندازہ
یہ ابتدا ہے کہ میں انتہا گزرتا ہوں

نشان چھوڑتا جاتا ہوں سطحِ دریا پہ
کہ آرپار عجب نقشِ پا گزرتا ہوں

یہ پھیر ہے مری آنکھوں کا یا کہ خود میرا
جو میں عقب میں بھی اک سامنا گزرتا ہوں

کسی کی دید ، کسی کی شنید میں ہوں کہیں
خلا پکارتا ہوں ، اور ، فضا گزرتا ہوں

سفر میں آپ بھی شامل ہوں میں اگر سمجھو
کہ دیکھنے میں تو برگ و نوا گزرتا ہوں

کچھ اب تو دھوپ دھڑکتا ہوں دشت و در میں ، ظفر
نہ جنگلوں میں کہیں راستا گزرتا ہوں

☆

اِس بہانے لے چلو یا اُس بہانے لے چلو
بجھتا جاتا ہوں ، کہیں مجھ کو گھمانے لے چلو

اس میں کچھ نقصان ہونے کا کوئی خدشہ نہیں
ایک دن بے شک یہی بات آزمانے لے چلو

رنگ ہوں تو مجھ سے روشن ہو یہ دیوارِ چمن
سنگ ہوں تو اپنے ہی آئینہ خانے لے چلو

بات کوئی مان کر تو دے نہیں سکتے ہو تم
یہ بھی کیا کم ہے ، مرا دل ہی دکھانے لے چلو

میں تو اِن سڑکوں پہ نکلا ہی نہیں ، مدت ہوئی
شہر کے منظر نئے ہوں یا پرانے ، لے چلو

جال سا پھیلا رکھا ہے میری خاطر تم نے کیا
دیکھنا ہیں یہ تمھارے تانے بانے ، لے چلو

دیکھ کر دونوں کو باہم ، کوئی شک تو کر سکے
جھوٹی موٹی کوئی تہمت ہی اٹھانے لے چلو

بیٹھنے اور لیٹنے میں کام آ سکتا ہوں میں
گھاس پر مجھ کو دری کر کے بچھانے لے چلو

ہر طرح کے کام کو تیار ہے اب تو ظفر
چاہے اب اس کو ہنسانے یا رلانے لے چلو

☆

ہوں گے فارغ شتاب دُنیا سے
لے کے جائیں گے خواب دُنیا سے

روشنی اب کہاں سے آئے گی
اُٹھ گئے آفتاب دُنیا سے

دل نے باندھی اُمید آبادی
اِسی خانہ خراب دُنیا سے

خیمۂ عافیت کی آخرکار
ہم نے باندھی طناب دُنیا سے

اپنا رُوئے سخن تھا تیری طرف
رہا اپنا خطاب دُنیا سے

جا کے اُترے گی حق تعالیٰ پہ
یہ ہماری کتاب دُنیا سے

فکر ہے عاقبت کی بھی لیکن
ہے ہمارا حساب دُنیا سے

حشر میں جو بھی وہ کریں گے سوال
آئے گا ہر جواب دُنیا سے

کہیں جنت میں مے ملے نہ، ظفر
لے کے جانا شراب دُنیا سے

☆

گئے آئے ہزار دُنیا میں
ہم سے ہیں بے شمار دُنیا میں

آئینہ دل کا صاف کیا رہتا
اِتنی گرد و غبار دُنیا میں

موت بھی ہم خرید لیں گے، اگر
مِل رہی ہو اُدھار دُنیا میں

ہم ہی دل کو لگام کیا دیتے
اِس قدر بے مُہار دُنیا میں

روئے ہم کھلکھلا کے جب روئے
اور، ہنسے زار زار دُنیا میں

خُوش رہے دُوسروں سے بڑھ کر ہم
ایسی ناسازگار دُنیا میں

ہم تھے پیدل، ہوا کے گھوڑے پہ
اِس صدا کی سوار دُنیا میں

دوستی کیا نبھا سکے ہوں گے
ہم بھی اِس یارمار دُنیا میں

ہم نے کھولی نہیں دُکاں ہی، ظفر
تھے بہُت کاروبار دُنیا میں

☆

ہے کوئی اختیار دُنیا پر
نہ ہمیں اعتبار دُنیا پر

اپنا دارومدار دل پر ہے
آپ کا انحصار دُنیا پر

جب جھڑا میرا آخری پتّا
آ چکی تھی بہار دُنیا پر

حملہ آور ہُوا خُدا خود بھی
اس نحیف و نزار دُنیا پر

جب کوئی ابر جھوم کر برسا
چھا رہا تھا غُبار دُنیا پر

ڈال رکھی تھی کوئی خود اُس نے
چادر انتظار دُنیا پر

سارا الزام دھر دیا کیسا
ہم نے پایانِ کار دُنیا پر

یُوں توقّع ہی باندھنا تھی غلط
ایسی ناپائیدار دُنیا پر

ہم پہ دُنیا ہُوئی سوار، ظفر
اور، ہم ہیں سوار دُنیا پر

-☆-

دکھائے تھے جو اُس نے خواب سارے
دبے مٹی کے نیچے داب سارے

جو الزامات ہو سکتے تھے قائم
اُٹھا کر لے گیا پنجاب سارے

پسینے سے لبالب ہیں یہ جھیلیں
لہو سے بھر گئے تالاب سارے

اسیری کی نئی سازش نہ ہو یہ
جو کھلتے جا رہے ہیں باب سارے

ہمی گستاخ نکلے سب سے بڑھ کر
ہمیں ہی یاد تھے آداب سارے

تنا ہے ایک تو کاندھا سراسر
کھنچے ہیں دُوسرا اعصاب سارے

لبوں سے مُڑ رہی باتوں کی بوچھار
لہو میں اُڑ رہے سُرخاب سارے

اکیلی ہے مری کاغذ کی یہ ناؤ
اکٹھا ہیں، مگر، گرداب سارے

سمجھتے ہیں ظفر قاری کو جاہل
لگاتے ہیں تبھی اعراب سارے

-☆-

سیانے پڑ گئے بیمار سارے
تو ہم بھی ہو گئے لاچار سارے

اِشارے کی ذرا سی دیر ہے اب
کہ بیٹھے ہیں یہاں تیار سارے

تُم اپنی سعی کر کے دیکھ لینا
وہی آ جائیں گے ہر بار سارے

تُمھی بتلاؤ ، پُوچھے گا یہاں کون
ہمارے لوگ تھے اُس پار سارے

لپیٹے جائیں گے آناً فاناً
جو رس گُلّے ہیں ٹھنڈے ٹھار سارے

یہ ہم سے مختلف ہوتے بھی کیوں کر
ہیں ایسے ہی ہمارے یار سارے

یہی جِتوائیں گے اب بھی الیکشن
یہ نمبردار ، تھانے دار سارے

ابھی جو کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں
کبھی روئیں گے دھاروں دھار سارے

ظفر ، پہلے ہی کافی تھے یہاں تو
کہاں کے ہیں یہ ناہنجار سارے

☆

بہُت بے سُر ہوئے سُر تال سارے
تو بھوکوں مر گئے قوّال سارے

دھری رہ جائے گی تدبیر تیری
ہم اُڑ جائیں گے لے کر جال سارے

وہ گُلشن ہو چُکا تاراج پُورا
وہ سبزے ہو گئے پامال سارے

ہمارے آپ کے آئیں گے آگے
ہمارے آپ کے اعمال سارے

یہاں کوّے اُتاریں نقل کِس کی
ہُوئے جب ہنس ہی بے چال سارے

چلے گی اب اِنھی لوگوں کی مرضی
اکٹھا ہو گئے دلّال سارے

ہُوئے کھچڑی تو پھر آئی سفیدی
کبھی کالے بھی تھے یہ بال سارے

یہی لگتا ہے جیسے رہ گئے ہیں
ہمارے ہی لیے جنجال سارے

ظفر ، تُو کی ہے خالی ہی تُخ تُخ
مُربعے ہیں یہ گھوڑی پال سارے

☆

نظر آنے لگے انجام سارے
بگڑتے جا رہے ہیں کام سارے

انگوٹھے پانو کے لگوا کے آخر
وہ لکھوا لے گئے اسنام سارے

پڑی ہیں بوتلیں مُنہ بند ، مستور
قطاروں میں دھرے ہیں جام سارے

بہت پختہ ہیں سب عادات اپنی
ڈراوے ہیں ابھی تک خام سارے

بہت مجبوریاں ، معذوریاں ہیں
اُٹھا سکتے نہیں اقدام سارے

نہائے دھوئے گھوڑے ہو گئے ہم
اُسی کے سر رہے الزام سارے

بغاوت کی ابھی باقی ہے خُو بُو
کبھی مانیں گے یہ احکام سارے

خُدا کی جانے کیا حکمت ہے اس میں
پہنچتے ہی نہیں پیغام سارے

سزا ہم نے ، ظفر ، جو تھی ، بھگت لی
مگر ، واپس کیے انعام سارے

-☆-

یہاں پر تھے جو گاڑی بان سارے
سراسر ہو گئے چالان سارے

کبھی تشدید سے جو تھی مُعرّیٰ
اُسے لکھنے لگے پٹھان سارے

ملک قادر حسن پکڑا گیا تو
اکٹھا ہو گئے اعوان سارے

ہماری آپ کی سُنتا ہے اب کون
ملے بیٹھے ہیں بے ایمان سارے

مزہ آئے گا پنچایت کا پُورا
دھرے جائیں گے جب پردھان سارے

مُجھے یُوں چھانٹنے اور چھیلنے پر
لگا رکھے ہیں کیوں ترکھان سارے

ہوئیں زندوں سے پُورم پُور گلیاں
بھرے مُردوں سے قبرستان سارے

اُدھر ڈوبی ہوئی فصلیں ہیں یکسر
اِدھر سُوکھے پڑے ہیں دھان سارے

سمگلنگ کے سوا بھی اہلِ حج نے
ظفر ، پُورے کیے ارکان سارے

-☆-

کپڑے تو کافی ہیں بدن پر ، کٹا پھٹا جیسا بھی ہوں
کسی کام تو آ سکتا ہوں ، بچا کھچا جیسا بھی ہوں

بہت بُرا ہوں ، لیکن ، تھوڑا اچھا بھی ہوں میں
ہونا تھا ایسا ہی مجھ کو ، ملا جُلا جیسا بھی ہوں

اب تو خزاں نے کیا ہے جیسے میرے اندر سے آغاز
پتہ پتہ جھڑ جاؤں گا ، ہرا بھرا جیسا بھی ہوں

ایک نظر اُس کو ہے دیکھنے پر موقوف مرا ہونا
پل میں خالی ہو جاتا ہے ، بھرا پُرا جیسا بھی ہوں

سارے اور طرح کے ہیں، اور، ہوں گے، مجھ سے اچھے ہیں
محفل میں موجود تو ہوں میں ، لیا دیا جیسا بھی ہوں

مٹی میں مل جانا چاہتا ہوں کچھ وقت سے پہلے ہی
اور ، اسی حالت میں خوش ہوں ، گرا پڑا جیسا بھی ہوں

کوئی نہ کوئی کمی بیشی ہوتی ہی رہتی ہے مجھ میں
یوں ہی اندازے نہ لگائیں ، نپا تُلا جیسا بھی ہوں

عمر کے ستر سال تھپیڑے بھی تو کھائے ہیں میں نے
مُڑا تُڑا چلتا بھی ہوں ، اور ، مَلا دَلا جیسا بھی ہوں

ٹھہرے پانیوں میں اِک لرزش تو پیدا کر جاؤں ، ظفر
اُلا بُلا جو بھی ہے مجھ میں ، کہا سُنا جیسا بھی ہوں

☆

کوئی ہے جو برگ و ثمر تو دکھائیں
کدھر ہیں ، وہ شاخ و شجر تو دکھائیں

بہت جس کے چرچے ہیں دشت و دمن میں
وہ ہنگامۂ زور و زر تو دکھائیں

نظر بھی نظر آ ہی جائے گی اک دن
وہ کچھ دیر صَرفِ نظر تو دکھائیں

مرض ہی کوئی لادوا ہے ، وگرنہ
دوائیں کچھ اپنا اثر تو دکھائیں

لگایا ہے جو میرے عرضِ ہوس پر
اگر تو دکھائیں ، مگر تو دکھائیں

ہمیں آج کے اپنے اخبارِ دل میں
لگی کوئی تازہ خبر تو دکھائیں

نکالی ہے آخر کسی اور نے بھی
کچھ اس طرح کی رہگزر تو دکھائیں

جو کہتے ہیں چکی بہت پیستا ہوں
یہ چکی ذرا پیس کر تو دکھائیں

ظفر ، یہ تو ہیں عیب ہی عیب سارے
جو ہے پاس کوئی ہنر تو دکھائیں

☆

یکسو بھی لگ رہا ہوں بکھرنے کے باوجود
پُوری طرح مرا نہیں مرنے کے باوجود

اِک دھوپ سی تنی ہُوئی بادل کے آرپار
اِک پیاس ہے رُکی ہُوئی جھرنے کے باوجود

اُس کو بھی یاد کرنے کی فرصت نہ تھی مُجھے
مصرُوف تھا میں کُچھ بھی نہ کرنے کے باوجود

پہلا بھی دُوسرا ہی کنارہ ہو جس طرح
حالت وُہی ہے پار اُترنے کے باوجود

اپنی طرف ہی رُخ تھا وہاں واردات کا
الزام اُس کے نام پہ دھرنے کے باوجود

حیراں ہُوں مُجھ میں اِتنی یہ ہمت کہاں سے آئی
کر ہی گیا ہُوں کام جو ڈرنے کے باوجود

ہونا پڑا نہ ہوتے ہوئے بھی مُجھے یہاں
کُچھ یاد رہ گیا ہُوں بسرنے کے باوجود

جیسا بھی یہ سفر ہو، ذرا غور کیجیے
کیسا رواں دواں ہُوں ٹھہرنے کے باوجود

نِکلا نہیں ہے کوئی نتیجہ یہاں، ظفر
کرنے کے باوجود نہ بھرنے کے باوجود

☆

نی غور پنچر جیسی لگتی ہے
خال خال بھی اکثر جیسی لگتی ہے

پردے اُٹھتے جاتے ہیں ایک اِک کرکے
اندر والی باہر جیسی لگتی ہے

ہاتھ پھیر کر دیکھو تو رفتہ رفتہ
ناہموار برابر جیسی لگتی ہے

آسمان موجود نہیں ہے، اور، زمیں
نیچے ہے، اور، اُوپر جیسی لگتی ہے

کھلتی ہُوئی کلی جیسی آئی تھی وہ
نکلے ہُوئے پھوسر جیسی لگتی ہے

میک اپ اِتنی محنت سے ہے کیا ہُوا
اُس کی شکل ٹماٹر جیسی لگتی ہے

لہُو چُوسنے آجاتی ہے روز بروز
ٹھیک مُجھے وہ مچھر جیسی لگتی ہے

روتے روتے جب ہنسنے لگتی ہے وہ
ملے جلے سے منظر جیسی لگتی ہے

دُم سی کوئی نکل آتی ہے کہیں، ظفر
اور، یہ صُورت بندر جیسی لگتی ہے

☆

دن پر سوچ سُلگتی ہے یا کبھی رات کے بارے میں
کوئی بات نکل آتی ہے کائنات کے بارے میں

ایک دُوسرے سے کب سارے سیّارے ٹکراتے ہیں
پُر اُمید بہت ہُوں ایسے حادثات کے بارے میں

کُچھ سہتا ہُوں گزرے ہُوئے زمانے کے لمحوں کی سزا
کُچھ کہتا ہُوں ناممکن سے ممکنات کے بارے میں

سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے اپنے ہی جھگڑے نہیں کم
اور کئی ذاتوں کی اُلجھن ایک ذات کے بارے میں

حیرت کا ایک اپنا حُسن بھی ہے لرزا دینے والا
کوئی پریشانی نہیں اُس کے نباتات کے بارے میں

غلط سلط سب کے اپنے اپنے اندازے ہیں، ورنہ
کُچھ بھی نہیں کہا جا سکتا کسی بات کے بارے میں

جب تک وہ پہلی ترجیح رہے گا، سب خیریت ہے
موسم کو ہے تمام آگہی پھول پات کے بارے میں

قطرے کی پہچان ہی دریا میں گم ہو جانا ہے بھی
کیسا جوش وخروش ہے اُس کی مُلاقات کے بارے میں

دل میں کوئی چیز چمکتی بجھتی رہتی ہے جو، ظفر
فکرمند بھی رہتا ہُوں میں اسی وحات کے بارے میں

☆

پہنچی ہُوئی دُعا کی طرح مُستجاب ہو
خالی حسد میں جی نہ جلا، کامیاب ہو

پھر پُوچھنا کدھر ہے رُخِ منزلِ مُراد
ان راستوں کی دُھول میں کُچھ دن خراب ہو

بیگانہ وار جھیل سے ہو کر گزر نہ جا
ممکن ہے کوئی پھول ابھی زیرِ آب ہو

پھر بھی گزر بسر نہیں ہوتی کسی طرح
دل میں جو ایک طرح کا ہی اضطراب ہو

کوئی اُدھیڑبُن تو رہے بھی کسی قدر
کیا فائدہ ہے بات اگر بے نقاب ہو

ناقابلِ یقیں سہی، امکان یہ بھی ہے
ایک اور بھی حباب کے اندر حباب ہو

کوئی بھی اور کارگزاری فضول ہے
کافی ہے یہ کہ شاخِ نظر پر گلاب ہو

کس کو خبر نمودِ سحر کی فضاؤں میں
ایک اور آفتاب پسِ آفتاب ہو

خوابوں کا سلسلہ ہو بہت دُور تک، ظفر
حق تو یہ ہے کہ خواب کے باہر بھی خواب ہو

☆

جیسی اب ہے ، ایسی حالت میں نہیں رہ سکتا
میں ہمیشہ تو محبت میں نہیں رہ سکتا

کھل کے رو بھی سکوں اور ہنس بھی سکوں جی بھر کے
ابھی اتنی بھی فراغت میں نہیں رہ سکتا

دل سے باہر نکل آنا مری مجبوری ہے
میں تو اس شورِ قیامت میں نہیں رہ سکتا

کوچ کر جائیں جہاں سے مرے دشمن ، اے دوست
میں وہاں بھی کسی صورت میں نہیں رہ سکتا

کوئی خطرہ ہے مجھے اور طرح کا اے دوست
میں جو اب تیری حفاظت میں نہیں رہ سکتا

چاہیے ہے مجھے کچھ اور ہی ماحول ، کہ میں
اور اب اپنی رفاقت میں نہیں رہ سکتا

کچھ بھی میں کرتا کراتا تو نہیں ہوں ، لیکن
باوجود اس کے ، فراغت میں نہیں رہ سکتا

شک مجھے یوں تو خیانت کا نہیں ہے کوئی
میں کسی کی بھی امانت میں نہیں رہ سکتا

ویسے رہنے کو تو خوش باش ہی رہتا ہوں ، ظفر
سچ جو پوچھیں تو حقیقت میں نہیں رہ سکتا

☆

تازہ و صاف ، مہکتی ہمہ سُو آب و ہوا
وہیں رہیے کہ ہو جس شہر کی تُو آب و ہوا

سانس لینا ترا کچھ یوں بھی ضروری ہے بہت
کہ اسی چیز سے پاتی ہے نمو آب و ہوا

دن نکلتا ہے تو آ لیتی ہے تپتی ہوئی دھوپ
اور ، یوں میرا سکھاتی ہے لہو آب و ہوا

باغ میں پھول چمک اٹھتے ہیں چہرہ چہرہ
عکس جب ڈالتی ہے آئنہ رُو آب و ہوا

تالیاں پیٹتے رہتے ہیں برابر پتّے
کیا بہم ہوتے ہیں آ کر لب جُو آب و ہوا

تیز رفتار ہے ، اور ، یاد دلاتی ہے مجھے
تیرے پیرایے دمادم ، تری خُو آب و ہوا

پھاڑتی ہے کبھی خود آن کے پھولوں کے لباس
اور ، پھر آپ ہی کرتی ہے رفو آب و ہوا

کوئی دم چین نہیں ایک جگہ پر اس کو
ناپتی رہتی ہے کیا قریہ و کُو آب و ہوا

رُوٹھ کر جانے کہاں جاتی ہے یہ ، جانِ ظفر
چھوڑ جاتی ہے جو میرے لیے تُو آب و ہوا

☆

مدعا زور سے منوا بھی کہاں سکتا ہوں
اُسے معلوم ہے مَیں جا بھی کہاں سکتا ہوں

میرے بھی پاؤں میں زنجیرِ زمانہ ہے کوئی
تُو بُلائے بھی تو مَیں آ بھی کہاں سکتا ہوں

میرے ہاتھوں میں اگر ہو بھی محبت کا علَم
میں سرِعام اِسے لہرا بھی کہاں سکتا ہوں

مجھے اوّل تو میسّر ہی نہیں جامۂ خواب
اور، پھر میں اُسے پہنا بھی کہاں سکتا ہوں

تازہ رکھتی ہے مجھے تیرے تغافل کی ہوا
مَیں جو چاہوں بھی تو مُرجھا بھی کہاں سکتا ہوں

بندشیں ایک سے اک بڑھ کے ہیں مجھ پر دن رات
رونے دیتے نہیں، اور، گا بھی کہاں سکتا ہوں

شرم آتی تو بہُت ہے، مگر اب تُم ہی کہو
ایسے حالات میں شرما بھی کہاں سکتا ہوں

نیند آتی ہی نہیں، اور، اگر آ بھی جائے
تاب اُس خواب کی مَیں لا بھی کہاں سکتا ہوں

مَیں تو خود رہتا ہوں غیروں کی طرح اس میں، ظفر
اپنے گھر میں اُسے ٹھہرا بھی کہاں سکتا ہوں

-☆-

ابھی آنکھوں میں بسایا بھی نہیں تھا ہم نے
کھو دیا ہے جسے پایا بھی نہیں تھا ہم نے

دل کا احوال سُنایا تو نہ ہو گا جا کر
اس قدر اُس سے چھپایا بھی نہیں تھا ہم نے

کسی رُسوائی نے زحمت نہ بھی کی ہو گی ابھی
کوئی الزام اُٹھایا بھی نہیں تھا ہم نے

اُس سے کیا چاہتے ہیں اتنے بڑے شہر میں ہم
اُس نے پُوچھا تو بتایا بھی نہیں تھا ہم نے

ڈالے رکھا بھی محبت نے بہُت مُشکل میں
بوجھ یہ سر سے گرایا بھی نہیں تھا ہم نے

ٹھیک ہے یاد بھی رکھا نہیں اُس کو، لیکن
یہ بھی سچ ہے کہ بُھلایا بھی نہیں تھا ہم نے

دل کے سجدوں کی الگ بات ہے، ورنہ اب تک
سر وہاں جا کے جُھکایا بھی نہیں تھا ہم نے

نیا منظر کوئی بنتا بھی تو کیسے، کہ ابھی
خواب میں خواب ملایا بھی نہیں تھا ہم نے

ہم سے جا بیٹھا ہے کیوں اور بھی وہ دور، ظفر
پاس اپنے تو بُلایا بھی نہیں تھا ہم نے

-☆-

یک طرفہ عاشقی کا مزہ بھی اسی میں ہے
رہتا ہوں دور دور، سزا بھی اسی میں ہے

میں اس کی زندگی سے ذرا ہٹ کے ہی رہا
معلوم تھا کہ اس کی رضا بھی اسی میں ہے

سچ ہے کہ جھوٹ، خود ہی کبھی جان جائے گا
خاموش ہوں کہ میری صدا بھی اسی میں ہے

ہوں کب سے ہونے اور نہ ہونے کے درمیاں
گمنام ہوں کہ میرا پتا بھی اسی میں ہے

اس شہر نے پناہ بھی دی ہے مجھے، مگر
مجھ پر ہر ایک ظلم ہوا بھی اسی میں ہے

دیوار ہوں کھنچی ہوئی میں اپنے چار سُو
دروازہ خوابِ حُسن کا وا بھی اسی میں ہے

ویسے تو ظرف اپنا کشادہ ہے بے حساب
سچ پوچھیے تو تنگیِ جا بھی اسی میں ہے

کرتے ہیں سب سپاس گزاری تجھی سے ہم
کچھ ہے اگر تو اپنا گِلہ بھی اسی میں ہے

شاید کھلے نہ اس پہ، ظفر، میرے دل کا حال
لگتا ہے میرے دکھ کی دوا بھی اسی میں ہے

☆

کس طرح کے ہیں وہ باغات، نہیں کہہ سکتے
ایسے ملنے کو ملاقات نہیں کہہ سکتے

اتنے لوگوں میں تو بس دیکھ ہی سکتے ہیں تمھیں
تم سے کیا کیا ہیں شکایات، نہیں کہہ سکتے

ہو چکی اس میں تو اب آپ کی آمیزش بھی
آپ صِرف اس کو مری ذات نہیں کہہ سکتے

اپنی تشخیص بھی کرنے کے نہیں ہیں قابل
کس مرض کی ہیں علامات، نہیں کہہ سکتے

جبر ہے ایک طرح کا اُدھر آنا جانا
اس کو پابندیِ اوقات نہیں کہہ سکتے

دور رہنے کی دلیری تو دکھا بیٹھے ہم
پیش آئے ہیں جو حالات، نہیں کہہ سکتے

جس میں گر جائے نہ گھر، اور نہ ڈوبیں ہم خود
ایسی برسات کو برسات نہیں کہہ سکتے

کیسی آزادیِ اظہارِ محبت ہے یہاں
آپ سے کوئی اگر بات نہیں کہہ سکتے

ابر جتنا بھی ہے، جیسا بھی دھندلکا ہے، ظفر
دن تو پھر دن ہے، اسے رات نہیں کہہ سکتے

☆

وہیں اک شہر بھی سنسان ہوتا جا رہا ہے
جہاں اک باغ سا ویران ہوتا جا رہا ہے

نہیں معلوم اب تک آپ کی ہے کیفیت کیا
ہمارا تو بہت نقصان ہوتا جا رہا ہے

حدیں ہی ختم ہوتی جا رہی ہیں زندگی کی
کہ جو در تھا وُہی دالان ہوتا جا رہا ہے

ہماری بےنوائی ختم ہونے کو ہے شاید
ہماری موت کا سامان ہوتا جا رہا ہے

محبت مشکلوں میں پڑتی جاتی ہے سراسر
ہمارا کام کچھ آسان ہوتا جا رہا ہے

اب اُس کو دل کے اندر سے نکالیں کس طرح سے
جو اپنے آپ ہی مہمان ہوتا جا رہا ہے

دکھائی جا رہی ہے دوسروں سے بھی مروّت
ہمارے سر پہ بھی احسان ہوتا جا رہا ہے

خبر ملتی ہے میرے حال کی جتنی بھی اُس کو
بظاہر اور بھی انجان ہوتا جا رہا ہے

ترنّم کی ظفر سے یُوں تو فرمائش نہ کرتے
مگر، کم بخت خوش الحان ہوتا جا رہا ہے

☆

سارے سربستہ اشارات سمجھنے کے لیے
کوئی آئے گا مری بات سمجھنے کے لیے

دن تو اُلجھاو میں رکھتا ہے بہت، جانِ عزیز
صرف ہوتی ہے یہاں رات سمجھنے کے لیے

دیکھنے ہی کے لیے یُوں تو ہے پیکر اُس کا
ہیں، مگر، بعض مقامات سمجھنے کے لیے

دُور رہنا تو ہے تمہید قریب آنے کی
ہیں محبت کے نشانات سمجھنے کے لیے

داو پیچ اُس سے بہت سیکھنا ہیں مَیں نے ابھی
کبھی آتا ہے اگر ہاتھ سمجھنے کے لیے

واقعہ یہ ہے کہ رہتا ہُوں سمجھداروں میں
ورنہ کیا تھی مری اوقات سمجھنے کے لیے

سامنے بیٹھ کے اُس نکتہ رسِ خواب کے مَیں
کچھ اُٹھاؤں گا سوالات سمجھنے کے لیے

دیکھنا ہو گا ذرا شہر سے باہر جا کر
آپ کو شہر کے حالات سمجھنے کے لیے

کچھ فضا چاہیے مہتاب کی گردش کو، ظفر
اک ہوا حُسن کے باغات سمجھنے کے لیے

☆

جائیں کے اُس بزم میں پُوری ہی تیاری سے ہم
یُوں ہی بچ سکتے ہیں شاید روز کی خواری سے ہم

دُور رہنا چاہتے بھی ہیں ستمگر سے ، مگر
روز آ جاتے ہیں اُس کے پاس لاچاری سے ہم

دن کے بھی دوران اکثر دیکھتے ہیں خواب سے
کام لیتے ہیں تو بس اتنا ہی بیداری سے ہم

اک طرف لگ ہی گئے ہیں ، وہ غلط ہو یا صحیح
رُک نہیں سکتے ہیں اب اُس کی طرفداری سے ہم

آج کُچھ عُجلت سی ہے ، اصرار بھی ہے اِس لیے
ورنہ پہلے تو بھٹک جاتے ہی تھے باری سے ہم

خُود بھی ہوتا جا رہا ہے اُس طرف اپنا جُھکاو
کُچھ دنوں سے تنگ بھی ہیں اپنی بیزاری سے ہم

کُچھ ہمیں گاہک مُیسّر بھی نہیں بازار میں
بھاگتے ہیں آپ بھی کُچھ گرم بازاری سے ہم

دیکھتے ہیں ہر طرف کیا کیا ندیدوں کی طرح
تازہ تازہ آج کل اُٹھے ہیں بیماری سے ہم

مال سارا ہی بہُت ناقص نکل آیا ، ظفرؔ
باز آ سکتے اگر ایسی خریداری سے ہم

☆

صبر کر رہا ہوں ، انتظار کر رہا ہوں میں
عشق ، اور ، وہ بھی یادگار کر رہا ہوں میں

شہر کے تمام جور و جبر کے جواب میں
ایک عاجزی ہی اختیار کر رہا ہوں میں

ابھی مرے حساب میں نہیں ہیں ظلم آپ کے
ابھی تو مہربانیاں شُمار کر رہا ہوں میں

کہ مُجھ کو اُس کے راستوں میں بیٹھنا نصیب ہو
سو، کب سے اپنی خاک کو غُبار کر رہا ہوں میں

ہے ساتھ ساتھ ایک راہزن کا اِنتظار بھی
یہ دشتِ خواب خواب جس کو پار کر رہا ہوں میں

یہ عُمر بھر کی عاجزی نہ میرے کام آ سکی
تو سرکشی بھی اک ذرا شِعار کر رہا ہوں میں

کُچھ اُس کے پانو چُومنے کی دُھن بھی ہے لگی ہُوئی
نہیں کہ اُس کو سر پہ ہی سوار کر رہا ہوں میں

زمیں پہ آ رہا ہوں آسماں کی سمت سے ابھی
کہ مُدّتوں سے اپنا ہی اُتار کر رہا ہوں میں

خریدتا نہیں کتاب نقد پر کوئی ، ظفرؔ
تو گاہکوں کے ساتھ اب اُدھار کر رہا ہوں میں

☆

وہ دائیں بائیں تو ہے ، سامنے نہیں ہوتا
کبھی جو ہو بھی تو میرے لیے نہیں ہوتا

وہ پاس آتا ہے اک فاصلے پہ رہتے ہوئے
اور ، ایک حد سے زیادہ پرے نہیں ہوتا

زیاں اُٹھانے کا ہے کوئی تو سبب ، ورنہ
عزیز فائدہ اپنا کسے نہیں ہوتا

اُمڈتے آتے ہیں ہر سمت سے چراغ اور پھول
جو رات ہوتا ہے کیوں دن چڑھے نہیں ہوتا

کسے بتائیں کہ مدت سے اپنے پیشِ نظر
ہے وہ سفر جو کسی راستے نہیں ہوتا

گزر تو جاتا ہے تیزی سے وقت ، اور ، احساس
مجھے تو ہوتا ہے ، شاید اُسے نہیں ہوتا

گمان ایک ہی رہتا ہے میرے چاروں طرف
یقین اور کوئی بھی مجھے نہیں ہوتا

وہ کام جو نظر آ بھی رہا تھا ناممکن
میں اُس کی سعی تو کرتا ، بھلے نہیں ہوتا

تغافل اُس کا توجہ سے کم نہیں ہے ، ظفر
کہ یہ سلوک بھی ہر ایک سے نہیں ہوتا

☆

اپنی ہی جستجو کے جنگل میں کھو گئے ہم
جیسا وہ چاہتا تھا ویسے تو ہو گئے ہم

راتوں کو جاگنا تھا جس کے بغیر ہم نے
نیند آ گئی تو اُس کے گھر جا کے سو گئے ہم

ہم خُود تو بے نوا تھے روزِ ازل سے ، ورنہ
سامان دُوسروں کا کاندھوں پہ ڈھو گئے ہم

بیٹھے تو تھے یہاں پر اپنی خوشی سے ہم بھی
یہ آپ کا اشارہ کافی تھا ، لو گئے ہم

آب و ہوا ہے کیسی ، مٹی کی خصلتیں کیا
کچھ بھی نہ دیکھا بھالا ، اور ، بیج بو گئے ہم

اک لالہ زارِ امکاں دیتا دکھائی کیا کیا
جاتا کوئی اُدھر بھی ، جس سمت کو گئے ہم

شاید کبھی یہ دُنیا دریافت کر ہی پائے
اس رشتۂ سخن میں جو شے پرو گئے ہم

طومار ایک چھوڑا ناشاعری کا پیچھے
آگے کسی زمانے کو آپ تو گئے ہم

بے مدعا نہیں تھا آنا ظفر ہمارا
پیدا ہوئے تو اپنی قسمت کو رو گئے ہم

☆

وہ ایک طرح سے اقرار کرنے آیا تھا
جو اتنی دور سے انکار کرنے آیا تھا

خوشی جو خواب میں بھی میری دسترس سے تھی دور
مجھے اسی کا سزاوار کرنے آیا تھا

یہ صاف لگتا ہے، جیسی کہ اُس کی آنکھیں تھیں
وہ اصل میں مجھے بیمار کرنے آیا تھا

اگر تھا، اُس کو مری حیثیت کا اندازہ
تو کیوں وہ اپنا خریدار کرنے آیا تھا

یہ زندگی کہ جو آساں نہیں تھی پہلے بھی
اسے کچھ اور بھی دشوار کرنے آیا تھا

اگرچہ ایک ہی سُست الوجود تھا، لیکن
وہ کام کوئی لگاتار کرنے آیا تھا

مرے تو بس میں کوئی چیز تھی نہ پہلے بھی
وہ مجھ کو اور بھی لاچار کرنے آیا تھا

وہ ایک ابرِ گراں بار تھا، مگر، اُس دن
ذرا فضا کو ہموار کرنے آیا تھا

عداوتوں میں وہاں دھر لیا گیا ہوں، ظفر
جہاں کے لوگوں سے میں پیار کرنے آیا تھا

☆



وہ کہ تھا ہی ایک مدت سے مرا جانا ہُوا
میرا اپنا آپ بھی ہے خوب پہچانا ہُوا

دل کی آبادی میں وہ اگلی سی رونق ہی نہیں
مدتوں کے بعد اپنا اُس طرف جانا ہُوا

ہم نکل جایا کریں گے آپ ہی باہر کہیں
آپ نے جب بھی کبھی اس شہر میں آنا ہُوا

دل میں جو کچھ ڈھونڈتے ہو مل نہیں سکتا کبھی
میں بتاتا ہوں، یہ صحرا ہے مرا چھانا ہُوا

روز کا معمول تھا جو، وہ ہُوا خواب و خیال
اور، جو ممکن نہ تھا وہ کام روزانہ ہُوا

گوشہ اک چھوٹا سا ہم کو بھی یہاں درکار ہے
کچھ تو ہم نے بھی کہیں رونا ہُوا، گانا ہُوا

فرق دونوں میں زیادہ کچھ نہیں باقی ہے اب
دل کو بہلانا ہُوا ہم نے کہ بہکانا ہُوا

کیا کھلے اُس پر مرے اندر کی سچائی یہاں
بیچ میں یہ جھوٹ کا پردہ جو ہے تانا ہُوا

ہم نے چوری اور یاری چھوڑ رکھی تھی، ظفر
چوری چوری اُس کے ساتھ اپنا جو یارانہ ہُوا

☆

پڑے گا اُس کو بے مفہوم ہونا
یہ نامعلوم کا معلوم ہونا

نہیں موجود بھی جو دشت و در میں
زمانے بھر میں اُس کی دھوم ہونا

شگوں نے رُخ کیا میری ہی جانب
مجھے منہگا پڑا معصوم ہونا

کئی لوگوں کو خوش آیا نہیں ہے
ہمارا لازم و ملزوم ہونا

فلک پہ لکھ دیا جانا مرا رزق
ستاروں میں مرا مقسوم ہونا

انہی باتوں پہ ہنسنا بھی ہے ممکن
ہے جن پر اس قدر مغموم ہونا

رہے گا آسماں کی آگہی میں
مرا اس خاک سے معدوم ہونا

مجھے زندہ رکھے گا اور کچھ دیر
کسی شے سے مرا محروم ہونا

ظفر، اک بات ہے جو چاہتی ہے
مرے ہاتھوں کبھی منظوم ہونا

☆

میری طبع کو کیا رواں کر دیا
مجھے اور بھی بے نشاں کر دیا

فنا کر دیا میں نے کوئی ہنر
کسی عیب کو جاوداں کر دیا

جو ہُوا غلط سی جگہ پر اُسے
کہاں کام تھا، اور، کہاں کر دیا

تو کہنے کو باقی رہے گا نہ کچھ
بھی کچھ اگر یُوں بیاں کر دیا

کسی در پہ رکھا فسانے کا خواب
دریچہ کوئی داستاں کر دیا

ہمیں تو غرض کام کرنے سے تھی
یہاں کر دیا، یا وہاں کر دیا

بدل کر شب و روز شیون کا شور
کوئی اور طرزِ فغاں کر دیا

گئے تھے نکل درمیاں سے جو لوگ
دوبارہ اُنھیں درمیاں کر دیا

اُتارا فلک سے ستارہ کوئی
زمیں کو، ظفر، آسماں کر دیا

☆

کیا خواب تھا، اور، اُس کا ستاروں میں چمکنا
آدھوں میں لرزنا کبھی ساروں میں چمکنا

چلنا تو اُلجھنا سا وہ ہر موج سفر سے
رُکنا تو اُنہی راہگذاروں میں چمکنا

ہر رات جھلکنا وہ کسی گردِ سیہ سے
اور، صبح کسی دُھند کے دھاروں میں چمکنا

جب اور اندھیروں میں نظر کچھ بھی نہ آئے
کیسا ہے وہاں اُس کے اشاروں میں چمکنا

سب کی یہاں اپنی بھی چمک ہوگی کم و بیش
آساں نہیں اس طور ہزاروں میں چمکنا

جلنا سا چراغوں کا وہ دیوارِ ہوا پر
اور، دُور سے اُن کا وہ قطاروں میں چمکنا

اک برف سی جمتی ہوئی کہسار فلک پر
اک آگ سی، اور، اُس کا چناروں میں چمکنا

مُجھ کو مری آنکھیں ہی بہت ہیں سَحر و شام
اُس کے لیے کافی ہے نظاروں میں چمکنا

میں کیسے نکل آؤں، ظفر، اپنی حدوں سے
پانی کا تو ہے کام کناروں میں چمکنا

☆

ایسی ہی روشنی ہے جیسوں میں لا رہا ہوں
لوگوں کی چیز تھی یہ، لوگوں میں لا رہا ہوں

اچھا تھا یا بُرا تھا، یہ کام ہو چکا اب
غیروں کا مال سارا اپنوں میں لا رہا ہوں

جو اس سے پہلے سب کے سر سے گُزر رہا تھا
وہ انقلاب اب کے سینوں میں لا رہا ہوں

ہیں آپ کیوں پریشاں اس سعیِ ناتواں سے
یہ اُن کا دردِ سر ہے جیسوں میں لا رہا ہوں

اس دیگ میں پکا ہے جیسا بھی دال دلیا
ساروں کا اس پہ حق ہے، ساروں میں لا رہا ہوں

باہر نکل کے دیکھو الفاظ کا یہ مجمع
سڑکوں پہ چل رہا ہے، گلیوں میں لا رہا ہوں

منظور شعر میرا تیار ہو رہا ہے
لکھتا ہوں پانیوں پر، لہروں میں لا رہا ہوں

تصویر کر رہا ہوں آنکھوں میں خواب سارے
باتوں کی ساری خوشبو سانسوں میں لا رہا ہوں

کچھ فرق تو پڑے گا اس سے، ظفر، کہ اب میں
باہر کی یہ ہوائیں کمروں میں لا رہا ہوں

☆

دل طلبگار نہیں رہ گیا ہے
کُچھ سروکار نہیں رہ گیا ہے

جہاں بکتا تھا سخن کا سودا
اب وہ بازار نہیں رہ گیا ہے

رونقِ در کا تو ہے پُوچھنا کیا
رنگِ دیوار نہیں رہ گیا ہے

دل کے سب زخم ہیں بھرتے جاتے
گھر ہوادار نہیں رہ گیا ہے

شعر ہوتے ہیں اب ایسے ویسے
کوئی معیار نہیں رہ گیا ہے

اب لڑائی کا بھلا کیا مطلب
اب تو وہ پیار نہیں رہ گیا ہے

تندرستی تھی مصیبت ، اب تو
وہ بھی آزار نہیں رہ گیا ہے

دل میں آتا ہے خیال اُس کا ، مگر
یُوں لگاتار نہیں رہ گیا ہے

پُوچھتا کوئی نہیں ، جب سے ظفر
قابلِ کار نہیں رہ گیا ہے

-☆-

آئے گا رُخ پہ رنگ نہ تاثیر گھاس میں
یُوں ہی اگر رہے گی یہ کُٹیا کپاس میں

ہونٹوں سے ہونٹ تر جو کیے تو پتا چلا
اِک بُھوک بھی چُھپی ہُوئی تھی میری پیاس میں

پاس آؤ ، اور ، ٹٹول کے دیکھوں تو ہو خبر
کُچھ ہے بھی یا نہیں ہے تُمھارے لباس میں

نکلی تو پھر بھی ٹھیک نہ اندازہ ہو سکا
کیا چیز تھی بھلی ہُوئی دل کی بھڑاس میں

دیکھو اگر تو خُود نظر آ جائے گا تُمھیں
کُچھ اور لوگ بھی ہیں کہیں آس پاس میں

ایسی نہیں کہ ہاتھ لگا کر ہی دیکھ لیں
جو شے تھی دستیاب یہاں سو پچاس میں

ہم نے دراصل غور سے دیکھا ہی کب اُسے
تھے رنگ اور بھی کئی تصویرِ یاس میں

کُچھ اور زاویے بھی ہیں اُس رشکِ ناز کے
ایک اور ذائقہ بھی ہے اُس کی مٹھاس میں

دریا کو اس کا آپ بھی اندازہ ہے ، ظفر
زندہ ہیں لوگ ڈوب کے مرنے کی آس میں

-☆-

جس قدر اپنے کیے پر یہ ندامت ہے مجھے
اُتنی ہی آپؐ سے اُمیدِ شفاعت ہے مجھے

آپ تو جانتے ہیں، آپ سے کیا عرض کروں
سالہا سال سے جس چیز کی حسرت ہے مجھے

مَیں تو اِس کو بھی غنیمت ہی سمجھتا ہوں یہاں
جو کہیں بیٹھ کے رو لینے کی فرصت ہے مجھے

کھل کے اظہار کروں اپنی پشیمانی کا
یہ بھی کیا کم ہے جو حاصل یہ سہولت ہے مجھے

ہر ضرورت مری پُوری ہے بظاہر، لیکن
دور بیٹھا ہوں تو ہر شے کی ضرورت ہے مجھے

یہ بھی ہے میرے لیے عین سعادت جو یہاں
آپ کے چاہنے والوں سے عقیدت ہے مجھے

آپ تو چشمۂ اوصاف و مُروّت ہیں تمام
اپنے ہی آپ سے ہے جو بھی شکایت ہے مجھے

یہ سفر وہ ہے کہ سو منزلیں اِس پر قُرباں
آپ کی راہ کا جو رنج ہے، راحت ہے مجھے

کُچھ مجھے دردِ جدائی بھی زیادہ ہے، ظفر
اور، کُچھ حالِ دُہائی کی بھی عادت ہے مجھے

☆

کوئی مشکلیں ہیں نہ آسانیاں ہیں
مرے چار سُو صرف حیرانیاں ہیں

اندھیرے کبھی ایسے دیکھے نہ بھالے
عجب ہی طرح کی یہ تابانیاں ہیں

سفینہ کبھی ڈوبنا ہے اِنہی میں
جو اندر ہی اندر یہ طغیانیاں ہیں

ہماری جو مجبوریاں ہیں پُرانی
وُہی آپ کی بھی تو من مانیاں ہیں

وُہی ہیں خبرداریاں اُن کی اپنی
وُہی میری حالت سے انجانیاں ہیں

نہیں ہے کوئی صبر کا پھل میسّر
نہ آلو بُخارے نہ خُوبانیاں ہیں

ہمیشہ ہی اِس دل نے رہنا ہے بُھوکا
اگر دو گھروں کی یہ مہمانیاں ہیں

نکلتا نہیں کام کا شعر کوئی
طبیعت میں کیسی یہ جولانیاں ہیں

بس اِک شرمساری لکھی ہے لہو میں
وگرنہ، ظفر، کیا سخن دانیاں ہیں

☆

یہ نفرت کس طرح کی ہے، محبت کون سی ہے
ہمارے جھوٹ اور سچ میں حقیقت کون سی ہے

ہماری گفتگو سے کچھ بھی اندازہ نہ ہو گا
کہ اس میں شکر ہے کیا کیا، شکایت کون سی ہے

کوئی بتلاؤ، جن کی جستجو میں ہے زمانہ
یہ اعزازات ہیں جو، ان میں عزت کون سی ہے

خصائل سے ہمارے آپ ہی اندازہ کر لو
کہ ان میں چھوڑ سکنے والی عادت کون سی ہے

تمھیں جو آئنے کے سامنے رکھتے ہیں دن رات
عجائب ہیں تمھارے، اس میں حیرت کون سی ہے

ہم آمیز ہے سب کچھ، بتا سکتے نہیں ہم
کہ ہے مصروفیت کیا اور فرصت کون سی ہے

سرِ تسلیم خم رکھنا ہماری خو ہے، ورنہ
خوشامد کس طرح کی، اور اطاعت کون سی ہے

اگر کر ہی نہیں سکتے ہیں کچھ اس سے زیادہ
یہ لاچاری تو ہے لیکن قناعت کون سی ہے

ظفر، لٹکے ہوئے ہیں درمیاں میں ہی کہیں ہم
کہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں، یہ حالت کون سی ہے

☆

عشق یہ کیا ہے کہ زحمت نہیں کرنی آتی
دشت میں رہ کے بھی وحشت نہیں کرنی آتی

کہیں سیکھا نہیں کچھ اُس نے بھی دلجوئی کا فن
اور، مجھ کو بھی محبت نہیں کرنی آتی

کہہ دیا ہم نے جو کہنا تھا، وہی کافی ہے
اور اب ہم کو وضاحت نہیں کرنی آتی

عاقبت کی کوئی پروا ہی نہیں ہے کہ تمھیں
ہم فقیروں کی بھی خدمت نہیں کرنی آتی

محترم اور معزز ہیں بہت شہر میں آپ
ایک بس آپ کو عزت نہیں کرنی آتی

آپ کے ساتھ ہمارا ہے تعلق ہی کچھ اور
ورنہ کیا ہم کو سیاست نہیں کرنی آتی

ہم نے یہ کام کسی کل پہ اُٹھا رکھا ہے
یہ غلط ہے کہ شرارت نہیں کرنی آتی

کام کیا خاک نکالو گے کہ تم کو تو، ظفر
رُوٹھنا آتا ہے، منت نہیں کرنی آتی

نام تو آپ کا لکھا ہے وکیلوں میں، ظفر
آپ کو صرف وکالت نہیں کرنی آتی

☆

وہ جو کاندھے پہ اُس کے پھیلا تھا
خالی خالی سا ، میلا میلا تھا

ہونٹ بھی سانولے سے تھے اُس کے
ذائقہ بھی ذرا کسیلا تھا

آخری سال تھے ہمارے تو
پیار اُس کا ہی پہلا پہلا تھا

پانو پیچھے کو زور کرتے تھے
ہاتھ جب اُس کے آگے پھیلا تھا

سخت بیزار تھا دماغ وہی
دل ہی تھوڑا زیادہ بہلا تھا

دوڑتا تھا مری رگوں میں لہو
صحن میں جب وہ آ کے ٹہلا تھا

نکر اُس کا پکڑ لیا جو وہیں
یہ بھی نہلے پہ ایک دہلا تھا

میاں مجنوں تھے ، اور ، سرِ صحرا
دُور تک انتظارِ لیلیٰ تھا

جنس تبدیل ہو چکی تھی ، ظفر
اب وہ شہلا نہیں تھی ، شہلا تھا

☆

بظاہر پا رہی یا کھو رہی ہے
محبت اپنا ملبا ڈھو رہی ہے

رقیبوں کے لیے وہ پھول چُن کر
ہمارے حق میں کانٹے بو رہی ہے

بباطن دُشمنی کی شکل تھی اک
یہاں طرزِ محبت جو رہی ہے

نہیں ممکن تھا کچھ کرنا کرانا
چلو ، دل میں تمنا تو رہی ہے

ابھی بادل تو کوسوں دُور ہو گا
مگر ، چھت پیشگی ہی چو رہی ہے

لیے آنکھوں میں خواب اچھے دنوں کے
یہ قسمت جاگتے میں سو رہی ہے

گلہ گو ہم سے بھی ہے فرصتِ شوق
تمھاری جان کو بھی رو رہی ہے

جھگڑنے ، اور ، اُلجھنے تو لگے ہو
مُبارک ہو ، محبت ہو رہی ہے

ظفر کو جس قدر دانا بھی کہہ لو
مگر ، آخر تو ڈنگر ڈھور ہی ہے

☆

آئی ، آ کر رہی جو ٹل کر بھی
ہم نے گرنا ہی تھا سنبھل کر بھی

بات کو تازہ کر دیا کچھ تو
بات کا زاویہ بدل کر بھی

طلب اُس کو کیا بھی ہے ہم نے
گئے ہیں اُس کے پاس چل کر بھی

خواب ایک اور میں ہوئے داخل
خیمۂ خواب سے نکل کر بھی

کب سے لٹکا ہوا ہے بیچ میں وصل
مسئلہ ہے تو اس کو حل کر بھی

ابھی ویسی ہے دھوپ کی شدت
دن وہیں پر کھڑا ہے ڈھل کر بھی

سخنِ سادہ کا چلن وہی تھا
چشمۂ رنگ سا اُبل کر بھی

تجھ سے باغی بھی ہو گئے آخر
تیرے سانچے میں لوگ ڈھل کر بھی

آسماں تک پہنچ سکے نہ ، ظفر
ہم نے دیکھا اُچھل کر بھی

☆

سب سے چھوٹی کا مزہ
یا پھر موٹی کا مزہ

ڈھیلی ہو تو اور بھی
آئے لنگوٹی کا مزہ

نیچے سے ہی بھلا ہے
سب کو چوٹی کا مزہ

دال میں بھی موجود ہے
تکّے بوٹی کا مزہ

ہار جیت سے بڑھ کے ہے
چلتی گوٹی کا مزہ

یاد رہے گا عمر بھر
کال کلوٹی کا مزہ

جو مل جائے وقت پر
کھری نہ کھوٹی کا مزہ

آپ ملنگ چکھائیں گے
بھنگ نہ گھوٹی کا مزہ

وصل میں اُس کے تھا ، ظفر
ہنسی روٹی کا مزہ

☆

موسم ہی وہ رہے نہیں اٹھائے آرزو
بے رونقی ہے ، اور ، یہ دُنیائے آرزو

اُس دن سے مچھلیاں ہی کہیں کوچ کر گئیں
جب سے اُتار پہ ہوا دریائے آرزو

فریاد اور فغاں رہی بے فائدہ یُونہی
تھی ہائے آرزو ، کبھی اے وائے آرزو

ویرانیاں تھیں بے سروسامانیوں کے ساتھ
دیکھا گیا نہ ہم سے تماشائے آرزو

ہوتا کہیں وہ یُوسفِ ثانی جو منتظر
پھر سے جواں ہُوئی تھی زلیخائے آرزو

گھمسان تھا پڑا ہُوا ایسا کہ رات دن
کُچھ آرزوئیں اور تھیں بالائے آرزو

دِل کی زیادہ چھان پھٹک بھی نہیں بجا
کُچھ اور ہی نکل نہ پڑے جائے آرزو

کھولے نیا ہی شام کا دروازہ اُس کی یاد
اور ، ایک باغ سا کوئی مہکائے آرزو

حسرت ہی رہ گئی کہ ہوا ہو وہی ، ظفر
پتے کی طرح پھر کبھی لرزائے آرزو

☆

نام نہ ہوتا کیسے روشن
دیے تھے اُوپر نیچے روشن

چکا چوند سی اندر اندر
باہر خواب تُمھارے روشن

یہی بہُت ہے ، کر جاتے ہو
آنکھیں آتے جاتے روشن

رہتے ہیں کِس کے ہونے سے
در ، دالان ، دریچے روشن

خُوشبُو تھی اور تابانی بھی
پھُول تھے آگے پیچھے روشن

رات سفر پہ نکلے جب وہ
ہو جاتے ہیں رستے روشن

رُکے ہُوئے موسم مٹیالے
ہو سکتے ہیں کتنے روشن

سُورج گرہن لگا تھا ایسا
دن بھر رہے ستارے روشن

رنگ ، ظفر ، پہلے تو نہیں تھے
اِتنے صاف اور اِتنے روشن

☆

ہُوئی جو شام تو منظر کئی بدلنے لگے
ہوا ٹھہرنے لگی ، اور ، درخت چلنے لگے

اُفق سے دُور کہیں بادلوں میں آگ لگی
دلوں میں راز ، دریچوں میں رنگ جلنے لگے

اِک آبشار ہُوا کوہِ قاف سے آغاز
رُکے ہُوئے تھے جو چشمے سبھی اُبلنے لگے

پلٹنے والے پرندے سیاہ ، سُرخ ، سفید
خُود آ کے رات کی تاریکیوں میں ڈھلنے لگے

دِل اپنے ساتھ جو رکھتے نہیں ہیں ، کیا معلوم
کہاں ترسنے لگے ، اور کہاں مچلنے لگے

عجب تو یہ ہے کہ نقصان جو ہُوا ہی نہیں
کبھی کبھی تو ہم اُس پر بھی ہاتھ ملنے لگے

سماعتوں سے بہُت دُور تھی وہ گُونج ابھی
کہ اہلِ شہر کے پہلے ہی دِل دہلنے لگے

سمجھتے ہیں کسی طوفان کی خبر اِس کو
ہجومِ گریہ کناروں سے جب اُچھلنے لگے

جہاں سے کاٹ دیا تھا شجر محبت کا
ظفرؔ ، وہیں سے نئے شاخچے نکلنے لگے

-☆-

کیا خبر یاد رہا کون ، کسے بھول گئے
تُو ہمیں بھول گیا ، ہم بھی تجھے بھول گئے

دِل کی دیوار پہ تصویر لگی تھی جس کی
شکل اُس کی بھی اگر بھول گئے ، بھول گئے

نیکیاں تُو نے ہماری بھی کہاں یاد رکھیں
اور ، ہم بھی کبھی احسان ترے بھول گئے

کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ تماشا ہے کیا
سامنے آئے پُرانے تو نئے بھول گئے

وقت سفّاک ہے ، سب نقش مٹا دیتا ہے
چار دن آنکھ سے اوجھل جو رہے ، بھول گئے

اپنی توفیق سے بڑھ کر ہی کیا ہے ، یعنی
ہم جسے بھول نہ سکتے تھے ، اُسے بھول گئے

اب جو آسائشِ دُنیا ہے مُیسّر ہم کو
یاد وہ بھی نہ رہا جس کے لیے بھول گئے

آ بسے دشت میں ہم ، ریت سے یاری گانٹھی
شہر کے لوگ بھلے تھے کہ بُرے ، بھول گئے

شاید اِک عُمر بھی ہوتی ہے محبت کی ، ظفرؔ
دِل میں رہتا تھا شب و روز جسے بھول گئے

-☆-

سفر باقی ہے کتنا ، اور ، دھارا کس طرف ہے
سفینہ کون سی جانب ، ستارہ کس طرف ہے

بکھرے رہتے ہو اب تو کجکلاہوں میں ہی اکثر
سُناؤ ، آج کل قبلہ تُمھارا کس طرف ہے

مُسافر ہیں ، گھڑی بھر کو تُمھارے ہاں رُکے ہیں
کِدھر بیٹھیں ، ہمارا تان پارہ کس طرف ہے

چلو ، جیسا بھی تھا کشتی سے باہر کود پڑنا
کسی سے پُوچھ تو لیتے کنارا کس طرف ہے

یہاں تو بے سروسامانیاں ہیں باہر اندر
جو بندوبست کر رکھا تھا سارا ، کس طرف ہے

محبت کا علاقہ بانٹ تو رکھا ہے ، لیکن
تُمھارا کس طرف ہے ، اور ، ہمارا کس طرف ہے

شکایت اُس کی بھی بے جا نہیں لگتی ، مگر مَیں
کِدھر موجُود تھا ، اُس نے پکارا کس طرف ہے

پذیرائی میں اُس کی شک نہیں ہے کوئی ، لیکن
جُلوسِ ناز کس جانب ہے ، نعرہ کس طرف ہے

ظفر ، تُم نے تو چلتے وقت اتنا بھی نہ سوچا
کہ جاتے ہو کدھر کو ، اور ، اشارہ کس طرف ہے

☆

ابتدا سب جانتے ہیں ، انتہا معلُوم ہے
یہ الگ معلُوم ہے ، اور ، وہ جُدا معلُوم ہے

جانتے ہیں یہ ہوس لے جائے گی ہم کو کہاں
چل رہی ہے جس طرف کی یہ ہوا معلُوم ہے

عشق ہم کو رفتہ رفتہ خُود ہی راس آنے لگا
اس مرض کی ورنہ ہم کو ہر دوا معلُوم ہے

دن بتائے تو نہیں جانے کے ، خاطر جمع رکھ
ورنہ ہم کو بھی ترے گھر کا پتا معلُوم ہے

یہ بھی سچ پُوچھو تو ہم نے ہے کہیں چکھا ہُوا
یعنی ہم کو موت کا بھی ذائقہ معلُوم ہے

واپسی کی ہی وہاں سے کوئی گُنجائش نہیں
ورنہ جانے کا تو سب کو راستا معلُوم ہے

ہم بھی اُس کی حیلہ سازی سے نہیں ناآشنا
اور ، اُس کو بھی ہمارا مُدعا معلُوم ہے

بس یہی معلُوم ہے اِک خواب ہیں مَیں اور تُو
اور ، جو اِس کے علاوہ ہے وہ لا معلُوم ہے

آخرِ کار ، اس نتیجے پر ہی پہنچے ہیں ، ظفر
جو بھی کچھ معلُوم ہے سمجھو کہ نامعلُوم ہے

☆

جو سرہی سر ہیں یہاں، بے خطا اضافے ہیں
کمی نہیں ہے یہاں، جابجا اضافے ہیں

مرا وجود ہی کافی ہے کائنات میں جب
تو فالتو ہیں یہ ارض و سما، اضافے ہیں

لہو میں دھوپ اُترتی ہے روز شام کے بعد
یہ موسموں سے الگ، اور، جُدا اضافے ہیں

اضافہ کرتی ہیں لہروں میں اور بھی لہریں
یہ ایک بار نہیں، بارہا اضافے ہیں

دنوں میں شہر کی صُورت بدلتی جاتی ہے
کہیں نئے تو کہیں آشنا اضافے ہیں

طلسم خانۂ حیرت ہی کم نہ تھا ہم کو
یہ خاک و خشت، یہ آب و ہوا اضافے ہیں

بیانِ شوق ہے مطلوب و منتہائے سخن
ہے اصل شے یہی، اس کے سوا اضافے ہیں

ابھی ہیں اور بہت لطفِ خاص کے پہلو
ابھی تو اور کئی خوشنما اضافے ہیں

الاسٹک ہے بجائے ازار بند، ظفر
سہولیاتِ محبت میں کیا اضافے ہیں

☆

ہمیشہ کام کسی اور کا سنبھالتا ہوں
جو آسماں کی طرف یہ زمیں اُچھالتا ہوں

طلوعِ صبح پہ مجھ کو یقین ہے پُورا
جبھی تو روز کا ہر کام کل پہ ٹالتا ہوں

غرض اگرچہ ہے عرضِ نیاز سے ہی مجھے
میں ساتھ ہی کئی کام اور بھی نکالتا ہوں

اسی لیے مری صحت بھی ٹھیک رہتی ہے
کبھی کبھی جو محبت کا روگ پالتا ہوں

چڑھا سکا ہوں کچھ اپنا ہی رنگ میں اس پر
نہ اپنے آپ کو سانچے میں اُس کے ڈھالتا ہوں

کہیں سے، اور، کبھی پانی بھی آ ہی نکلے گا
اسی اُمید پہ دریا میں ناؤ ڈالتا ہوں

ہوئی ہے عُمر کہ مِلتا نہیں سُراغ اپنا
میں چاروں سمت بہت دیکھتا ہوں، بھالتا ہوں

ازل سے میرا مقدر ہے جب سیاہ سفر
تو پھر یہ کس کے لیے راستے اُجالتا ہوں

میں اپنے آپ سے ناراض ہوں کئی دن سے
پڑا ہوا ہوں، ظفر، بولتا نہ چالتا ہوں

☆

یہاں سنتا نہیں کوئی صدا ہو جانے والے کو
پکڑنے آ دھمکتے ہیں رہا ہو جانے والے کو

کوئی پروا نہیں کرتا ہے موجود و میسّر کی
مگر، اک عمر روتے ہیں جدا ہو جانے والے کو

نئے جھونکے نئی ہلچل مچا رکھتے ہیں روزانہ
بھلا دیتے ہیں پتّے بھی ہوا ہو جانے والے کو

اگر ہیں لا دوا دونوں ہی، مرنا اور مکر جانا
تو ہم بھی کیا کہیں اس بے وفا ہو جانے والے کو

ٹھکانا ایک ہو کوئی تو پائیں بھی سراغ اپنا
کہاں ڈھونڈیں گے جا کر جا بجا ہو جانے والے کو

غنیمت ہے جہاں تک، اور، جتنا دیکھتے رہیے
قبا کے ساتھ ہی رنگِ قبا ہو جانے والے کو

سفر سے واپسی پر کس طرح پہچان سکتے تھے
ہم اپنے بعد اتنا خوشنما ہو جانے والے کو

پڑا ہے لفظ لبریزِ معانی ان کہا رہ کر
بہت پاؤ گے بے مطلب ادا ہو جانے والے کو

ظفرؔ، اچھا نہیں یوں پیرہن تبدیل کر لینا
خزاں بھی یاد رکھے گی ہرا ہو جانے والے کو

☆

ویسا نہیں ممکن ہے تو ایسا ہی مزہ لیں
یہ ہجر مقدّر ہے تو اس کا ہی مزہ لیں

پھیلایئے چادر کو یہاں دیکھ کے ہی پانو
جتنے کی اجازت ہے سو اُتنا ہی مزہ لیں

کڑوا ہو کہ میٹھا، نہیں کوئی غرض اس سے
جیسا ہے میسّر یہاں، ویسا ہی مزہ لیں

ہر بات کا بہتر بھی نکل سکتا ہے مطلب
صحرا بھی ہے درپیش تو دریا ہی مزہ لیں

یہ ذائقہ مانا کہ پسند اتنا نہیں تھا
وہ وقت بھی آئے گا کہ اچھا ہی مزہ لیں

بولے گا بھی مُنھ سے کبھی، فی الحال تو کچھ دن
اُلٹا بھی اشارہ ہو تو سیدھا ہی مزہ لیں

ہو کر پھر اُسی دامِ تمنا میں گرفتار
اس ترکِ محبت کا دوبارہ ہی مزہ لیں

یاد اُس کو بہ اندازِ دگر کرنا پڑے گا
وہ سب سے الگ ہے تو علیحدہ ہی مزہ لیں

اس شہر میں ہونا ہی بہت ہے، ظفرؔ، اُس کو
یہ جی ہے کہ بھرتا نہیں، کتنا ہی مزہ لیں

☆

بولی بول گیا
پھکڑ تول گیا

لہرایا وہ بھی
میں بھی ڈول گیا

زہر بھی لایا وہ
رس بھی گھول گیا

پہلے نکلا فائر
پیچھے خول گیا

قیمت بہت تھی
میں انمول گیا

جاتے جاتے بھی
جیب ٹٹول گیا

دل دیوار کے بیچ
کھڑکی کھول گیا

پیچھے رہ گیا پول
آگے ڈھول گیا

تھا ہشیار ظفر
ٹال مٹول گیا

-☆-

واہمے سب دماغ سے نکلے
بارش آئی تو باغ سے نکلے

راستے ، رتجگے ، سراب ، سفر
سب اُسی کے سُراغ سے نکلے

مے نہیں ، زہر ہی برآمد ہو
کوئی تو شے ایاغ سے نکلے

کیا خبر ، اس قدر اندھیرے میں
روشنی دل کے داغ سے نکلے

اُس کو بھی کام یاد آئے کئی
ہم بھی وہم فراغ سے نکلے

منتظر ہوں کہیں مری خاطر
کوئی تو باغ و راغ سے نکلے

رُک گئی ہے دلِ سیہ میں ہوس
حرص کیا ذہنِ زاغ سے نکلے

شور الفاظ کا بپا ہے بہت
بات کچھ تو بلاغ سے نکلے

بُجھنے والا ہوں کوئی دم میں ، ظفر
اب دھواں ہی چراغ سے نکلے

-☆-

گفتگو ہے سب رعایا، خامشی سردار ہے
اور، خاموشی میں بھی کوئی کوئی سردار ہے

کوئی بھی اہلِ سخن میں دوسرے سے کم نہیں
کیا قبیلہ ہے جہاں ہر آدمی سردار ہے

کچھ اندھیرے، اور، اُجالے کا پتا چلتا نہیں
روشنی کے دائیں بائیں تیرگی سردار ہے

اور کچھ ملنے برتنے سے پتا چل جائے گا
دوستی سردار ہے یا دشمنی سردار ہے

گھیر تو رکھا ہے سرداروں نے اُس کو بیش و کم
کچھ اُسے پروا ہے کیا، وہ آپ بھی سردار ہے

ہے بظاہر زندگی کی حکمرانی ہر طرف
مستقل تو موت ہے، یہ عارضی سردار ہے

خواب کی کھیتی میں دل کا کام ہے ہر طرح کا
ہے کبھی خود ہی مزارع، اور، کبھی سردار ہے

کل کلاں کیا غدر مچتا ہے، کسی کو کیا خبر
آج تو ہر سمت اُس کی دلکشی سردار ہے

بچھوؤں کے شہر کا احوال مت پوچھو، ظفر
جس کی دُم پر پانو رکھتا ہوں وہی سردار ہے

☆

کسی اندرونی سہارے پہ تھا
ابھی خواب اپنے کنارے پہ تھا

کچھ ایسے ہی تھے روز و شب، اور، کچھ
تمھارا اثر بھی ہمارے پہ تھا

یہیں تھا کہیں اس دفعہ وہ غبار
سو، نقشے میں تھا یا نظارے میں تھا

وہ مضمون پھیلا بہت شہر میں
وہ موسم بہت دیر سارے میں تھا

نتیجہ نکلنا ہی تھا کچھ نہ کچھ
کہ سارا ہی زور استخارے پہ تھا

ہماری تو ہر سعی ناکام تھی
سبھی انحصار اب تمھارے پہ تھا

فلک تھا کوئی اور زیرِ فلک
ستارہ سا اور اِک ستارے پہ تھا

اُسے ہی یہ عادت نہیں پڑ سکی
مرا تو مدار اب دوبارے پہ تھا

منافع دیا جس نے شام و سحر
وہی کاروبار اب خسارے پہ تھا

بھنور ہی مرا منتظر تھا کہ مَیں
سوار اپنے ہی تیز دھارے پہ تھا

نتیجہ مُلاقات کا منحصر
شکایات کے گوشوارے پہ تھا

ہمارا بھی مقروض تھا بال بال
تُمھارا بھی گزران اُدھارے پہ تھا

نکلواتے اُس میں سے تختے تو آپ
تنا سا ہمارا جو آرے پہ تھا

نئی چھینٹ ہے اپنی شلوار پر
نہ وہ داغ اُس کے غرارے پہ تھا

کہاں جا کے پہنچا ہے، اب، کیا خبر
سفر اپنے خس کا شرارے پہ تھا

گدھے نے اُٹھائی ہُوئی تھی زمیں
مرا بوجھ بھی اُس بچارے پہ تھا

کبھی آن کر دیکھ لیتے تو آج
وبال اور قسمت کے مارے پہ تھا

کوئی بات ہے جو بگاڑے پہ ہے
کوئی کام تھا جو سنوارے پہ تھا

وہ دریا تھا، اور، دیکھتے دیکھتے
کسی طرح سے پار اُتارے پہ تھا

یہ کیوں ہے کہ سب کو یہاں اعتراض
ہمارے تُمھارے گُزارے پہ تھا

پروں میں پگھلنے لگی پیاس جب
پرندہ کسی آب پارے پہ تھا

کوئی دن تو یہ شہسوارِ ہوس
اکیلا ہی بھاری ہزارے پہ تھا

حریفوں سے ماتھا لگایا فضول
گھمنڈ اس قدر بھائی چارے پہ تھا

عجب دانتے تھے رس بھرے اُس کے ہونٹ
غضب رنگ آلو بخارے پہ تھا

یہ وہ کھیل تھا، اپنا ردِّ عمل
نہ جیتے پہ تھا، اور، نہ ہارے پہ تھا

کچومر معانی کا نکلا ہے خُوب
کہ سارا ہی بوجھ استعارے پہ تھا

ظفرؔ، خُوش ہُوا جو مُجھے دیکھ کر
رُکا مَیں اُسی کے اشارے پہ تھا

☆

توڑتا ہوں، کہیں بناتا ہوں
آسماں سے زمیں بناتا ہوں

مہک اٹھتی ہے بے دلی کیا کیا
یاس کو یاسمیں بناتا ہوں

سانپ تو پالتا ہوں جانے کب
میں ابھی آستیں بناتا ہوں

کبھی خود کو بھی دیکھ پاؤں کبھی
ایسی اک دوربیں بناتا ہوں

موت اور زیست ہیں مری صنعت
یہ کھلونے یہیں بناتا ہوں

ایک دوزخ بنا چکا ہوں، اب
اپنی خلدِ بریں بناتا ہوں

پہلے تشکیل دیتا ہوں خود کو
اور کچھ بعد ازیں بناتا ہوں

کبھی دل ہی بنا نہیں پایا
کبھی دنیا و دیں بناتا ہوں

صبح کو نرگسیں بناتے ہوئے
شام کو شبنمیں بناتا ہوں

اک ستارے کو توڑ کر اس سے
سات ماہِ مُبیں بناتا ہوں

خواب دیکھا تھا من و سلویٰ کا
اور، نانِ جویں بناتا ہوں

رمزِ چون و چناں سے ہٹ کر میں
علتِ آں و ایں بناتا ہوں

کوئی کنکر ہے، کاٹ کر جس کو
ایک دیوارِ چیں بناتا ہوں

جا نکلتا ہوں خود کسی جانب
جب اُسے ہم نشیں بناتا ہوں

خوشنما کی بگاڑتا ہوں شکل
بدنما کو حسیں بناتا ہوں

پہلے کرتا ہوں زلزلے تیار
پھر مکان و مکیں بناتا ہوں

شہر کرتا ہوں میں جہاں مسمار
پھر نیا بھی وہیں بناتا ہوں

آخر اک عمر کی تگ و دو سے
بوسۂ اولیں بناتا ہوں

نیند کو حملیں بناتے ہُوئے
خواب کو مرمریں بناتا ہُوں

ظلمتِ زمہریر کے اندر
آہ کو آتشیں بناتا ہُوں

سانس لیتا ہُوں، اور، پھر اُس کو
شعلۂ واپسیں بناتا ہُوں

موجبِ موسمِ خزاں ہے جسے
کیا بہار آفریں بناتا ہُوں

چور ہیں میرے گھر کے رکھوالے
ڈاکوؤں کو امیں بناتا ہُوں

اک سراپا نیاز ہے وہ پری
مَیں جسے نازنیں بناتا ہُوں

ہے مرا اعتقاد ہی ایسا
ہر گُماں کو یقیں بناتا ہُوں

ساتویں آسمان پر ہے، جسے
شاہ رگ سے قریں بناتا ہُوں

آپ بنتے ہیں شور و شعر، ظفرؔ
مَیں یہ چیزیں نہیں بناتا ہُوں

-☆-

ہیں کس طرح کے بام و در تو دکھاؤ
کسی دن ہمیں اپنا گھر تو دکھاؤ

کرامات سی جو دکھاتے ہو سب کو
ذرا ہم بھی دیکھیں، اِدھر تو دکھاؤ

غنیمت سہی تھوڑا تھوڑا دکھانا
عجائب یہی سربسر تو دکھاؤ

دکھاتے نہیں ہو اگر باغ سارا
چلو، مختصر مختصر تو دکھاؤ

طلسمات کی ایک جھلکی جو تُم نے
دکھائی تھی، بارِ دگر تو دکھاؤ

اندھیرا ہے، چاکِ گریباں سے اپنے
نمودار ہوتی سَحَر تو دکھاؤ

یہ کیا روز وعدے پہ رکھا ہُوا ہے
دکھانا ہی کچھ ہے اگر تو دکھاؤ

ہمیں مل کے بھی ہو وہی، اور، ویسے
جو پہنچا ہے کوئی ضرر تو دکھاؤ

ظفرؔ کو جہاں ڈُوبنا ہے کسی دن
اُسے زُلف کا وہ بھنور تو دکھاؤ

-☆-

وہ میرے دل کے جو اندر نہیں دکھائی دیا
کہ آئنہ تھا مکدر ، نہیں دکھائی دیا

شکایت ایک ہی اُس نورِ چشم سے ہے کہ وہ
دیا دکھائی تو اکثر نہیں دکھائی دیا

جھلک سی ایک دکھا کر وہ کیوں ہُوا غائب
یہی کہ مجھ کو برابر نہیں دکھائی دیا

مرے خیال کے اندر تو تھا وہ جلوہ فگن
مرے خیال کے باہر نہیں دکھائی دیا

مَیں جی اُٹھا جو نظر آ گیا رُخِ روشن
مَیں مر گیا جو وہ دم بھر نہیں دکھائی دیا

مَیں ایک عمر رہا دربدر ، سفر بہ سفر
کہ ایک عمر مجھے گھر نہیں دکھائی دیا

تُمھارے ساتھ جو دیکھا تھا مل کے آخری بار
تُمھارے بعد وہ منظر نہیں دکھائی دیا

کھنگال ڈالی ہیں دُنیا جہان کی راتیں
مگر ، وہ ماہِ منوّر نہیں دکھائی دیا

جو ایک بار دکھایا تھا اُس پری نے ، ظفر
مجھے وہ خواب مکرّر نہیں دکھائی دیا

-☆-

محبت سوچیے تو سلسلہ تنہائی والا ہے
اور ، اِس کے ساتھ ہی کچھ کام یہ رُسوائی والا ہے

لگایا عشق میں اک جھوٹ کا پیوند بھی ہم نے
وگرنہ دیکھیے تو لفظ یہ سچّائی والا ہے

سمجھتے ہوں گے ہم اپنی طرف سے پیش رفت اس کو
وگرنہ اصل میں تو ماجرا پسپائی والا ہے

سمجھتے تھے کہ آساں ہے بُھلا دینا اُسے ، لیکن
چڑھائی سے بھی مشکل کام یہ اُترائی والا ہے

جو اب تک چاہتا ہے اُوپر اُوپر سے ہی وہ ہم کو
تو اِس میں سوچیے ، نکتہ ذرا گہرائی والا ہے

ضرورت پڑ گئی ہے کیا ہماری آپ کو ، یا پھر
بہانہ یہ بھی کوئی انجمن آرائی والا ہے

نکالا چاہتے ہیں جو وہاں خاموش رہ کر ہم
وُہی سارے کا سارا کام تو گویائی والا ہے

پھسلتے کیوں نہ ہم آخر ، وہاں تو ڈھنگ ہی سارا
کہیں چکنائی والا ہے ، کہیں گولائی والا ہے

ملاقاتیں ، ظفر ، اپنے بھی وارے میں نہیں اب کے
یہاں درپیش سب کو مسئلہ مہنگائی والا ہے

-☆-

حقیقت میں ہماری آپ کی یکجائی والا ہے
دسمبر میں بھی یہ موسم اگر جولائی والا ہے

پسینے چھوٹتے ہیں، دم بدم سانسیں اکھڑتی ہیں
تماشا گھر کے باہر تو وہی پُروائی والا ہے

یہ اتنی سرد مہری آ گئی ہے کیوں طبیعت میں
مزاج اُس کا جو آخر اس قدر گرمائی والا ہے

حسیں اک دوسرے سے بڑھ کے ہوں گے شہر میں، لیکن
یہاں جھگڑا تو سارا آپ کی یکتائی والا ہے

یہ ہم جو ہل چلانا چاہتے ہیں اُن زمینوں میں
تو یہ پیشہ ہمارا سربسر آبائی والا ہے

کوئی دیکھے نہ دیکھے، مست ہے یہ اپنے ہونے میں
کہ داغِ دل نمونہ لالۂ صحرائی والا ہے

مہکتی ہے ہمارے گھر بھی جس کی روشنی شب بھر
محبت چاند ہے، اور، آپ کی انگنائی والا ہے

بجا ہے دستِ شفقت آپ کا یہ سر پہ لوگوں کے
مگر، احسان یہ پانی کے اُوپر کائی والا ہے

ظفر، اپنے تئیں اس شاعری کو جو بھی تم سمجھو
مگر، انداز تو یہ قافیہ پیمائی والا ہے

☆

بہت محفوظ ہوں، گردِ سفر میں آ گیا ہوں
مجھے لگتا ہے جیسے اپنے گھر میں آ گیا ہوں

اثر اپنا بھی کوئی مجھ پہ ہونا چاہیے تھا
اُسی سے دُور ہوں جس کے اثر میں آ گیا ہوں

گزر جاتا ہوں اُس کے سامنے سے ایک دو بار
سمجھتا ہوں کہ میں اس کی نظر میں آ گیا ہوں

کسی لمحے کنارِ صبح پر رکتا ہوں دم بھر
کبھی میں آتے آتے رات بھر میں آ گیا ہوں

مرے باہر نکلنے کا بھی ہے امکان اب تو
اگر میں حلقۂ زنجیرِ در میں آ گیا ہوں

جو ہو سکتا ہے بندوبست کچھ میرا تو کر لو
ہوا کا زہر ہوں، شاخ و شجر میں آ گیا ہوں

ملی ہے دل کے اندر ہی پناہ اس بار مجھ کو
بالآخر اس مکانِ مختصر میں آ گیا ہوں

یہاں سے دُور بھی اتنا نہیں دل کا کنارا
بڑی کوشش سے اپنی چشمِ تر میں آ گیا ہوں

نکلنا ہے، ظفر، بے آبرو ہو کر یہاں سے
ابھی خوش ہوں کہ میں اہلِ ہنر میں آ گیا ہوں

☆

گرنے کی ندامت کہ سنبھلنے کا نتیجہ
نکلے کبھی اس ضد میں چلنے کا نتیجہ

کیا کیا کشش اس میں تھی وہ پتھر رہا جب تک
دیکھا نہ گیا اس کے پگھلنے کا نتیجہ

پھیلی ہے کسی اور ہی رنگت کی جو یہ راکھ
ہے اور کسی آگ میں جلنے کا نتیجہ

کب سے مجھے منظور ہے، جیسا بھی ہے، جو بھی
چشمے کی طرح پھوٹ نکلنے کا نتیجہ

میں وہ شجرِ خواب ہوں جس نے سحر و شام
بھگتا ہے یہاں پھولنے پھلنے کا نتیجہ

اک منزلِ معنی سے پلٹنے کی نشانی
اک پیرہنِ لفظ بدلنے کا نتیجہ

کس طرح کے تھے سنگِ حقیقت کے نمونے
کیسا تھا کھلونوں سے بہلنے کا نتیجہ

روشن ہوں ابھی، اور، کوئی شام ہے درپیش
ہونا تھا یہی کچھ مرے ڈھلنے کا نتیجہ

خود سے جو یہ خالی ہوا بیٹھا ہوں، ظفر، آج
ہے اپنے کناروں سے اچھلنے کا نتیجہ

-☆-

میں آگ پھانکتا ہوں، اور، دھواں پلٹتا ہے
کہاں سے جا کے مرا کارواں پلٹتا ہے

روانہ ہوتے ہیں دونوں سفر پہ ساتھ، مگر
مرے بغیر ہی میرا گماں پلٹتا ہے

خیال اس کا مسافر ہے دوسروں سے الگ
کہاں سے جاتا ہے، لیکن کہاں پلٹتا ہے

کٹا پھٹا ہے جہاں سے زیادہ ساحلِ جسم
اسی نشیب سے دریائے جاں پلٹتا ہے

مکیں تو جا کے پلٹتا ہے خود مکاں کی طرف
کبھی مکیں کی طرف بھی مکاں پلٹتا ہے

ملے نہ دور تک اس کا سُراغ ہی یکسر
تو راستے ہی سے خوابِ رواں پلٹتا ہے

وہ کم نما کبھی کرتا بھی ہے نمود کہیں
تو اس کے دیکھنے کو اک جہاں پلٹتا ہے

ہم اس کی بات کا آخر جواب کیونکر دیں
یہاں تو روز ہی اس کا بیاں پلٹتا ہے

اسی طرح کے ستارے ہیں اس طرف بھی، ظفر
جو میرے آگے رُخِ آسماں پلٹتا ہے

-☆-

کسی کے اور نہ ہمارے ہی رکھ رکھاؤ کے ہیں
بگاڑ جو ہیں جہاں بھی، ترے بناؤ کے ہیں

جو دل میں ہو بھی تو کچھ سطح پر نہیں آتا
کچھ اس طرح کے سلیقے ترے سبھاؤ کے ہیں

بجھی ہوئی وہی برفیں ہیں دل کے چاروں طرف
بجھے ہوئے وہی شعلے مرے الاؤ کے ہیں

یہ دُسی ہے کسی دوستی کا نُور ظہور
کہ لاگ میں بھی کئی لاحقے لگاؤ کے ہیں

ستم تو یہ ہے کہ اہلِ گریز کے اب تک
سبھی کنائے اُسی کی طرف جھکاؤ کے ہیں

رُکا ہوا ہے وہاں کام بس ہمارا ہی
اگرچہ طور طریقے تو چل چلاؤ کے ہیں

وہی ہے زورِ ہوا، اور، وہی ہے گرد و غبار
یہ شاخسانے ابھی تک اُسی بہاؤ کے ہیں

جہاں پہ آ کے رُکا ہوں ابھی، وہاں پر تو
سبھی نشان مرے اوّلیں پڑاؤ کے ہیں

ظفرؔ، ہوا نہیں آغازِ عشق ابھی ایسا
ابھی جو چاہو تو حیلے بہت بچاؤ کے ہیں

☆

وہی ہے رات دن کی یہ مصیبت، اور، ہم دونوں
اکٹھا رہ نہیں سکتے محبت اور ہم دونوں

یہ کیا اندازِ اُلفت ہے، قریب آنے کی خواہش میں
بڑھا لیتے ہیں آپس کی مسافت اور ہم دونوں

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ منظر کس طرح کا ہے
ہمارے چار سُو پھیلی یہ حیرت، اور، ہم دونوں

بہت کچھ ہو تو سکتا ہے، مگر، ہو گا نہیں کچھ بھی
کہ ہے پابندیٔ شرم و شرافت اور ہم دونوں

یہی اُمید سوتے جاگتے پھرتی ہے آنکھوں میں
کہیں مل جائیں گے خواب و حقیقت، اور، ہم دونوں

تقاضا صورتِ حالات کا کچھ اور ہوتا ہے
بنا رکھتے ہیں لیکن اپنی حالت اور ہم دونوں

وہ ملنے کو ترسنا، اور، بیگانے بنے رہنا
وہی اک دُوسرے کے ساتھ غفلت، اور، ہم دونوں

جہاں تک آ گئے ہیں اس سے آگے جا نہیں سکتے
نہیں اب کوئی بھی رُو و رعایت، اور، ہم دونوں

ظفرؔ، نزدیک لگتی ہے ملاقات آج بھی، لیکن
بہت دُوری پہ ہے ملنے کی مُہلت اور ہم دونوں

☆

فضاؤں کے لیے بے رونقی مقسوم کر دوں گا
میں آپ سے اس شہر کو محروم کر دوں گا

مجھے دونوں ہنر آتے ہیں، اب یہ میری مرضی ہے
اگر دل شاد کر دوں گا، اگر مغموم کر دوں گا

کوئی ہے جو مجھے زہر تماشا بوند بھر لا دے؟
مری خدمت کرے گا جو اُسے مخدوم کر دوں گا

سراغ اُس بے نشاں کا آپ اگر مجھ سے چھپاتے ہیں
تو جو معلوم ہے اُس کو بھی نامعلوم کر دوں گا

اگر مشکوک رہتی ہے مری ہستی تو سُن رکھو
کہ جو موجود ہے میں خود اُسے معدوم کر دوں گا

میں پیاسا ہی رہوں گا، اور، جاتے جاتے بستی کے
محبت کے کنویں جتنے بھی ہیں، مسموم کر دوں گا

کوئی لے جائے گا پھر کیا اُسے مجھ سے جدا کر کے
میں اپنے ساتھ اُس کو لازم و ملزوم کر دوں گا

وہ خود حیرت زدہ رہ جائے حرفِ مدعا سُن کر
میں عرضِ آرزو کو اتنا بے مفہوم کر دوں گا

سوال اُس نے، ظفر، میری شرافت کا اُٹھایا ہے
جواب اس بات کا اُس کو کسی دن چوم کر دوں گا

☆

بجھے گا یہ ستاروں کا سلسلہ کسی دن
میں اصل چہرہ بھی دیکھوں گا رات کا کسی دن

خود اپنے ساتھ جو کرنا پڑا سفر کسی رات
اُڑا کے لے گئی مجھ کو اگر ہوا کسی دن

وہ آنا چاہتا ہے، اور، آ بھی سکتا ہے
سو، دیکھنا ہے مجھے اُس کا راستا کسی دن

خزاں پلٹنے ہی والی ہے کوئی دن میں ابھی
یہ باغ ہونے ہی والا ہے اب ہرا کسی دن

ہُوا ہے جو بھی کچھ، ایسا تو ہوتا آیا ہے
کہ ملنے والوں کو ہونا ہی تھا جدا کسی دن

جنھیں جگہ نہیں ملتی ہے پانو دھرنے کو
یہی ہیں وہ جنھیں ہونا ہے جابجا کسی دن

ہمارے ساتھ وہ کرتے نہیں حساب کتاب
اگرچہ قرض تو ہونا ہے یہ ادا کسی دن

مجھے دکھائی نہ دے گا مرا بدن کسی شام
مجھے سنائی نہ دے گی مری صدا کسی دن

ہُوا تو ہونا ہے میں نے ہی شرمسار، ظفر
جو سامنے مرے آیا وہ بے وفا کسی دن

☆

خوش نہیں تیری رفاقت کے بغیر
پھر بھی اچھے ہیں محبت کے بغیر

حال کیا پُوچھ رہے ہو اپنا
ہم تو اب ہیں کسی حالت کے بغیر

اس لیے کام سرانجام ہُوا
تھا کسی کی بھی اجازت کے بغیر

اتنا دلچسپ نہ ہوتا کیوں کر
واقعہ تھا بھی حقیقت کے بغیر

اب تو ہمت ہی نہیں وہ باقی
رنج اُٹھتا نہیں راحت کے بغیر

اب بھی ہو جاتی ہے دُنیا غائب
کسی آثار قیامت کے بغیر

کوئی پُوچھے تو اثاثہ اپنا
کُچھ نہیں حسرت و حیرت کے بغیر

اتنا مصروف بھی رہتے ہیں تو کیا
یعنی رو لیتے ہیں فُرصت کے بغیر

خُون بھی خواب سے خالی ہے، ظفر
خاک بھی ہے کسی خصلت کے بغیر

☆

ہو گا کسی طرح کے اشارے میں آسماں
دیکھا ہے مَیں نے ایک ستارے میں آسماں

خلقت صدائیں دیتی رہی دیر دیر تک
آیا نہیں کسی کے پُکارے میں آسماں

خیمہ سا تھا سروں پہ جو سب کے تنا ہُوا
آخر گرا ہے ایک غُبارے میں آسماں

اک فاصلوں کی فصل تھی جیسے کھڑی ہُوئی
پھیلا ہُوا ہمارے تُمھارے میں آسماں

کُھلتا نہیں تھا بھید کوئی اصل بات کا
چڑھتے میں تھا غُبار، اُتارے میں آسماں

میرے بھی زیرِ غور تھا شاید اُسی گھڑی
کُچھ سوچتا تھا جب مرے بارے میں آسماں

کُچھ تھا مرے وجُود کے اندر بجائے خاک
بکھرا ہُوا یہاں وہاں سارے میں آسماں

مَیں چھت بناؤں گا تو کبھی اور ہی کہیں
رہتا نہیں اگر مرے وارے میں آسماں

چھائی ہُوئی تھی ابر کی صُورت زمیں، ظفر
سمٹا ہُوا تھا اپنے کنارے میں آسماں

☆

آخر کہاں سے اُس نے اُتاری ہے کائنات
میرے مُقابلے میں جو ساری ہے کائنات

ہوں اس کے مہروماہ کی حیرت میں کیوں نہ گُم
اسرار سے بھری جو تُمھاری ہے کائنات

لے جاؤں میں اُٹھا کے اِسے اور ہی کہیں
لیکن مرے وُجُود سے بھاری ہے کائنات

کُچھ بھی نہیں بغیر تو اِک دُوسرے کے ہم
مَیں سانپ ہوں تو میری پٹاری ہے کائنات

باہر بھی چل رہی ہے، مگر، سُست ہے بہُت
اندر بھی اس لیے مرے جاری ہے کائنات

قسمت میں اِس کی موت لکھی بھی ہے یا نہیں
کافی ہے زندگی کی جو ماری ہے کائنات

اچھی تو لگ رہی تھی مجھے دیر سے، مگر
تُم ہو یہاں تو اور بھی پیاری ہے کائنات

پھر کیا جو کہکشائیں کُچھ اندر بھی رہ گئیں
مَیں نے لہُو سے اپنے گُزاری ہے کائنات

انجام اِس کا جو بھی ہو اچھا بُرا، ظفرؔ
قرأت ہے میرا لفظ تو قاری ہے کائنات

☆

کل جانے کیا ہو، آج یہ دُنیا تو دیکھ لوں
جی بھر کے رنگِ خواب تماشا تو دیکھ لوں

مُہلت نہیں زیادہ، سو، یہ باغ بے خزاں
دیکھا ہے ایک بار، دوبارہ تو دیکھ لوں

پھر میرے سامنے ہے وہی رات کا سفر
ہوتی ہے شام، اپنا ستارہ تو دیکھ لوں

وہ خُود اگر نہیں، نہ سہی، اُس کی طرح کا
کوئی تو مِل ہی جائے گا، ایسا تو دیکھ لوں

وہ اور کا کُچھ اور ہُوا جا رہا سہی
کُچھ دیر اُس کو رنگ بدلتا تو دیکھ لوں

مُجھ کو کہیں سمیٹ بھی سکتا ہے یا نہیں
ساحل پہ جا کے دامنِ دریا تو دیکھ لوں

باقی تو اور کُچھ بھی نہیں کر رہا ہُوں مَیں
جو کُچھ کیا ہے اُس کا نتیجہ تو دیکھ لوں

کس کس کا بوجھ صُبحِ مسافت سے پیشتر
کاندھوں پہ ہے رکھا ہُوا، اِتنا تو دیکھ لوں

عرضِ ہوس میں عار تو کوئی نہیں، ظفرؔ
فی الحال اُس کا اپنا ارادہ تو دیکھ لوں

☆

ایک ایسی بے یقینی کا سفر درپیش ہے
گھر سے باہر بھی نکلتا ہوں تو گھر درپیش ہے

کھٹکھٹاتا ہوں کوئی دروازہ مَیں ہی بار بار
یا وہی جانِ تماشا دربدر درپیش ہے

اُس کی شکلیں سی جھلکتی ہیں در و دیوار سے
مَیں اُسے غائب سمجھتا ہوں، مگر، درپیش ہے

بادلوں میں ایک سُورج سا گزرتا ہے کوئی
چھپ گیا تھا جو ابھی، بارِ دگر درپیش ہے

آئنے میں گم شدہ دو شکل سے باہم ہوئے
یہ کہاں رُوپوش تھا، اور، وہ کدھر درپیش ہے

دُور ہونے سے وہ کُھل کر سامنے آتا ہے اب
ہم سمجھتے تھے کہ بس پیشِ نظر درپیش ہے

اس کا قصے دار اک وہی نہیں، مَیں خود بھی ہوں
صورتِ احوال ایسی ہی اگر درپیش ہے

کُچھ پتا چلتا نہیں، معلوم بھی ہوتا ہے کُچھ
اک انوکھا خطۂ خواب و خبر درپیش ہے

معجزہ ہی کوئی برپا کر نہ جاؤں، اے ظفر
یہ جو کُچھ دن سے مجھے ہول ہنر درپیش ہے

-☆-

یہ بھاگ دوڑ ہے کیسی، کہاں سے آگے ہوں
سمجھ رہا ہوں جو سارے جہاں سے آگے ہوں

یہ کیا سفر ہے، یہ رفتار کون سی ہے کہ مَیں
زمیں سے پیچھے ہوں، اور، آسماں سے آگے ہوں

جہاں سے ہوتا ہے بابِ جُدائی کا آغاز
وہاں پہ، اور، تری داستاں سے آگے ہوں

مُجھے دکھائی کہاں دے سکے کوئی منظر
کہ مَیں جو اپنے ہی خوابِ رواں سے آگے ہوں

خُدا کو ڈھونڈتا پھرتا تو ہوں بہت، لیکن
یہ لگ رہا ہے کہ اُس بے نشاں سے آگے ہوں

محاذِ جنگ سے پسپائی میں، اگر دیکھو
تمام سلسلۂ کارواں سے آگے ہوں

مُجھے تلاش نہ کر فرصتِ فنا میں کہیں
ذرا سا دُور سہی، مَیں یہاں سے آگے ہوں

فضائے مطلب و معنی سے کیا غرض مُجھ کو
کہ مَیں ہوائے زبان و بیان سے آگے ہوں

مَیں چھوڑ آیا ہوں پیچھے کہیں سفینہ، ظفر
وہیں پہ ڈوب رہا ہوں جہاں سے آگے ہوں

-☆-

مشکل کوئی پہلے جیسی کیوں نہیں لگتی
دوری بھی اب ویسی دوری کیوں نہیں لگتی

اُس نے تو سب سے مِلنا جُلنا ہوتا ہے
لیکن مجھ کو یہ بات اچھی کیوں نہیں لگتی

آنکھوں میں اب کیوں ہوتا نہیں خواب تمھارا
ٹوٹنے والی نیند ہماری کیوں نہیں لگتی

بھوک اور پیاس کا بھی اب نہیں کوئی اندازہ
کتنی لگتی ہے اور کتنی کیوں نہیں لگتی

دریا سُوکھ گئے ہیں سارے چاروں جانب
دھرتی، لیکن، پھر بھی پیاسی کیوں نہیں لگتی

رونق تھی جن کے دم سے وہ کہاں گئے ہیں
شہر ہے بسا ہُوا، آبادی کیوں نہیں لگتی

ناری ہوتے جاتے ہیں یا نُوری سارے
یہ مخلوق خدا اب خاکی کیوں نہیں لگتی

انقلاب آنے والا کیوں رُکا ہُوا ہے
بات یہاں کوئی ہونے والی کیوں نہیں لگتی

موسم تو ویسا ہی، ظفر، گُم صُم ہے، لیکن
حالت جیسی تھی اب ویسی کیوں نہیں لگتی

☆

جو دکھائی دے رہا ہے ماجرا پہلے ہی تھا
کُچھ مرے دریافت کرنے سے خُدا پہلے ہی تھا

پاس آیا ہے تو جھلکی ہے شفق اُس جسم کی
جھلملاتا سا کوئی رنگِ قبا پہلے ہی تھا

کُچھ بھی حاصل ہو نہیں سکتا ہے خواہش کے بغیر
چل پڑی ہے اب جہاں، خواب ہوا پہلے ہی تھا

تُو نے ہر وہ دُشمنی کی ہے جو مُجھ سے، میرے دوست
بعد میں کی ہے، مجھے اُس کا پتا پہلے ہی تھا

مَیں نے خُود ہی دیر کر دی تھی پہنچنے میں وہاں
جس جگہ موجُود وہ مُجھ سے ذرا پہلے ہی تھا

اور بھی مَیں نے زیادہ کر دیا ہے، جانے کیوں
یہ جو مُجھ میں اور اُس میں فاصلہ پہلے ہی تھا

یہ مُلاقاتیں تو بس اک رسمِ دُنیا تھی کوئی
اصل میں سمجھو تو وہ مُجھ سے جُدا پہلے ہی تھا

اب تو اپنے آپ کو یکسُو ہی کرنا ہے مُجھے
مَیں جو اس دشتِ سفر میں جابجا پہلے ہی تھا

سر کو ٹکرایا کیے ہیں رائگاں ہم ہی، ظفر
ورنہ اُس دیوار میں اک راستا پہلے ہی تھا

☆

جی اُٹھے مر کے تو اِک خواب کو دُہرانا تھا
ورنہ پہلے بھی یہاں ہم نے کہاں آنا تھا

وہ بھی اچھا ہی رہا حجلۂ مستوری میں
اور، ہم نے بھی اُسے دیکھ کے مر جانا تھا

اب کے وہ سایۂ دیوار ہی موجود نہیں
جس جگہ ہم نے ذرا بیٹھ کے سستانا تھا

اِس لیے بھی اُسے جانے کی ذرا جلدی تھی
اور بھی اُس نے کسی بزم کو مہکانا تھا

پیش آنا تھا ہمارے ہی جُدائی کا سفر
اُس نے تو دُور سے بس، ہاتھ ہی لہرانا تھا

کُچھ تو وہ آپ بھی تھا چوکس و چالاک بہُت
اور، اپنا بھی کُچھ انداز شریفانہ تھا

لوگ اب یاد دلاتے ہیں تو یاد آتا ہے
یہ محبت بھی وہ بھُولا ہُوا افسانہ تھا

اُس کو سمجھا کیے ہم بھی کہ ہے وہ اور کوئی
اُس نے بھی ہم کو بہُت دیر میں پہچانا تھا

گرچہ خوش پوش تو پہلے ہی بہُت ہے وہ، ظفر
کوئی ملبوسِ محبت اُسے پہنانا تھا

☆

یہ پھیلتی ہے یا کہ سکڑتی ہے کائنات
کیا روز اِک بہانہ سا گھڑتی ہے کائنات

حرف اِک ہوا ہے، اِس کے سوا کُچھ نہیں کہیں
پتّوں کی طرح پیڑ سے جھڑتی ہے کائنات

مَیں آگے اِس سے ہو کے ہی جاؤں گا غالباً
کُچھ میرے راستے میں ہی پڑتی ہے کائنات

کُچھ اِس کا اورچھور ہی مِلتا نہیں کہیں
سیتے ہی سیتے اور اُدھڑتی ہے کائنات

اپنی روِش کے ہاتھوں ہی مجبور ہے بہُت
مِلتی ہے مُجھ سے، اور، بچھڑتی ہے کائنات

یہ لاتعلّقی کوئی ایسی نہ تھی کبھی
اب چھوڑتی ہے، اور، نہ پکڑتی ہے کائنات

پتّھر ہُوں، اور، مُجھ کو کہیں پھینکتی نہیں
موتی نہیں ہُوں، اور، مجھے جڑتی ہے کائنات

گویا کہ ایک مَیں ہی تھا اِس کا ہدف یہاں
نیزہ سا میرے سینے میں گڑتی ہے کائنات

کِس کِس طرح سے روز مرے سامنے ظفر
بنتی ہے کائنات، بگڑتی ہے کائنات

☆

آیا نہیں فی الحال ستارے پہ ستارہ
قائم ہے ابھی اپنے کنارے پہ ستارہ

مرتا ہے کہ سُورج ہے بہُت راہ میں اُس کی
زندہ ہے کہیں رات گُزارے پہ ستارہ

منزل بھی وہیں، اور، مسافت بھی وہیں ہے
بہتا ہے بہُت اپنے ہی دھارے پہ ستارہ

کوئی بھی ستارہ نہیں، اور، اِس کے مقابل
اِس طور ہے چھایا ہُوا سارے پہ ستارہ

رہتا ہے اِسی طرح اِن افلاک کے اُوپر
افلاک سے نیچے بھی اُتارے پہ ستارہ

اُٹھنے کو ہے اِس کے ہی جو اندر سے کسی دن
عاشق ہے کسی ایسے شرارے پہ ستارہ

ہر سمت کو پھیلے ہُوئے بے خواب خلا میں
موجُود ہے اپنے ہی سہارے پہ ستارہ

اطراف میں ہو جاتی ہے کُچھ اور ہی جھلمل
جب ٹُوٹ کے گرتا ہے نظارے پہ ستارہ

ہونا ہے، ظفرؔ، آپ ہی معدوم کسی دن
جلتا ہے نہ بُجھتا ہے اشارے پہ ستارہ

☆

کہیں سے کر دیا خالی، کہیں پہ بھر دیا ہے
کہ میرے ذِمّے تھا جو کام، مَیں نے کر دیا ہے

مَیں خود تو اِس کے مُطابق چلا ہُوں کم کم ہی
جو دُوسروں کے لیے نقشۂ سفر دیا ہے

سمجھ کسی کو نہ آیا اشارہ سا جو کوئی
کبھی اِدھر دیا ہے، اور، کبھی اُدھر دیا ہے

سو، ہر طرف سے محبت معاملہ تھا عجب
وہیں قریب تھا مَیں، فاصلہ جدھر دیا ہے

یہ اور بات کہ باہر نہیں کوئی نکلا
وگرنہ مَیں نے تو آوازہ دربدر دیا ہے

سہولت اُس نے بہم کر رکھی ہے سب کے لیے
کسی کو گھاؤ دیا ہے، کسی کو گھر دیا ہے

لگا لیا ہے گلے چُوم چاٹ کر مَیں نے
جو اُس نے بے ہُنری کا مجھے ہُنر دیا ہے

مرا بیان وہ مُجھ تک ہی رہ گیا اکثر
کبھی جو اُس نے مری بات کو اثر دیا ہے

مُجھے تو چھانو ہی اشجار کی بہُت ہے، ظفرؔ
دیا تو ہے جو مجھے باغ بے ثمر دیا ہے

☆

اگرچہ کوئی اکیلا نہیں دکھائی دیا
خُدا کے ساتھ فرشتہ نہیں دکھائی دیا

بلی نہیں جو خود اپنی مثال دُنیا میں
کوئی تُمھارے بھی جیسا نہیں دکھائی دیا

جہاں مَیں کود پڑا ایک بار پانی میں
تو دُور تک مجھے دریا نہیں دکھائی دیا

ٹھہر گیا ہُوں تو نیچے زمین ہی نہیں تھی
جو چل پڑا ہُوں تو رستہ نہیں دکھائی دیا

وہ جس کے ہونے سے رونق لگی ہُوئی تھی وہاں
ہجُوم میں وُہی چہرہ نہیں دکھائی دیا

مَیں اس کا اور کے ذمّہ دار ٹھہراؤں
کُھلی تھی آنکھ ، تماشا نہیں دکھائی دیا

مجھے تو پہلے ہی شک تھا کُچھ اُس کے ہونے میں
کہیں نہیں تھا ، لہٰذا نہیں دکھائی دیا

مرا خیال تُمھیں بھی نہیں ، کئی دن سے
مجھے بھی خواب تُمھارا نہیں دکھائی دیا

جھلک نظر نہیں آئی پھر اُس زمیں کی ، ظفرؔ
وہ آسمان دوبارہ نہیں دکھائی دیا

-☆-



نہ جاگا ہُوا ہُوں نہ سویا ہُوا
کہ زندہ ہُوں مَیں اور نہ مویا ہُوا

ہمیشہ ہی کرتا ہُوں مَیں ہنس کے بات
ہمیشہ ہی لگتا ہُوں رویا ہُوا

کوئی رات ہے جس کے دھاگے میں ہُوں
ستارے کی صُورت پرویا ہُوا

زباں بند رکھنا بھی ہے ایک بات
کہ مَیں خامشی میں ہی گویا ہُوا

ڈھنڈورا مرا پیٹتے ہو کہاں
مَیں اپنے ہی گھر میں ہُوں کھویا ہُوا

ابھی قُدرتی ہے تروتازگی
ابھی مُنہ نہیں اُس نے دھویا ہُوا

مجھے سُوکھنے ڈال دو گھاس پر
کسی خواب میں ہُوں بھگویا ہُوا

چُھپایا ہُوا ہُوں کبھی خاک پر
کبھی آسماں میں چھپویا ہُوا

جو مَیں کاٹتا ہُوں وہ کُچھ اور ہے
کہاں ہے ، ظفرؔ ، میرا بویا ہُوا

-☆-

پہلے ہی شبِ غم گھنیری تھی ، مرے یار
تم چل دیے ، باری تو یہ میری تھی ، مرے یار

جلدی تھی تمھیں کون سی اتنی ، مرے پیارے
جانے میں بہت سی ابھی دیری تھی ، مرے یار

ہمت ہوئی کس طرح تمھیں اتنے سفر کی
اس حال میں کیسی یہ دلیری تھی ، مرے یار

کیوں جان لیا اس کو عزیز اتنا بلاوجہ
یہ موت پچھیری نہ خلیری تھی ، مرے یار

یادیں ہی یہاں بیچنے آئے تھے تم اپنی
یہ عمر تمھاری کوئی پھیری تھی ، مرے یار

گھیرا تھا تمھیں موت نے پردیس میں جا کر
یا تم نے کہیں راہ میں گھیری تھی ، مرے یار

دھوکا تھا نظر کا ہی سراپا وہ تمھارا
مٹی کی جو بے نام سی ڈھیری تھی ، مرے یار

وہ رات بھی سب راتوں سے کالی تھی زیادہ
اور ، ابر کی صورت بھی گھنیری تھی ، مرے یار

دیکھی نہیں جاتی تھی ، ظفر ، اب تو کسی سے
کچھ روز سے حالت جو یہ تیری تھی ، مرے یار

☆

واشنگٹن میں اپنے چھوٹے بھائی جاوید اقبال کے انتقال پر

میں بظاہر ہی بس ادھورا ہوں
ورنہ تو ہر طرف سے پورا ہوں

کوئی کرتا نہیں ہے استعمال
کس طرح کا میں آبخورہ ہوں

روشنی میں کبھی مجھے دیکھو
ڈب کھڑبا نہیں ہوں ، بھورا ہوں

کس لیے توڑ پھوڑ کرتے ہو
میں تو پہلے ہی چورا چورا ہوں

مجھے ماں باپ نے کیا پیدا
میں تو پہلے ہی بے قصورا ہوں

اس نے بھی گھور کر مجھے دیکھا
صرف میں ہی نہیں جو گھورا ہوں

آپ تو ہجر میں رہے بشاش
میں ہی تھوڑا سا منہ بسورا ہوں

میری تذکیر کا خیال رہے
میں ضروری نہیں ، ضرورا ہوں

گھس تو سکتا ہوں ناک میں بھی ، ظفر
میں جو دراصل کن کھجورا ہوں

☆

بچا کھچا یہ دل اُس پر نثار کرنا ہے
وہ مُعتبر نہیں ، اور ، اعتبار کرنا ہے

وہ بات کہنی ہے ، اور ، باز ہی نہیں آنا
یہ کام کرنا ہے ، اور ، بار بار کرنا ہے

یہ کام تُم ہی اگر کر سکو کسی صُورت
یہ میری خاک ہے ، اس کو غُبار کرنا ہے

وہ مِل ہی جائے کہ بے روزگار ہُوں کب سے
اُسی کے ساتھ کوئی کاروبار کرنا ہے

ہزار کام پڑے ہیں ابھی ، علاوہ ازیں
ابھی تو مَیں نے ترا اِنتظار کرنا ہے

وہ چاندنی ہے جسے چُومنا ہے گام بہ گام
وہ روشنی ہے جسے رہگُزار کرنا ہے

ہے رُخ اُسی کا مری منزلِ سخن کی طرف
وہ راستہ جو ابھی اِختیار کرنا ہے

ابھی ہُوں شعر کے پردے میں گُم کہ مَیں نے ابھی
کُچھ اپنا آپ یہاں آشکار کرنا ہے

مَیں ایک قطرے کو دریا بنا رہا ہُوں ، ظفر
اور ، اُس کے بعد اِسے مَیں نے پار کرنا ہے

☆

اُڑا جو عکس تو اُس میں کوئی اشارہ بھی تھا
کہ ایک بار بھی تھا ، اور ، پھر دوبارہ بھی تھا

نظر میں رات کی تصویر تھی بکھرتی ہُوئی
اور ، اُس میں شام کا ٹُوٹا ہُوا کنارہ بھی تھا

بُلند بام کیا تھا بڑی تگ و دو سے
پھر اُس کے بعد فلک سے اُسے اُتارا بھی تھا

ہوا میں پیاس تھی ہونٹوں کا حشر کرتی ہُوئی
ہجومِ خاک پہ ایک آدھ آبپارہ بھی تھا

ہمارے موسموں پر ابر تھا کُچھ اور ، مگر
ہماری دُھوپ میں اک رنگ سا تُمھارا بھی تھا

نواحِ خواب کے اِن کاغذی گھروں میں کہیں
قریب و دُور کسی حُسن کا شرارہ بھی تھا

مَیں گھر کا راستہ بُھولا ہُوں جن اندھیروں میں
مَیں کیا بتاؤں ، مرے ساتھ اک ستارہ بھی تھا

کُچھ اب کی بار تو لوگوں کا جمگھٹا ہر سُو
مُجھے پسند نہیں تھا ، مگر ، گوارا بھی تھا

ہُوا ہے نفع تو پُوچھا نہ جا کے اُس سے ، ظفر
کہ اِس دُکان میں حِصّہ کوئی ہمارا بھی تھا

☆

آنے کی اب نہ کچھ وہاں جانے کی بات ہے
بس دُور سے ہی لطف اُٹھانے کی بات ہے

باقی تو سارا کام ہمارا ہے بیش و کم
تھوڑا سا اُس کے راہ پہ آنے کی بات ہے

سُلنے لگے ہو سب سے جو پہلے ہماری بات
محفل سے اپنی یہ تو اُٹھانے کی بات ہے

سب جانتے ہیں عشق میں ہوتا ہے کیا سلوک
یہ بھی بھلا کسی کو بتانے کی بات ہے

انکار سے تو ختم نہیں ہو گی ، جانِ من
اُلٹا ہی یہ تو بات بڑھانے کی بات ہے

یہ عشق جیسے طرفہ کرامات ہو کوئی
اِک شعبدہ سا اُس کو دکھانے کی بات ہے

یُوں جو بتائی جا نہیں سکتی کسی طرح
وہ ایک بات ہی تو ٹھکانے کی بات ہے

پلّے کسی کے پڑتا نہیں جو ہمارا شعر
شاید یہ ایک اور زمانے کی بات ہے

آغاز کر لیا ہے تو کافی ہے یہ ، ظفؔر
باقی تو ساری توڑ چڑھانے کی بات ہے

☆

اندھیرے چھا رہے تھے یا اُجالا ہونے والا تھا
دریچہ بادلوں کا خاک پر وا ہونے والا تھا

ہوا خود سے اُلجھنے کے لیے تیار تھی جیسے
ذرا سی دیر میں سارا تماشا ہونے والا تھا

کچھ اپنے بوجھ سے ہی ٹوٹ بھی سکتا تھا اُس لمحے
کہ خود میں جس قدر کم تھا ، زیادہ ہونے والا تھا

ہماری خواہشِ ناکام کا کیا دخل ہے اِس میں
کہ اُتنا ہو چکا تھا کام جتنا ہونے والا تھا

بھلے ہی گردشِ افلاک آڑے آ گئی ، ورنہ
یہاں سب کچھ تُمھارا بھی ہمارا ہونے والا تھا

ہمیں اِک عُمر تھی درکار اُس کے پار کرنے کو
ہمارے درمیاں جو خواب دریا ہونے والا تھا

کسر کچھ رہ گئی تھی جیسے پہلی بار ہونے میں
سو ، جو کچھ ہو چکا تھا اب دوبارہ ہونے والا تھا

ہمارے حق میں اب کیا فائدہ ہونے نہ ہونے سے
بُرا ہونے کو تھا یا کوئی اچھا ہونے والا تھا

ظفؔر ، مَیں بے خبر سا لگ رہا تھا آپ ہی ، ورنہ
مجھے معلوم تھا اُس رات کیا کیا ہونے والا تھا

☆

اتنا کچھ ہو کر بھی یہ گنجائش باقی رہ گئی تھی
دل پر بس تیری کرنوں کی بارش باقی رہ گئی تھی

جس کا کوئی پتا نہیں چلتا تھا کیا ہے اور کیسی ہے
دل کے کونوں کھدروں میں اک خواہش باقی رہ گئی تھی

لمبی تان کے سویا ہُوا تھا ہر جذبہ اور ہر احساس
کسی خواب میں ایک خیال کی لرزش باقی رہ گئی تھی

موسم ٹھہرا ہُوا تھا، اور، فضا ساری حیرت میں گم
بادل اور ہوا میں ایک آویزش باقی رہ گئی تھی

کسی چیز سے کوئی شے خالی سی ہو گئی ہو جیسے
خود وہ کہیں نہ تھا، اُس کی زیبائش باقی رہ گئی تھی

دنوں کا جو بھی حساب کتاب تھا سب رکھا تھا ایک طرف
رہ گئی تھی تو راتوں کی پیمائش باقی رہ گئی تھی

حشر سا ایک بپا تھا جڑ سے اُکھاڑے ہُوئے درختوں پر
آندھی گزر گئی تھی، اُس کی یورش باقی رہ گئی تھی

چھوڑ نہ سکتے تھے حالات کے رحم و کرم پر خود کو ہم
کچھ بھی نہیں تھا، ایک اپنی سی کوشش باقی رہ گئی تھی

دریا نے رُخ موڑ لیا تھا اپنی من مرضی سے، ظفر
پانی غائب تھا، پانی کی سازش باقی رہ گئی تھی

☆

اِس مکان و زماں کے تھے ہی نہیں
ہم جہاں تھے وہاں کے تھے ہی نہیں

اِس دفعہ فصلِ گندم و جو پر
رنگ آبِ رواں کے تھے ہی نہیں

جا کے لگتے تھے جو نشانے پر
تیر اپنی کماں کے تھے ہی نہیں

ڈر گئے کاروبارِ عشق سے کیوں
یہ تو سود و زیاں کے تھے ہی نہیں

پُوچھتے کیا ہو اب ہمارا پتا
ہم تو نام و نشاں کے تھے ہی نہیں

کچھ تو ویسے بھی ہو سکے نہ سخن
کچھ زبان و بیاں کے تھے ہی نہیں

آسماں پر بکھر رہے تھے جو رات
رنگ وہ آسماں کے تھے ہی نہیں

راہ میں آ کے جو ہُوئے شامل
لوگ وہ کارواں کے تھے ہی نہیں

زندہ رہتا ظفر، بُڑھاپے تک
طور یہ اُس جواں کے تھے ہی نہیں

☆

ہے اگر اپنے آرپار میں کچھ
نظر آتا نہیں غبار میں کچھ

کہیں دو چار میں ، ہزار میں کچھ
ہم بھی ہوتے اگر شمار میں کچھ

کیسا کیسا اثر ہے بارش کا
ریت پر کچھ ہے ، لالہ زار میں کچھ

تھیں ، اگر ، اب کدھر گئیں جانے
مچھلیاں آب انتظار میں کچھ

رنگ تھا اُس کی سادگی میں بھی ایک
دھوپ تھی سایۂ بہار میں کچھ

اجنبی بھی ہے ، اور ، شناسا بھی
پھر رہا ہے مرے مدار میں کچھ

وہ جو کھاتا نہیں فریبِ وفا
ہے کمی اپنے اعتبار میں کچھ

سو بھی نکلا ہوں ایک جنبش میں
میں ہی تھا اپنے اختیار میں کچھ

کیوں بڑھاتے دکانِ شوق ، ظفر
نفع ہوتا جو کاروبار میں کچھ

☆

یہ آنکھیں چوم سکتا ہوں کہ ماتھا چوم سکتا ہوں
مجھے تم خود ہی بتلا دو میں کیا کیا چوم سکتا ہوں

نہیں ہے دیکھنے اور چومنے میں فرق بھی اتنا
میں آنکھوں سے بدن سارا تمھارا چوم سکتا ہوں

تلافی ہو تو سکتی ہے جو کوتاہی بھی کر بیٹھوں
غلط بوسی کی صورت میں دوبارہ چوم سکتا ہوں

یہ استحقاق سے کم بھی نہیں ہے کچھ اگر سمجھو
محبت کر رہا ہوں میں ، لہٰذا چوم سکتا ہوں

تماشاگاہ میں جا کر خلل پیدا نہیں کرتا
اگر میں دور سے رنگِ تماشا چوم سکتا ہوں

غنیمت ہے اگر وہ چومنے دے ہاتھ ہی اپنے
ابھی تک تو کہاں وہ روئے زیبا چوم سکتا ہوں

کہاں وہ چاند جو میری رسائی سے ہے دور اتنا
کہاں میں اس زمیں کا ذرہ ذرہ چوم سکتا ہوں

کسی شب سیر کرنی ہے تمھارے آسمانوں کی
جہاں میں اپنی قسمت کا ستارہ چوم سکتا ہوں

ابھی تک تو ، ظفر ، ساری کی ساری خوش خیالی ہے
ابھی تو صرف رخسارِ تمنا چوم سکتا ہوں

☆

کچھ ہماری ہاؤہو ، اور ، کچھ تمہارا شور ہے
خانۂ دل میں وہی سارے کا سارا شور ہے

رات سے دن کو نکالا ہے ، اور ، اس کے ساتھ ساتھ
خواب خاموشی کے اندر سے اُبھارا شور ہے

کچھ اُسے سُن کر ہی ملتی ہے مجھے سمتِ سفر
میرے دل کے آسماں پر جو ستارہ شور ہے

گرم رہتا ہے یہ ہنگامہ یہاں شام و سحر
چند لمحے بند رہ کر بھی دوبارہ شور ہے

گفتگو در گفتگو در گفتگو در گفتگو
آئنے میں عکس کی صورت اُتارا شور ہے

چُپ ہمیں رہنے کی کچھ فرصت بھی ملتی ہے کہاں
کچھ ہماری شاعری کا استعارہ شور ہے

شہر میں کچھ تو سلامت رہ گیا ہوتا کہیں
ٹکڑے ٹکڑے شام ہے ، اور ، پارہ پارہ شور ہے

رہ گیا ہے اک سکوتِ سبز ہی چاروں طرف
ایک ایسے شور سے میں نے گزارا شور ہے

دیکھ کر پھٹنے لگے کانوں کے پردے بھی ، ظفر
اس دفعہ آنکھوں کے اندر ہی نظارہ شور ہے

☆

کسی خواب نے ان آنکھوں سے اوجھل ہو جانا تھا
جسم نے ہلکا پھلکا ، دل نے بوجھل ہو جانا تھا

بھلا ہُوا یہ چھپا رہا مجھ سے ، ورنہ میں نے تو
کائنات کا راز سمجھ کر پاگل ہو جانا تھا

کہیں پہنچنا تھا نہ دکھائی ہی دینا تھا کچھ بھی
دھوپ نے آئینہ ، رستوں نے دلدل ہو جانا تھا

پیڑ پرندے بن کر اُڑ جانے تھے کسی طرف کو
اور ، زمیں نے دیکھتے دیکھتے بادل ہو جانا تھا

ڈرتے رہنا تھا جنگل کی تنہائی سے ، اور ، پھر
اپنے آپ کہیں جنگل میں منگل ہو جانا تھا

دل کی چھاؤں میں بیٹھتا کچھ دیر اور اگر وہ آ کر
رفتہ رفتہ اس کیکر نے صندل ہو جانا تھا

آسماں پر بارش کے آثار نہیں ملتے تھے
اور ، اک پل میں دُور دُور تک جل تھل ہو جانا تھا

کسے خبر تھی مرنا ہے پیدا ہونے سے پہلے
اور ، آغاز سے پہلے کام مکمل ہو جانا تھا

مجھے ، ظفر ، معلوم تھا ایسا کوئی کیمیاگر ہوں
کسی روز سونا بھی جس کا پیتل ہو جانا تھا

☆

اُس پر کوئی دعویٰ تو ہمارا بھی نہیں تھا
وہ ایک اشارہ جو اشارہ بھی نہیں تھا

وہ سامنے بیٹھا ہُوا غائب تھا نظر سے
دیکھا جو دوبارہ تو دوبارہ بھی نہیں تھا

تھے اجنبی، اور، بزم سے اُٹھتے بھی نہیں تھے
اور، اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا

اب سوچتے ہیں، رکھتا وہ جاری ہی کسی طور
ہم کو وہ رویّہ جو گوارا بھی نہیں تھا

عُجلت کوئی ہم کو ہی پڑی تھی کہیں اُس شام
کُچھ اس میں قصور ایسا تُمھارا بھی نہیں تھا

منجدھار تھا پانی کے تھپیڑوں کے پس و پیش
دریا بھی نہ تھا، اور، کنارہ بھی نہیں تھا

وہ ایک سفینہ کہ سمندر سے رہا دُور
وہ ایک سفر جس میں ستارہ بھی نہیں تھا

خُود چھوڑ دیا ہم نے سروکارِ محبت
حالانکہ بہُت اس میں خسارہ بھی نہیں تھا

خاطر میں ہی لائے نہ کبھی اُس کو، ظفؔر، ہم
اور، جس کے بغیر اپنا گزارہ بھی نہیں تھا

☆

یہ بھی مجھ کو ہی بہ انداز دگر چاہتے ہو
ٹوٹ کر اور کسی کو تُم اگر چاہتے ہو

دل میں گُل پھول ہمارے بھی ہیں، لیکن شاید
تُم کسی اور ہی گلشن سے گُزر چاہتے ہو

اس تجارت کا بہُت شوق تو رکھتے ہو، مگر
کُچھ زیاں چاہتے ہو، اور، نہ ضرر چاہتے ہو

عیب ظاہر تو ہُوئے سارے ہمارے تُم پر
اور کیا اس کے سوا عرضِ ہُنر چاہتے ہو

تُم نے رہنا ہی نہیں ہے اگر اس میں کُچھ دن
چھوڑ جانا ہے تو پھر کس لیے گھر چاہتے ہو

کبھی اس خیمۂ خواہش سے نکلتے بھی نہیں
آپ مُنہ سے نہیں کہتے ہو، مگر، چاہتے ہو

خُود ہی یہ دُھوپ سی پھیلائی ہُوئی ہے تُم نے
اب اسی دُھوپ سے بچنے کو شجر چاہتے ہو

سادگی اس سے زیادہ بھی کوئی کیا ہو گی
دُور رہ کر بھی سمندر سے گُہر چاہتے ہو

اس زمانے پہ، ظفؔر، آپ ہُوئے ہو ظاہر
اب کسی اور زمانے کا سفر چاہتے ہو

☆

سپاہ ابلق و شمشیر ہے اللہ اکبر
جہادِ وادیِ کشمیر ہے اللہ اکبر

چراغاں در چراغاں ہو گیا کُہسار چاغی
عدو کو پانو کی زنجیر ہے اللہ اکبر

جہاں جا کر علم لہرا دیا ، اپنا وطن ہے
کہ ہم کو حکمِ داروگیر ہے اللہ اکبر

ہماری فتح و نصرت کا مبارک مند مضموں
نوشتۂ خانۂ تقدیر ہے اللہ اکبر

ہمارے کیمیا گر ہیں جو اے کیو خان جیسے
تو اپنی خاک بھی اکسیر ہے اللہ اکبر

ہمارے خون کی خوشبو گل و گلزار میں ہے
ہمارے خواب کی تعبیر ہے اللہ اکبر

ہمارے سامنے دُشمن ٹھہر سکتا ہے کیونکر
ہمارا نعرۂ تکبیر ہے اللہ اکبر

کسی اچھے ، بہُت اچھے زمانے کی بشارت
در و دیوار پہ تحریر ہے اللہ اکبر

ظفرؔ ، کیونکر نہ ہوگی سربلند اب کے عمارت
اگر یہ جذبۂ تعمیر ہے اللہ اکبر

-☆-

یہ بھی نہیں کہ ہم کو محبت نہیں ملی
اس کام کی ہمیں کبھی فرصت نہیں ملی

موقع تو پیشِ رفت کا ہم کو مِلا ، مگر
اُس شوخ سے ہماری طبیعت نہیں ملی

خوشیاں وُہی بس ایک ہی جیسی ہیں دستیاب
دل کو کچھ اور طرح کی راحت نہیں ملی

اُس کو بھی ایک بوسۂ گستاخ کے سوا
اپنی طرف سے کوئی شکایت نہیں ملی

پُوچھے بغیر بے ادبی جو بھی کر سکے
پُوچھا ہے جتنی بار ، اجازت نہیں ملی

صُحبت رہی ہے خود سے ہی اپنی بہُت ، مگر
پھر وہ قریب رہنے کی عادت نہیں ملی

اچھے نہیں تھے کام ہمارے ، اسی لیے
بدنام تو بہُت ہُوئے ، شہرت نہیں ملی

تھی برف ، اور ، نام کو ٹھنڈک نہ تھی وہاں
سُورج تھا ، اور ، اُس سے حرارت نہیں ملی

کھاتی رہی ہے باڑھ ہی اس کھیت کو ، ظفرؔ
محفوظ بھی ہُوئے تو حفاظت نہیں ملی

-☆-

وہی رنگِ دل ہے، مگر، کیا خبر، رنگِ دُنیا کہاں رہ گیا ہے
کہیں یاد آتا نہیں وہ طلسم تماشا کہاں رہ گیا ہے

وہ جو میرے ہی پیکر کا حصّہ تھا، اور، دُور ہوتا نہیں تھا کبھی
مجھے اس قدر بھیڑ میں چھوڑ کر آپ تنہا کہاں رہ گیا ہے

یہ موجیں کہ ٹکراتی رہتی ہیں اک دُوسری سے اسی طرح شب بھر
بہُت شوق ہے دل کے اندر ابھی، لیکن اتنا کہاں رہ گیا ہے

اپنا اپنا جو کُچھ تھا وہ گُھل مِل کے ایسا ہُوا ہے برابر
ہمارا کہاں رہ گیا اور تُمھارا کہاں رہ گیا ہے

وہی میرے جیسے ملیں گے جدھر جا کے بھی دیکھ لو تُم
بُروں سے بھری ہے یہ دُنیا، کہیں کوئی اچھا کہاں رہ گیا ہے

لگا ہاتھ جو بھی سو لے آئے اور شکر کرتے ہیں اُس کا ادا ہم
حساب کم و بیش اب کیا کریں کون کتنا کہاں رہ گیا ہے

یہاں عیب اپنے چھپاتے کہاں تک زمانے کی نظروں سے بے سُود
یہاں بات ساری تھی جو کُھل چکی، اُس کا پردہ کہاں رہ گیا ہے

خلا میں ہی خرمستیاں کرتا پھرتا رہوں گا ابھی اور کب تک
ابھی تو مرے ہاتھ میں تھا، زمیں کا کنارہ کہاں رہ گیا ہے

مری ذات کے ساتھ وابستہ کُچھ اور بھی تو ظفرؔ خواب سے تھے
کہ یہ تو فقط مَیں ہی میں ہُوں، وہ میرا بقایا کہاں رہ گیا ہے

☆

جگنو ہے دیکھ لو کہ ستارہ ہے پھُول میں
مَیں تو سمجھ رہا تھا شرارہ ہے پھُول میں

کھلنے دو اپنے آپ اِسے اپنی موج میں
پوشیدہ کوئی خواب ہمارا ہے پھُول میں

اب تک رہا بھی، اور، گرا بھی کتاب سے
خُوشبُو اُسی طرح کی دوبارہ ہے پھُول میں

پہلے جو آب و تاب تھی وہ رات ہی کی تھی
اب صبح کا ہی کوئی کنارہ ہے پھُول میں

اندر کا انتظام تو جو ہے سو ہے، مگر
باہر کا بھی ہر ایک نظارا ہے پھُول میں

جُھکتا کسی طرف نہیں، دیکھا ہے غور سے
پھر بھی کسی طرف کا اِشارہ ہے پھُول میں

ہر چند ہر طرف سے ہوا بند ہے، مگر
اپنا ہی کوئی اُس کا غُبارہ ہے پھُول میں

رنگ بدن کی صاف جھلک ہے کسی قدر
حصّہ کہیں کہیں جو تُمھارا ہے پھُول میں

اس طرح کی، ظفرؔ، وہ مُلاقاتِ باغ تھی
جیتا تھا گھاس پر جو وہ ہارا ہے پھُول میں

☆

وہ تو کریں گے طلب ہر گئے پل کا حساب
ہے مری میزان میں آج نہ کل کا حساب

جو بھی کہا کہہ دیا ، جو بھی کِیا ، کر دیا
مَیں کہاں رکھتا پھروں قول و عمل کا حساب

ساری تفاصیل جب یاد تھیں ، تب پُوچھتے
کافِ کمر کی حدیں ، زُلف کے بل کا حساب

کِس کی نظر کھا گئی ، کِس نے ہے رکھا ہُوا
گھاس کی وہ نرمیاں ، پیڑ کے پھل کا حساب

کل بھی کہیں پر نہ تھا ، اب بھی کہیں پر نہیں
صُبحِ ازل کا دُھواں ، شامِ اجل کا حساب

موجِ مُلاقات پر چھائی ہُوئی دُھند سی
تھا وُہی موقع کا حُسن ، اور محل کا حساب

شکل ہے جیسی بھی ہے ، عقل تھی جیسی بھی تھی
آج ہی لے لیجیے خواب خلل کا حساب

کُچھ بھی مِلا ہو ، اگر چیز کسی کے عوض
صاف تھا اپنا یہاں ردّ و بدل کا حساب

عُمر ہُوئی ہے ، ظفر ، شہر سے جو پھر گیا
خُود ہی لگا لیجیے غول غزل کا حساب

☆

بڑھتا ہُوا جو ایک طرف سے اندھیر ہُوں
دیکھو تو اپنی دُوسری جانب سویر ہُوں

ہر وقت آتے جاتے کبُوتر سے ہوں جہاں
ایسی کسی کے خواب ہوس کی منڈیر ہُوں

میری دہاڑ پر نہ کوئی جائے ایک دم
نقلی ہُوں مَیں کہ اصل میں کاغذ کا شیر ہُوں

کُچھ ، وقت پر تو مُجھ سے مرا بھی نہیں گیا
تاخیر سے بھرا ہُوا اک دشتِ دیر ہُوں

ہے کوئی درمیان کا مصرف مرا کہیں
املائے عاشقی میں زبر ہُوں نہ زیر ہُوں

ہو گی نہیں کبھی مری پیمائش اِس طرح
اپنا ہی طول و عرض ہُوں ، اپنا ہی گھیر ہُوں

مَیں دُور سے تو سادہ ہی لگتا ہُوں آپ کو
پالا کبھی پڑے تو بہُت ہیر پھیر ہُوں

جس معرکے میں میرے مقابل نہ ہو کوئی
اُس وقت مَیں ہی سب سے زیادہ دلیر ہُوں

یہ عجز تھا کہ میری انا تھی کوئی ، ظفر
جو شعر وار اپنے ہی قدموں میں ڈھیر ہُوں

☆

کیا ہُوئے آنسوؤں کے ہار پرونے والے
جیسے تھک ہار چکے ہوں مجھے رونے والے

صبح اُٹھتے ہیں لیے خواب سے خالی آنکھیں
یُوں تو نادار نہیں تھے کبھی سونے والے

کس تکلّف میں پڑا ہُوں میں اگر جانتا ہُوں
کام یہ سارے کے سارے نہیں ہونے والے

اب کہاں اہلِ قناعت وہ ہم ایسے کہ جو تھے
تیرے دریا سے فقط ہونٹھ بھگونے والے

عافیت اُن کے مقدّر کا لکھا ہی سمجھو
آپ ڈوبا نہیں کرتے ہیں ڈبونے والے

لوگ نایاب ہُوئے جاتے ہیں، پھُولوں کی طرح
کوئی کانٹا سا محبت کا چبھونے والے

گُزر اوقات ہی کرتے ہیں برابر، ورنہ
بوریے میں وہ کہاں لطف بچھونے والے

کاٹنے کی یہاں نوبت ہی نہیں آتی ہے
اور، بے سُود بکھرا کرتے ہیں بونے والے

زیبِ تن کر کے وُہی پھر چلے آئے ہو، ظفر
تمھیں معلوم تھا کپڑے ہیں یہ دھونے والے

☆

خُدا ہے بھی اگر تو ماورا کے کِس طرف ہے
جو ہے کچھ اور بھی تو وہ خُدا کے کِس طرف ہے

کبھی دیکھیں گے اُس کو دیکھنے سے پیشتر بھی
چراغِ چشم ابھی اُس کم نُما کے کِس طرف ہے

ابھی پتّوں کو خود بھی اِس کا اندازہ نہیں کچھ
کہ اِن میں کون دیوارِ ہوا کے کِس طرف ہے

خبر اتنی تو ہونی چاہیے اہلِ طلب کو
دُعا خود بھی یہاں دستِ دُعا کے کِس طرف ہے

یہ معلومات آخر مل ہی جائیں گی کسی دن
روا ہے جس قدر بھی، ناروا کے کِس طرف ہے

ابھی تو اپنی اپنی خوش خیالی ہے، وگرنہ
کسے معلوم ہے بجلی گھٹا کے کِس طرف ہے

زیادہ فرق تو ہو گا نہیں، معلوم تو ہو
مری مرضی کہیں تیری رضا کے کِس طرف ہے

کدھر سے روشنی کی پھُوٹ پڑتی ہے برابر
ہمارا بوسہ اُس کے نقشِ پا کے کِس طرف ہے

ظفر، یہ تھرتھری منسوب کرتے ہیں جو مجھ سے
نہیں معلوم یہ میری صدا کے کِس طرف ہے

☆

نئی ہوئی کوئی چادر سی آبشار کی تھی
نواحِ سبز میں ہیبت بھی کوہسار کی تھی

خزاں کے زرد کنارے پہ جب مِلا وہ مجھے
مہک فضا میں ابھی موسمِ بہار کی تھی

بکھیر دی ہے جو اُس کے اندھیرے آنچل پر
وہ روشنی مرے دشتِ صدا کے پار کی تھی

وہ موجِ زر مری آنکھوں میں آ رُکی تو کھلا
کہ سر میں ساری خرابی اُسی خمار کی تھی

اگرچہ دُور نہ تھا مجھ سے کارواں اُس کا
فصیل اُس کے مرے درمیاں غبار کی تھی

فلک پہ اوس کے قطرے تھے آنسوؤں کی طرح
تو صحنِ دل میں فضا اُس کے سبزہ زار کی تھی

بھڑک تھی آنکھوں میں بجھتے ہوئے دیے کی مثال
دمک لہو میں کسی اور کاروبار کی تھی

ہماری راہ میں حائل ہمارا ہونا تھا
ہمارے بیچ میں دیوار اختیار کی تھی

بہم تو تھے سبھی اسباب ڈوبنے کے ، ظفر
کہ دشت و در میں چمک آبِ انتظار کی تھی

☆

وہ پھول ہو کہ شرارہ ، اُدھر سے آتا ہے
ہمیشہ پہلا اِشارہ اُدھر سے آتا ہے

اِدھر سے موج مچلتی ہے اپنی مستی میں
برائے وصل کنارہ اُدھر سے آتا ہے

فسونِ خواب تماشا ہمارے حصّے کا
نہ آ سکے تو دوبارہ اُدھر سے آتا ہے

کبھی تو رات گئے صرف ٹوٹنے کے لیے
ہرا سا ایک سِتارہ اُدھر سے آتا ہے

جہاں پہ برف پگھلتی ہے روز شام کے بعد
ہماری موج کا دھارا اُدھر سے آتا ہے

جدھر ہیں اور بھی کچھ لوگ آج کل سرگرم
ہمیں خیال تمھارا اُدھر سے آتا ہے

ہے کاروبارِ محبت بہت ترقی پر
اِدھر سے نفع ، خسارہ اُدھر سے آتا ہے

جہاں کہیں کوئی دیوار تک نہیں ہوتی
کبھی کبھی تو سہارا اُدھر سے آتا ہے

ظفر ، یہ رنگ ، یہ رعنائیاں ، یہ رات ، یہ رزق
ابھی تو سارے کا سارا اُدھر سے آتا ہے

☆

بتاؤں کس طرح تصویر اُس کے عکسِ عُریاں کی
کہ جو اِک لہلہاتی لہر تھی خوشبوئے خنداں کی

کتابِ کُفر کا صفحہ کُھلا تھا سامنے سب کے
سُناتی تھی عجب افسانہ ''وہ'' اُس کے گریباں کی

بہت کچھ اور آڑے آ گیا اُس رات، اُس لمحے
ہوائے وصل میں جب ایک مُشکل میں نے آساں کی

کچھ اپنے آپ کُھلتی جائے گی تحریرِ تنہائی
ترا مضموں ہو تو فکر ہے پھر کس کو عنواں کی

محاذِ ناز پر جو اتنی خاموشی ہے کچھ دن سے
نہ ہو یہ آمد آمد ہی کسی ناگاہ طوفاں کی

بدن کی قید میں خوش ہوں کہ باہر بھی یہی کچھ ہے
وگرنہ توڑ بھی سکتا ہوں میں دیوار زنداں کی

سفر میں اس دفعہ رختِ سفر اپنے لیے خود ہوں
ضرورت ہی نہیں پیش آئی یکسر ساز و ساماں کی

مجھے دیکھو کہ میں اس ریت کے رازوں سے واقف ہوں
مری آنکھوں میں کیا اُڑتی نہیں حیرت بیاباں کی

ظفر، اک مشعلِ مہتاب گزری تھی کبھی دل سے
یہ شمعِ شعر میں نے جس کے شعلے سے فروزاں کی

☆

بار بار ابتر یہ حالت ہوتی رہنی چاہیے
مجھ سے اگر پوچھیں تو محبت ہوتی رہنی چاہیے

دیکھتے رہنا چاہیے اُس کے طور اطوار کہ یہ دُنیا
حیرت خانہ ہے، اور، حیرت ہوتی رہنی چاہیے

بے مقصد تو نہیں ہو سکتا یہ اندازِ تغافل بھی
اچھا ہے، مجھ پر یہ عنایت ہوتی رہنی چاہیے

امن و اماں ہی چاہیے دل کے نواح میں، لیکن کبھی کبھی
پھر بھی تھوڑی بہت شرارت ہوتی رہنی چاہیے

میری بزرگی کا ہی کوئی لحاظ اگر کر لیا کرو
میرے ساتھ اتنی تو رعایت ہوتی رہنی چاہیے

ہم ہی ادا کر سکتے ہیں یہ فرض، کہ ہے انمول بہت
حُسن تمھارا، اس کی حفاظت ہوتی رہنی چاہیے

دامن تھام لیا کرتے ہیں تمھارا سب کے سامنے ہم
اور، تمھیں ہم سے یہ شکایت ہوتی رہنی چاہیے

عشق ہی کر سکتے ہیں، اور تو کسی کام کے نہیں رہے
ہم ایسوں کی خاطر خدمت ہوتی رہنی چاہیے

دوستی ایک مکاں کی طرح ہوتی ہے سچ پوچھو تو، ظفر
گاہے بگاہے جس کی مرمت ہوتی رہنی چاہیے

☆

نہیں داؤ کوئی بھی کارگر، کسی چال میں نہیں آ رہا
مرے پانیوں میں تو ہے، مگر، مرے جال میں نہیں آ رہا

یہ جو طرفہ طرزِ طلسم ہے، کوئی ٹوٹتا ہوا جسم ہے
مرے بازوؤں میں سمٹ رہا ہے، خیال میں نہیں آ رہا

اُسے جا کے پوچھیے تو سہی کہ زمانہ ہو گیا، اور، وہ
کسی رنگ سے نہیں مل رہا، کسی حال میں نہیں آ رہا

کسی آنے والے کی اِس بہار میں ہوں گی اور نشانیاں
کہ وہ پہلے کی طرح اب ترے خدوخال میں نہیں آ رہا

مرے آس پاس جو رونقیں سی لگائے رکھتا ہے رات دن
کوئی ہے ضرور، مگر، وہ میری سنبھال میں نہیں آ رہا

کوئی خاص بات اگرچہ اُس میں کہیں نظر نہیں آئے گی
وُہی عام سا ہے، مگر، کسی بھی مثال میں نہیں آ رہا

ابھی اور کتنی نئی نویلی فضائیں ہیں مری منتظر
مگر، آج کل تو وہ زور ہی پروبال میں نہیں آ رہا

کہیں زورِ سیلِ سخن میں چاہیے اور ہی کسی ڈھنگ کا
یہ وہ چشمہ ہے جو کئی دنوں سے اُبال میں نہیں آ رہا

کسی دن ظفر یہاں کوئی تازہ تنازعہ ہی اُٹھایئے
کوئی گفتگو ہو، مزہ جواب و سوال میں نہیں آ رہا

☆

میں یہ سوچتا ہوں سوار کوئی غبار میں نہیں رہ گیا
کہ میں خود ہی آج کسی شمار و قطار میں نہیں رہ گیا

یہ زمانہ کس لیے ہے اُسی گُلِ گم شدہ کی تلاش میں
جو ہمارے اور تمھارے باغ و بہار میں نہیں رہ گیا

مجھے یاد ہے کوئی شدتیں، کوئی شورشیں تھیں چڑھاو پہ
کوئی بات ہے جو وہ زور و شور اُتار میں نہیں رہ گیا

کوئی خواب ہے جو پھسل گیا ہے کسی طرح مرے ہاتھ سے
کوئی ایک حصۂ عمر میرے حصار میں نہیں رہ گیا

یہ زمین و شمس و قمر کسی بڑے حادثے کے ہیں منتظر
مجھے لگ رہا ہے کوئی بھی اپنے مدار میں نہیں رہ گیا

مرے ساحلوں پہ جہاں تہاں کسی خامشی کا خُمار ہے
کوئی پار میں نہیں منتظر، کوئی آر میں نہیں رہ گیا

کوئی لوگ ہیں جو کسی حساب کتاب میں نہیں آ سکے
کوئی لفظ ہے جو کسی بھی شرح و شمار میں نہیں رہ گیا

یہ وہ عہد ہے کہ گراں رہے نہیں رنجِ دل پہ جدائی کے
یہ وہ عشق ہے کہ مزہ وہ بوس و کنار میں نہیں رہ گیا

میں چلا تھا، اور، کہیں پہنچ تو سکا نہیں ہوں، مگر ظفر
یہی کم ہے کیا جو کہیں پہ راہگزار میں نہیں رہ گیا

☆

سچ پوچھیے تو اپنی رسائی میں نہیں تھا
جو ذائقہ اس بار جدائی میں نہیں تھا

پوچھا گیا کچھ اور تھا، لکھا گیا کچھ اور
لگتا ہے ترا دھیان پڑھائی میں نہیں تھا

مطلوب رہا ہے جو خدا ہم کو شب و روز
موجود کہیں ساری خدائی میں نہیں تھا

دونوں ہی مزے ہم نے اُٹھا رکھے ہیں، لیکن
جو قید میں تھا تیری رہائی میں نہیں تھا

چپ رہ کے بھی نقصان ہی اپنا کیا ہم نے
کچھ فائدہ بھی حال دہائی میں نہیں تھا

ہلکان تو ہوتے ہی پھرے ہیں اسی خاطر
کچھ فرق مگر اپنی پرائی میں نہیں

اُس کو بھی نہیں تھی ابھی خیرات کی عادت
کچھ تجربہ اپنا بھی گدائی میں نہیں تھا

بدنام بھی ہو جاتے ہیں کچھ لفظ کم و بیش
اتنا بھی زیاں ورنہ بُرائی میں نہیں تھا

کچھ اپنی بُرائی پہ کمربستہ ہوں میں آپ
کچھ وہ بھی، ظفر، میری بھلائی میں نہیں تھا

-☆-

کوئی عیش، کوئی نشاط اب مرے نام کا نہیں رہ گیا
اُسے مجھ سے کام ہے، اور، میں کسی کام کا نہیں رہ گیا

یہاں پیش کرتے ہیں شربت اور شراب ایک ہی وقت میں
کہیں امتیاز کوئی حلال و حرام کا نہیں رہ گیا

وہ جو نامہ بر تھے سب اپنے اپنے معاملات میں پھنس گئے
کوئی بندوبست کہیں سلام و پیام کا نہیں رہ گیا

میں فضول ڈھونڈتا پھر رہا ہوں شب طلسم خیال میں
کہیں کوئی حصہ بچا کھچا مری شام کا نہیں رہ گیا

کئی دوسرے ہی گھروں میں شامل ابھی سے ہونے لگا ہے گھر
کوئی پارہ صحن کا لے گیا، کوئی بام کا نہیں رہ گیا

یہ بیان کرتا رہوں اگر، یہ زیاں ہی اتنا زیادہ ہے
کہ میں پختہ ہو کے جو اپنی خواہش خام کا نہیں رہ گیا

سبھی جانتے ہیں لطیفہ اک مرے ساتھ یہ بھی ہوا کہ میں
کسی خاص راہ پہ چل کے شارع عام کا نہیں رہ گیا

یہی روشنی، یہی رتجگے، یہی شد و مد، یہی شور و شر
مرے شہر پر کہیں سایہ ماہ تمام کا نہیں رہ گیا

یہ عروج ہے نہ زوال ہے، نہ خوشی ہے اور نہ ملال ہے
یہاں آ کے میں تو، ظفر، کسی بھی مقام کا نہیں رہ گیا

-☆-

رہے ہم آپ بھی ، اُس کو بھی قیل و قال میں رکھا
سو ، یہ کارِ محبت آنے والے سال میں رکھا

محبت مانگنے سے مل بھی سکتی تھی ہمیں ، لیکن
وہ جیسا بھی تھا اُس کو ہم نے اُس کے حال میں رکھا

کبھی بھاگے ، کبھی ٹہلے ، کبھی ٹھٹکے ، کبھی ٹھہرے
ہمیشہ ہی سے ہم نے فرق اپنی چال میں رکھا

اک ایسا کم نُما تھا ذکر جس کا داستاں میں ہم
کہیں تفصیل سے لائے ، کہیں اجمال میں رکھا

اب اُس کی یاد ایسے دامنِ دل چھوڑتی کب تھی
اُسے بھی بھولنے والی اُنھی اشکال میں رکھا

وہ قطرہ سا جو اُس کے وصل کی خواہش کا تھا باقی
اُسے بھی جا کے دل کے آخری پاتال میں رکھا

کبھی ہونا تھا دونوں کا جو چھٹکارا اسی صورت
سو ، خود کو ، اور ، اُسے بھی ایک ہی جنجال میں رکھا

چھپاتے بھی کہاں تک اُس کی بے معنی محبت کو
تو خود ہی لا کے سارا ماجرا پنڈال میں رکھا

اسے حل خود بھی کر سکتے تھے ، لیکن ، رائیگاں ہم نے
ظفر ، یہ مسئلہ اُس بزمِ بے احوال میں رکھا

☆

آنا جانا کہیں نہیں اپنا اب اور ، مگر ، دیکھو
اسی دشت کی پہنائی میں گُم ہے ایک سفر دیکھو

کبھی کبھار کی ایک جھلک پر بھی جینا ممکن ہے ، مگر
اور بھی دل ترسے گا جتنا اُسے تماشا بھر دیکھو

آنے والے کسی زمانے کا بھی ہو گا حال اس میں
مَیں تو بہت پڑھ چکا ، اخبار میں کوئی اور خبر دیکھو

باہر باہر ہی سارے منظر ہیں قابلِ دید یہاں
کئی اندھیرے چھا جائیں گے کبھی اگر اندر دیکھو

ایک بُری عادت ہے اپنی ، یا سب کچھ ، یا کچھ بھی نہیں
جیسے تیسے ہم بھی خوش ہیں ، تُم بھی اپنا گھر دیکھو

کوئی نہیں جگا سکتا اس خواب آلود محبت کو
مَیں تو بہت سر مار چکا ہوں ، تُم بھی کوشش کر دیکھو

اک تصویر میں ہی سو پیچ ہُوا کرتے ہیں سرتا سر
ایک بار دیکھا جس جانب ، اُسی طرف اکثر دیکھو

اپنے عیب ہی کھولتے رہنا خلقِ خدا پر شام و سحر
یہ بھی ایک ہنر ہوتا ہے ، یہ بھی ایک ہنر دیکھو

کچھ خفیہ پیغام ہُوا کرتے ہیں آنکھوں میں بھی ، ظفر
نیچے کا بھی کھل سکتا ہے بھید اگر اُوپر دیکھو

☆

دیر کا سویا ہُوا رنگ ہوا جاگ اُٹھا
خلق بیدار ہُوئی ، اور ، خدا جاگ اُٹھا

خواب میں کھوئی ہُوئی شام الگ اُٹھ بیٹھی
خُون میں ٹھہرا ہُوا شور جُدا جاگ اُٹھا

بہت اندر کہیں خُوشبوئے بدن تھی گُم صُم
کھولنے کھولنے میں عطرِ قبا جاگ اُٹھا

پُھول کھلنے لگے تاریکیِ دل میں ہر سُو
جادُوئے سلسلۂ صبح و صبا جاگ اُٹھا

اپنی غفلت سے ہی پھیلی ہے خبر ہر جانب
اپنی گرمی سے ہی نقشِ کفِ پا جاگ اُٹھا

موسموں کا بھی تعلّق ہے کوئی آپس میں
دیکھ کر دُور سے پیلے کو ہرا جاگ اُٹھا

اندر اندر کہیں زنجیرزنی ہونے لگی
زخم تھا کوئی پُرانا کہ نیا ، جاگ اُٹھا

جیسے نوبت ہی نہ آئی کبھی سو جانے کی
مَیں تو جس وقت کبھی سونے لگا ، جاگ اُٹھا

سب سے پہلے یہاں میری ہی کُھلی آنکھ ، ظفرؔ
چلو ، اچھے نہیں جاگے تو بُرا جاگ اُٹھا

☆

مانگا نہیں سہارا مَیں نے
بے شک اُسے پُکارا مَیں نے

دیکھا ہے ، اور ، کب دیکھا ہے
وہ سارے کا سارا مَیں نے

رہنا ہے دریا کے لگ بھگ
کرنا نہیں کنارہ مَیں نے

کام نِکالے ہیں سب اپنے
لے کر نام تُمھارا مَیں نے

کِیا ہے توبہ تائب ہو کر
کام وُہی دوبارہ مَیں نے

گھر کے پچھلے اندر جا کر
دُشمن کو للکارا مَیں نے

تب غازی کہلایا ہُوں ، جب
اپنے آپ کو مارا مَیں نے

وقت گزرنے سے پہلے ہی
اپنا وقت گزارا مَیں نے

پہلے آؤبھگت کروائی
اُس کو پھر دھتکارا مَیں نے

چل نکلا ہوں اور طرف کو
سمجھا نہیں اشارہ میں نے

کچھ نا کردہ گناہوں کا بھی
ادا کیا کفارہ میں نے

دل اور دنیا کا آپس میں
کیا ہے خود بٹوارا میں نے

چیرنے کو یہ بدن کی لکڑی
آپ لگایا آرا میں نے

بھانڈا اپنا چوراہے میں
کیا ہے پارہ پارہ میں نے

اپنے آپ کو وصل کا اُس کے
خوب لگایا لارا میں نے

سانپ کا دھوکا دے رکھا ہے
کھولا نہیں پٹارا میں نے

زہر بھی یہ مرنے کی خاطر
کہیں سے لیا اُدھارا میں نے

تنگ پڑا تو اپنے آپ کو
چھوڑ دیا آوارہ میں نے

جس خانے میں جا رکھا ہے
دل کا شوخ شرارہ میں نے

ٹکڑا تھا وہ زمیں کا جس کو
سمجھ لیا سیارہ میں نے

جسم ہی تھا کچھ ایسا جس کو
رکھا جان سے پیارا میں نے

نئی نئی طرزوں کی خاطر
توڑ دیا اکتارہ میں نے

عرشِ معلّٰی پہ جانے کو
کیا ہے تنگ طیارہ میں نے

بھاڑ جھونکنے کی خاطر ہے
رکھا ہوا بھٹیارا میں نے

معنی تو آتے نہیں، لیکن
باندھ لیا گلیارا میں نے

گھاس کھودتے کھودتے، اپنا
نام رکھا گھسیارا میں نے

ہلکا کیا ہے آگ دکھا کر
غزلوں کا پشتارہ میں نے

رکھتا ہے مشکوک ہی سب کچھ
کرنا نہیں ستارہ مَیں نے

بھاگا ہُوں ساتھ اُس کو لے کر
بگڑا کام سنوارا مَیں نے

دل کی مَلی سیاہی ساری
چہرہ اور نکھارا مَیں نے

آنکھیں کھلی ہوئی تھیں ، لیکن
دیکھا نہیں نظارہ مَیں نے

بھر کر ہوا غزل کے اندر
کر ڈالا ہے غُبارا مَیں نے

پاس نہیں آئی تو اُس کو
دُور سے ہی پچکارا مَیں نے

دیکھی نہیں ہے اُس سے بڑھ کر
اور کوئی مکّارہ مَیں نے

جا اُس کی دیوار پہ تھوپا
اپنا مٹی گارا مَیں نے

کہتا تھا کچھ رات گئے وہ
بھرا نہیں ہنکارا مَیں نے

جھوٹ بول کر تُرّت لگایا
اُس کو تھپّا تھارا مَیں نے

دشمن ہی عاشق تھا اُس کا
کیا مُعاف بچارہ مَیں نے

آخر کو نام اپنا لے کر
زور لگایا نعرہ مَیں نے

ڈال کے مرچ مسالے کتنے
کیا ہے شعر کرارا مَیں نے

کُرتی تک محدود رہا ہُوں
چھوا نہیں ہے غرارہ مَیں نے

فرضی ہیر تھی جس کی خاطر
چھوڑا تخت ہزارہ مَیں نے

کاروبار ہی تھا حیرت کا
جھیلا خُوب خسارہ مَیں نے

چھت نیچے تھی ، فرش تھا اُوپر
اُلٹا محل اُسارا مَیں نے

عشق سمیت کمرے سے آخر
سارا بوجھ اُتارا مَیں نے

کیا ہے خُون کے پیاسے کو ہی
اپنا راج دُلارا مَیں نے

کھلا ہی چھوڑ دیا تنگ آ کر
یہ نفسِ امّارہ مَیں نے

بس کی بُوند پڑی تھی جس کو
جانا امرت دھارا مَیں نے

جھوٹ کی بالادستی خاطر
قائم کیا ادارہ مَیں نے

ظلم کیا تسلیم ، اور ، اُس کا
توڑا نہیں اجارہ مَیں نے

پُورن تو موجود تھا ، لیکن
رہنے دیا اچھارہ مَیں نے

خُود ہی بغاوت کی ، اور ، اس پہ
کسی کو نہیں اُبھارا مَیں نے

وہ بھی ، ظفر ، بھٹکا بیٹھا ہوں
یہ بھی کیا گوارا مَیں نے

-☆-

یہ حضوری جو ہے ملی صاحب
مہربانی ہے آپ کی صاحب

میں اندھیرے میں ہی بہت خُوش تھا
نہیں اچھی یہ روشنی صاحب

آخری عمر میں کہیں وہ بھی
ایک توبہ ہی میں نے کی صاحب

کوئی پُرسانِ حال اور نہیں
آزمائش کی ہے گھڑی صاحب

کچھ بقایا ہی تھی جو مہلتِ عمر
مختصر تھی یہ دوستی صاحب

گریۂ صبح و شام سے ہٹ کر
تھی وہ برسات اور ہی صاحب

ہُوں میں خُود ہی گواہ اپنے خلاف
پھر بھی فرمایئے بری صاحب

آپ کی خُو ہے رحم فرمانا
ایک اُمید ہے یہی صاحب

کچھ سزا میں ، ظفر ، رعایت ہو
کم نہیں یہ نوید بھی صاحب

-☆-

دل کے لینے میں سلیم اُن کو نہیں ہے انکار
لیکن اس طرح کہ اقرار نہ سمجھا جائے
سلیم احمد

ہمدمِ دیرینہ

میاں محمد صدیق کامیانہ ایڈووکیٹ کے نام

دیوار کی دریچہ و در کے بغیر ہو
وہ نالہ کھینچیے کہ اثر کے بغیر ہو

پہلے سے مختلف بھی ہو، اور، ہو بھی ہُوبہُو
تکرار کوئی بارِ دگر کے بغیر ہو

سایہ وہ چاہیے ہے کہ ہو ابر کے سوا
دیوار کے علاوہ، شجر کے بغیر ہو

اِک واقعہ جو رات ہُوا شہر میں، ہمیں
معلوم بھی ہو، اور، خبر کے بغیر ہو

ایسی شکستِ شیشہ بھی درکار ہے کہ جو
ہر طرح کے زیان و ضرر کے بغیر ہو

گلشن ہو، اور، لالہ و گُل سے لدا پھندا
جنگل ہو، اور، خوف و خطر کے بغیر ہو

درپیش ہو کبھی تو ہمیں بھی کسی طرح
ایسا سفر کہ رنجِ سفر کے بغیر ہو

آسایش اِس طرح کی میسر ہو چند روز
جو گھر ہی جیسی ہو کے بھی گھر کے بغیر ہو

آئے، ظفر، بساطِ سخن ہو کبھی ہُوئی
اور، سارا کام عیب و ہنر کے بغیر ہو

☆

فارغ ہوں دل سے، اور، دُعا کے بغیر تھا
مَیں وہ کلیم ہوں جو عصا کے بغیر تھا

گُل پھول بے شمار تھے، اور، اس کے باوجود
یہ باغ شاید اپنی ہوا کے بغیر تھا

پانی برس رہا تھا بڑے زور و شور سے
اور، سارا آسمان گھٹا کے بغیر تھا

کچھ دل پہ اختیار ہمیں بھی نہ تھا، مگر
کچھ آپ بھی وہ بندِ قبا کے بغیر تھا

آئی ہُوئی تھی جیسے کسی اور شخص کی
مَیں مر رہا تھا، اور، قضا کے بغیر تھا

گھر میرا رہزنوں کا ہدف تھا، اگرچہ مَیں
سامان و ساز و برگ و نوا کے بغیر تھا

حق تو یہ ہے کہ میرا خُدا سے مُعاملہ
جیسا بھی تھا جزا و سزا کے بغیر تھا

اُس پر خُدا نے اپنے خزانے لُٹا دیے
وہ خطۂ زمیں جو خُدا کے بغیر تھا

برباد ایک دن اِسے ہونا ہی تھا، ظفر
یہ شہر جو کہ اہلِ وفا کے بغیر تھا

☆

رہتے نہیں زیادہ و کم کے بغیر تُم
تُم کے بغیر ہم ہیں نہ ہم کے بغیر تُم

یہ نغمہ بار بار ہے اپنا سُنا ہُوا
آؤ کبھی تو سازِ ستم کے بغیر تُم

کیسے گُزر گئے تھے ہمارے نواح سے
اِس بار خواب و خاک میں چمکے بغیر تُم

محفل تو سوگواری ہے، اس کے باوجود
اچھے لگے ہو غازۂ غم کے بغیر تُم

تُم پر تھا اعتبار ہمارا اُسی طرح
جب جا رہے تھے قول و قسم کے بغیر تُم

یہ مال اُس کی دین ہے، لیکن ہمیں کبھی
آئے نظر نہ اتنی رقم کے بغیر تُم

اِس حُسن کی زکوٰۃ بھی واجب ہے سر بسر
ملتے رہو جو دام و درم کے بغیر تُم

اخلاق بارے اپنا بھی رکھا کرو دُرست
آتے نہیں جو شعر میں ذم کے بغیر تُم

لگتا ہے آسمانِ سُخن سے یُونہی، ظفرؔ
تارا سا ٹوٹ جاؤ گے دمکے بغیر تُم

☆

چلتا ہے سلسلہ مَن و تُو کے بغیر کب
ہوتے ہیں کام جوشِ نمو کے بغیر کب

اِن خواہشوں کو دل سے نکالیں گے کس طرح
چلتے رہیں گے زندہ گُرُو کے بغیر کب

اپنی بھی شکل دیکھے زمانہ گُزر گیا
رہتے تھے ہم اُس آئنہ رُو کے بغیر کب

خالی خُمار بوسہ ہے سر کو چڑھا ہُوا
بنتی ہے بات جام و سبُو کے بغیر کب

نکلے گا سیرِ شہر کو کس دن ہمارے ساتھ
آئے گا اِس طرف وہ عدو کے بغیر کب

آنکھیں لہو بہاتی ہی رہتی ہیں رات دن
یہ زخم ٹھیک ہوں گے رفو کے بغیر کب

پھر پاک صاف ہو کے چلے ہیں برائے وصل
ہوتی ہے یہ نماز وضو کے بغیر کب

جاری ہے جُستجو کا سفر روز و شب، مگر
کھلتی ہے راہ میرے لہو کے بغیر کب

پانی بھی اِک بہانہ سہی، ورنہ اے ظفرؔ
مرتے تھے ہم کنارۂ جُو کے بغیر کب

☆

اس مسئلے کو دیکھنا حل کے بغیر کچھ
کرنا جو چاہتے ہو عمل کے بغیر کچھ

پامال راستوں سے جو بیزار ہو تو پھر
ہو گا یہاں نہ ردّوبدل کے بغیر کچھ

یہ صبر کا جو پیڑ ہے چھتنار اس قدر
درکار اس سے کچھ نہیں پھل کے بغیر کچھ

طے ہے کہ جامِ بوسہ ہمارے لیے نہیں
اور، ہاتھ آئے گا نہیں چھلکے بغیر کچھ

آنکھوں میں روشنی ہی نہیں آئے گی کبھی
دیوار و در سے شکل وہ جھلکے بغیر کچھ

اس رات کی سحر نہیں ہونے کی، جانِ من
شانوں سے آنچل اور بھی ڈھلکے بغیر کچھ

اُمّید و انتظار کی رونق اسی سے ہے
خوبی نہیں ہے آج میں کل کے بغیر کچھ

اپنے لیے نہیں ہے زمانے کی اہمیت
اس ایک ٹوٹتے ہوئے پل کے بغیر کچھ

شاید ہی رہ گیا ہو غزل میں تو اب، ظفرؔ
ان قافیوں کی گود اُچھل کے بغیر کچھ

-☆-

[illegible]
کب ڈوبتے ہیں موجۂ خوں کے بغیر ہم

عادت سی پڑ گئی ہے جدال و قتال کی
آرام سے ہیں امن و سکوں کے بغیر ہم

دیوار دستیاب نہیں ہے تو ناگہاں
چھت ڈالنے لگے ہیں ستوں کے بغیر ہم

چلتا ہے دُوسروں پہ زیادہ تو غم نہیں
زندہ ہیں اب بھی تیرے فسوں کے بغیر ہم

اُس ذاتِ پاک ہی کا تقاضا ہے، اُس کے پاس
جائیں گے اپنی ہستی دُوں کے بغیر ہم

کب تک گوارہ کرتے ہیں، اب دیکھنا ہے یہ
اس دشتِ دل میں جوشِ جنوں کے بغیر ہم

آخر کو اُس کی ساری شرائط بعینہٖ
مان آئے ہیں چگونہ و چوں کے بغیر ہم

خیرات ہے تو کیوں نہ کریں گے اُسے قبول
اندازۂ قلیل و فزوں کے بغیر ہم

اچھا لگا تو ساتھ ہی لے آئیں گے، ظفرؔ
کچھ فرقِ اندرون و بروں کے بغیر ہم

-☆-

اہلِ وطن ہی ہوں تو وطن کے بغیر ہوں
بلبل ہوں ، اور ، اپنے چمن کے بغیر ہوں

اُس دن سے مجھ میں جان ہی باقی نہیں رہی
جس روز سے تمھارے بدن کے بغیر ہوں

کیا پوچھتے ہو اب مری محرومیوں کا حال
مُدّت ہوئی کہ چال چلن کے بغیر ہوں

آپ اتنی احتیاط نہ بے شک روا رکھیں
کانٹا تو ہوں ضرور ، چبھن کے بغیر ہوں

فنکار میں ہی شہر میں مشہور ہو گیا
حال آں کہ ایک میں ہی تو فن کے بغیر ہوں

جیسا بھی ہوں میں ، بنتا بگڑتا ہوں خود بہ خود
اور ، ہر طرح کے جوڑ جتن کے بغیر ہوں

اِس قافلے میں اور سبک دوش کون ہے
میرے سوا کہ سازِ سخن کے بغیر ہوں

کچھ ہو نہ ہو ، مجھے کوئی دُبدھا نہیں کہ میں
ویسے بھی لاگ اور لگن کے بغیر ہوں

یُوں انتظارِ مرگ میں بیٹھا ہوں ، اے ظفر
دُولھا ہوں جیسے ، اور ، دُلھن کے بغیر ہوں

☆

بُرے پڑے ہوئے دن رات سے گزرتے ہوئے
پلٹ سکا نہ میں آفات سے گزرتے ہوئے

پہنچنے والا ہوں دشتِ جُدائی میں یک دم
میں اپنے خوابِ مُلاقات سے گزرتے ہوئے

مجھے خبر نہیں کس طرح تجھ تک آیا ہوں
میں کیسے کیسے مقامات سے گزرتے ہوئے

مجھے کہیں کہیں دُشواریاں بھی پیش آئیں
ترے خُمار و خیالات سے گزرتے ہوئے

مری بہارِ جوانی بھی لوٹ آئی ہے
ترے کِھلے ہوئے باغات سے گزرتے ہوئے

کبھی کبھی تو کسی کام کا نہیں رہتا
میں اپنی اُلجھی ہوئی ذات سے گزرتے ہوئے

وہ چھوڑ جاتا ہے پیچھے عجیب روشنیاں
کبھی کبھی مرے ذرّات سے گزرتے ہوئے

رُکا ہوں جا کے ترے آخری کنارے پہ
ٹھہر ٹھہر کے ، شروعات سے گزرتے ہوئے

جہاں تہاں کسی اعجاز کے فسوں میں رہا
ظفر ، میں اُس کی کرامات سے گزرتے ہوئے

☆

میں جتنی ستم و جور سے گزرتے ہوئے
گزر گیا تھا کسی طور سے، گزرتے ہوئے

اگرچہ تھی نہ وہاں بود و باش تو میری
میں آ گیا تھا کلانور سے گزرتے ہوئے

جو مجھ پہ بند ہوئی ایک رہگذر تھی، سو میں
نکل گیا تھا کہیں اور سے گزرتے ہوئے

کہیں گئے ہوئے تھے لوگ جن سے ملنا تھا
ملا نہیں کوئی بنگلور سے گزرتے ہوئے

ہمارے جیسے کہ جیتے ابھی یہاں کچھ دن
گزر گئے بھی، اس دور سے گزرتے ہوئے

ہمارے پیچھے ہو جیسے لگا ہوا کوئی
نکل گئے کہیں فی الفور سے گزرتے ہوئے

گرا ہوں پھر بھی کسی گہری کھائی میں جا کر
میں دیکھتا بھی رہا غور سے، گزرتے ہوئے

تمام اپنے علاقے میں ہی رہا یکسر
کبھی کبھار میں شاہ بھور سے گزرتے ہوئے

پڑا ہوا ہے ضروری ہی کوئی کام، ظفر
رکا ہوا ہوں جو لاہور سے گزرتے ہوئے

-☆-

ہوائے تند صفت چال سے گزرتے ہوئے
رکے نہیں تری تمثال سے گزرتے ہوئے

نجانے کیوں تری تفصیل تک بھی جا پہنچے
ہم ایک دم تیرے اجمال سے گزرتے ہوئے

دراصل تیرے خزانوں کی جستجو تھی ہمیں
نگار و نقش و خد و خال سے گزرتے ہوئے

میں دل ہی دل میں تو پھنسنا بھی چاہتا تھا وہاں
مثالِ آب ترے جال سے گزرتے ہوئے

یہ راستہ وہی دشوار ہے کہ ہم اس پہ
تھکے نہیں ہیں کئی سال سے گزرتے ہوئے

یہ آسمان زمیں دیکھتا ہے اور خوش ہے
انھی پرانے مہ و سال سے گزرتے ہوئے

نکل ہی جائیں گے اک دن تری محبت کے
گلے پڑے ہوئے جنجال سے گزرتے ہوئے

اک اور طرح کے احوال میں ہوئے داخل
اک اور طرح کے احوال سے گزرتے ہوئے

اندھیری رات میں خود بھی دمک رہا تھا بہت
ظفر، میں اس کے زر و مال سے گزرتے ہوئے

-☆-

سلوں بلا سی طوفان سے گزرتے ہوئے
میں زندہ ہو گیا ہوں جان سے گزرتے ہوئے

وہی ترا چمنستاں مری نظر میں رہا
ہمیشہ اپنے بیابان سے گزرتے ہوئے

کیا دھرا مرا اپنا ہی تھا ، اگر ہر بار
پڑی ہیں مشکلیں آسان سے گزرتے ہوئے

تھا کاروبار ہی اس طرح کا کہ میں اب تک
سنبھل سکا نہیں نقصان سے گزرتے ہوئے

ہزار طرح کا ہڑبونگ تھا مرے درپیش
ہزار طرح کے ہیجان سے گزرتے ہوئے

میں روکتا رہا اس کو ، رُکا نہیں لیکن
یہ ہاتھ اس کے گریبان سے گزرتے ہوئے

اِدھر سے روز گزرتے جو تھے بہت خوش خوش
لگے ہیں آج پریشان سے ، گزرتے ہوئے

چمک دکھاتی رہی کفر کی کرن شب بھر
مجھے عقیدہ و ایمان سے گزرتے ہوئے

گھر ایک بار تو خوشبو سے بھر گیا تھا ، ظفر
مہک رہا تھا وہ دالان سے گزرتے ہوئے

-☆-

ملیں گے آ کے مری خاک سے گزرتے ہوئے
جو رنگ ہیں تری پوشاک سے گزرتے ہوئے

خود اپنے آپ ہی الفاظ نرم خو ہوئے ہوں
مرے ہی لہجۂ بے باک سے گزرتے ہوئے

بجھا رہی ہے جو اک تشنگی سی ہونٹوں پہ
وہ چیز کیا ہے رگِ تاک سے گزرتے ہوئے

فضا بکھرتے ہوئے بعدِ برشگال کہیں
ہوا کہیں گلِ صد چاک سے گزرتے ہوئے

زمیں سے چاند ستاروں کو ہے طلب کس کی
پکارتے ہیں جو افلاک سے گزرتے ہوئے

اُڑے تو بھیگ بھی سکتا ہے ایک دم ترا عکس
ہمارے دیدۂ نمناک سے گزرتے ہوئے

ملے تمھیں وہاں اپنی بھی کوئی شے شاید
رُکو اگر مرے املاک سے گزرتے ہوئے

عجب نہیں ہے کبھی عاقبت سنوار ہی لو
جو حجرۂ ہوسِ پاک سے گزرتے ہوئے

ظفر، ملیں گے اسی طرح کے طلوع و غروب
تمھیں کہیں مرے آفاق سے گزرتے ہوئے

-☆-

کہیں کہیں روش و رنگ سے گزرتے ہوئے
کہیں تھے ہم فقط آہنگ سے گزرتے ہوئے

کھلی فضاؤں میں ہے جس کی بود و باش تمام
وہ خوش نہیں تھا دلِ تنگ سے گزرتے ہوئے

یہ رہگزار زمانہ ہے وہ کہ جس پہ ہم
نظر نہ آئے کبھی ڈھنگ سے گزرتے ہوئے

ہماری سادہ دلی اور ہو گئی محکم
کبھی کبھی ترے نیرنگ سے گزرتے ہوئے

وہ کام کرتا ہے الفاظ کا فسوں مرے ساتھ
کہ جھوم اٹھتا ہوں فرہنگ سے گزرتے ہوئے

ہے شرمسار بہت غسلِ آفتاب کے وقت
یہ روشنی ترے انگ انگ سے گزرتے ہوئے

پیام بھیجتی رہتی ہے خوشبوؤں کے یہاں
ہوائے گل کئی فرسنگ سے گزرتے ہوئے

وہاں پہ قبر ہے زندہ مجید امجد کی
سلام کرنا اُسے جھنگ سے گزرتے ہوئے

جو فاختائیں اڑاتے ہیں امن کی بھی ، ظفر
وہ ہم ہیں عرصۂ جنگ سے گزرتے ہوئے

-☆-



ہمت رہا ہوں بڑے داو سے گزرتے ہوئے
میں آپ اپنے ہی بکھراو سے گزرتے ہوئے

دوچند ہوتی گئی میری تشنگی ہر دم
اُس آب زار کے پھیلاو سے گزرتے ہوئے

نہ تھی اُمید تو ایسی ، مگر ، محبت میں
سُلجھ رہا ہوں اس اُلجھاو سے گزرتے ہوئے

بدن میں آگ تھی ایسی کہ آپ بھی کئی بار
جھلس گیا ہوں اسی تاو سے گزرتے ہوئے

پڑی ہے مہنگی یہ زورآزمائی آخرِ کار
ہوں پارہ پارہ اس اٹکاو سے گزرتے ہوئے

بہت کچھ اور بھی لائی تھی اپنے ساتھ ہوا
گلوں پہ عطر کے چھڑکاو سے گزرتے ہوئے

کچھ اور طرح کے چکر میں پھنسنے والا تھا
میں خواہشات کے گھیراو سے گزرتے ہوئے

ہوا ہوں پہلے بھی سو بار پارہ پارہ یہاں
میں ایک خواب کے ٹکراو سے گزرتے ہوئے

پتا چلا ہے مجھے اپنی حیثیت کا ، ظفر
بہت کچھ اپنے ہی برتاو سے گزرتے ہوئے

-☆-

پتا چلا کوئی گرداب سے گزرتے ہوئے
نہ بند ہوتے ہوئے باب سے گزرتے ہوئے

کہ یہ تو رکھتا پریشان ہی مجھے شب بھر
میں جاگ اُٹھا ہوں ترے خواب سے گزرتے ہوئے

میں اپنے دل کے اندھیروں کو یاد رکھتا ہوں
ترے بدن کی تب و تاب سے گزرتے ہوئے

ہوائے خوفِ خزاں میں لرزتا رہتا ہوں
کسی بھی وادیٔ شاداب سے گزرتے ہوئے

مجھے جو ملتی نہیں دشمنوں کی خیر خبر
تو پُوچھ لیتا ہوں احباب سے ، گزرتے ہوئے

زمیں پہ دیکھتا ہوں آب میں گلاب رواں
اور ، آسمان پہ سُرخاب سے ، گزرتے ہوئے

میں چھوڑ آیا ہوں پیچھے ہزارہا مینڈک
سخن سرائی کے تالاب سے گزرتے ہوئے

مجھے تو ایک بہانہ ہی چاہیے تھا فقط
کہ ڈوب جاؤں گا پایاب سے گزرتے ہوئے

کہاں چلی گئیں کر کے یہ توڑ پھوڑ ، ظفر
وہ بجلیاں مرے اعصاب سے گزرتے ہوئے

-☆-

ابھی یہاں ہوئی آرام سے گزرتے ہوئے
پتا چلے گا جو انجام سے گزرتے ہوئے

وہیں کا ہو کے نہ رہ جاؤں ، ڈر رہا ہوں کہ میں
جہاں رُکا تھا کسی کام سے ، گزرتے ہوئے

میں خاص بات بھی ممکن ہے کوئی کر جاؤں
اسی طرح روشِ عام سے گزرتے ہوئے

نکل کے گھر سے ذرا دیکھ تو سہی کہ یہ چاند
ٹھہر گیا ہے ترے بام سے ، گزرتے ہوئے

کہاں سے آئے ہیں یہ اتنے آدمی یک دم
میں دیکھتا ہوں جنھیں شام سے گزرتے ہوئے

اِک اور کوچۂ دُشنام کی طرف ہوں رواں
میں آج کوچۂ دُشنام سے گزرتے ہوئے

میں اپنے شور کا اندازہ کیا لگا سکتا
مچے ہوئے کسی کُہرام سے گزرتے ہوئے

چلو ، مجھے کسی قابل تو خلق نے سمجھا
میں خوش بہت ہوں اس الزام سے گزرتے ہوئے

میں نرم پڑتا گیا آپ رفتہ رفتہ ، ظفر
ہوائے سختیٔ ایام سے گزرتے ہوئے

-☆-

سہولت آئے گی دشوار سے گزرتے ہوئے
میں در بناؤں گا دیوار سے گزرتے ہوئے

مجھے یقین نہیں آ رہا کہ یہ میں تھا
کھڑا ہوں اپنے ہی آثار سے گزرتے ہوئے

زیادہ تر یہیں رہ جاؤں گا کہیں باقی
ابھی ترے گل و گلزار سے گزرتے ہوئے

میں جانتا ہوں پہنچنا ہے پھر تری جانب
اسی خرابیِ بسیار سے گزرتے ہوئے

عجائبات کی ہوتی ہے ایک دہشت بھی
میں ڈر گیا ترے اسرار سے گزرتے ہوئے

یہ وہ سفر ہے کہ جس نے تھکا دیا ہے بہت
پڑا ہوں خوابِ گرانبار سے گزرتے ہوئے

یہی بہت ہے تماشا سا اک دکھا جاؤں
شرار بن کے خس و خار سے گزرتے ہوئے

عجب نہیں جو مرے دشتِ دل کو یاد رکھے
یہ ابر وادی و کہسار سے گزرتے ہوئے

خریدنا نہیں، کچھ میں نے بیچنا ہے، ظفر
رکا ہوا ہوں جو بازار سے گزرتے ہوئے

☆

ستارہ وار گزرتا نہیں دکھائی دیا
جو ٹوٹ کر وہ بکھرتا نہیں دکھائی دیا

کبھی جو موت سے ڈرتا نہیں دکھائی دیا
کسی طرح سے بھی مرتا نہیں دکھائی دیا

جدا ہوئے تو کسی دور میں بھی مل نہ سکے
یہ زخم وہ ہے کہ بھرتا نہیں دکھائی دیا

اس آب زار تماشا میں ڈوب کر کوئی
کبھی کسی کو ابھرتا نہیں دکھائی دیا

یہ کوہسار فنا ہے عجب کہ جو اس پر
کبھی چڑھا تو اترتا نہیں دکھائی دیا

کبھی رکا تو چلا ہی نہیں یہ موجۂ خوں
اگر چلا تو ٹھہرتا نہیں دکھائی دیا

اگرچہ رہتی ہے مصروفیت بہت دل کو
یہ کوئی کام تو کرتا نہیں دکھائی دیا

جو ایک بار زمیں سے پھسل پڑا تو کبھی
قدم کہیں پہ بھی دھرتا نہیں دکھائی دیا

یہ حسن اس پہ کہاں سے امڈ پڑا ہے، ظفر
کبھی جو بنتا سنورتا نہیں دکھائی دیا

☆

وہ رنگ شور شبانہ نہیں دکھائی دیا
یہاں ہوا تو فسانہ نہیں دکھائی دیا

کہاں سے آتی ہے، اور کیا ہے بود و باش اس کی
کہیں ہوا کا ٹھکانا نہیں دکھائی دیا

گیا ہوں میں تو رکیں میرے ساتھ گھڑیاں بھی
سو، میرے بعد زمانہ نہیں دکھائی دیا

جہاں سے دوسروں پر سنگ اچھال سکتا میں
مجھے وہ آئنہ خانہ نہیں دکھائی دیا

بھٹک رہا تھا اندھیرے میں بوسہ لرزاں
بکھرتی زلف کو شانہ نہیں دکھائی دیا

شروع کر دیا فٹ پاتھ پر ہی بوس و کنار
قریب تھا، مجھے تھانہ نہیں دکھائی دیا

کسی کے ساتھ یہاں چار حرف پڑھنے کو
بھلا سا کوئی گھرانا نہیں دکھائی دیا

میں اس کے دام پہ ہی مرمٹا تھا، کیا بتلاؤں
کسی طرف مجھے دانہ نہیں دکھائی دیا

نکل گیا ہوں کہیں بچ بچا کے میں بھی، ظفر
اسے بھی اپنا نشانہ نہیں دکھائی دیا

-☆-

کوئی فسوں، کوئی جادو نہیں دکھائی دیا
کبھی وہاں تھے، مگر، تو نہیں دکھائی دیا

سفر میں اتنا اندھیرا تھا میرے چاروں طرف
کوئی شرر، کوئی جگنو نہیں دکھائی دیا

کسی کو باغ میں پریاں نہیں نظر آئیں
کسی کو دشت میں آہو نہیں دکھائی دیا

ہمارے دل میں تھا دریائے گریہ کا طوفاں
ہماری آنکھ میں آنسو نہیں دکھائی دیا

خمیدہ زلف کی جا کر بلائیں کیا لیجے
وہاں تو فرق سرِ مو نہیں دکھائی دیا

دکھائی دیتا رہا میرے ڈوبنے کا سماں
مگر، جہاں مرا بازو نہیں دکھائی دیا

بکار تھیں کوئی ایسی کٹار سی آنکھیں
کہ اس کے ہاتھ میں چاقو نہیں دکھائی دیا

کبھی تو اپنی جگہ پر نہیں تھا یہ دل ہی
کبھی وہ تیر ترازو نہیں دکھائی دیا

ظفر، یہاں بھی ہو سکتا کہ ساری دنیا میں
تمھاری طرح کا بدھو نہیں دکھائی دیا

-☆-

وہ چاند ، اور ، وہ ہالہ نہیں دکھائی دیا
کہیں بھی اُس کا حوالہ نہیں دکھائی دیا

نظر تو آ گئی کمزور سی کوئی خواہش
اُسے ہوس کا ہمالہ نہیں دکھائی دیا

رہی ہمارے بڑھاپے ہی پر نظر اُس کی
خود اپنا حُسن دوبالا نہیں دکھائی دیا

ترا فضول ہی دروازہ پیٹتے رہے ہم
لگا ہُوا ہمیں تالا نہیں دکھائی دیا

شب سفر یہی روشن رہا ، کسی کو ، مگر
ہمارے پانو کا چھالا نہیں دکھائی دیا

نظر پڑے نظر انداز کرنے والے ہی
ہمیں بھی دیکھنے والا نہیں دکھائی دیا

ہُوا خسارہ تو برداشت کر گئے ناچار
ہمیں جو اُس کا ازالہ نہیں دکھائی دیا

ہم ایک چیز سمجھتے رہے ہیں دونوں کو
کہ فرقِ نغمہ و نالہ نہیں دکھائی دیا

ہمیں اندھیرے کی عادت پڑی ہُوئی تھی ، ظفر
اسی لیے تو اُجالا نہیں دکھائی دیا

☆☆

یہی نہیں کہ کجاوہ نہیں دکھائی دیا
سو ، اُونٹ اس کے علاوہ نہیں دکھائی دیا

تمام دیکھا ہے اُس کا جواب دعویٰ ہی
مگر ، کہیں مرا دعویٰ نہیں دکھائی دیا

خلاف تھے مرے تھانے میں اور تو سب لوگ
مگر ، کہیں ترا باوا نہیں دکھائی دیا

ذرا ذرا سے جو نقصان تھے وہ سب دیکھے
بگڑ گیا تھا جو آوا نہیں دکھائی دیا

بھی اگرچہ مری تعزیت کو آئے تھے
مگر ، وہ شہر کا پاوا نہیں دکھائی دیا

پہنچ سکے نہ وہاں تک مرے اشارے بھی
مُجھے بھی اُس کا بُلاوا نہیں دکھائی دیا

ہماری عرض تمنا بُری لگی اُس کو
مگر ، رقیب کا دھاوا نہیں دکھائی دیا

مَیں دیکھتا رہا گھر بھر کو ناشتہ کرتے
مُجھے ہی اپنا پَراٹھا نہیں دکھائی دیا

ظفر نے جھوٹ سچ اپنا بھی کیا ظاہر
کہیں بھی کوئی دکھاوا نہیں دکھائی دیا

☆☆

ہمارے ہاتھ میں کاسہ نہیں دکھائی دیا
اُسے ہمارا اثاثہ نہیں دکھائی دیا

چلا گیا کوئی محفل سے جام بوسہ لیے
اُسے تو کوئی بھی پیاسا نہیں دکھائی دیا

جو پوتا اُس نے ہمارا کیا نظرانداز
ہمیں بھی اُس کا نواسہ نہیں دکھائی دیا

ہمارے حال پہ سب خندہ زن نظر آئے
جو دے رہا ہو دلاسا نہیں دکھائی دیا

ہم اپنی دُھن میں رہے مست، اور اس دوران
پلٹ گیا تھا جو پانسہ نہیں دکھائی دیا

نکل کے آیا تھا کس پارلر سے وہ، مُنہ پر
جو کوئی کیل مُہاسہ نہیں دکھائی دیا

بس اتنا فرق پڑا ہے کہ اُس لڑائی کے بعد
ہماری ناک میں بانسہ نہیں دکھائی دیا

بیان کی سبھی تفصیل تو ملی، لیکن
کہیں بھی کوئی خلاصہ نہیں دکھائی دیا

ظفر، فریب میں ہم آ گئے تو پھر ہم کو
جو دینے والا تھا جھانسا، نہیں دکھائی دیا

☆

کوئی اشارہ کنایہ نہیں دکھائی دیا
گیا ہے کوئی کہ آیا، نہیں دکھائی دیا

درخت ہی تری نظروں میں آ سکا نہ اگر
مجھے درخت کا سایہ نہیں دکھائی دیا

ذرا سا مجھ کو نظر آ گیا تھا جاتے ہُوئے
ہے کس طرح کا بقایا، نہیں دکھائی دیا

ہمارے سر پہ مصیبت کی جب گھڑی آئی
کوئی چچا، کوئی تایا نہیں دکھائی دیا

بسیں گزرتی ہوئی دیکھتے رہے، لیکن
ہمارے پاس کرایہ نہیں دکھائی دیا

کتابِ خواب کا ہم انتخاب کیا کرتے
جو کرنا چاہا تھا ضائع، نہیں دکھائی دیا

مسوّدات جو گُم ہو گئے، کہاں ملتے
کلام جو ہُوا شائع نہیں دکھائی دیا

رہے ہم ایک تمنائے وصل کو روتے
کیا جو اُس نے صفایا نہیں دکھائی دیا

جو چارپائی پہ ہم بیٹھنے لگے تو، ظفر
نکل گیا تھا جو پایہ نہیں دکھائی دیا

☆

سمجھ رہے ہیں کہ افلاک سے لگے ہوئے ہیں
شرر ہیں اور خس و خاشاک سے لگے ہوئے ہیں

ہماری شکل بدلتی ہے جیسے ہر لمحے
گھما رہا ہے کوئی ، چاک سے لگے ہوئے ہیں

پسِ غبار ہے کچھ اور بھی ، مگر فی الحال
ہجومِ خاک ہیں ، اور ، خاک سے لگے ہوئے ہیں

ہر آن جان لرزتی ہے ، دل دھڑکتا ہے
یہ ہم جو آپ کو بے باک سے لگے ہوئے ہیں

گھرے ہوئے ہیں شب و روز خود ہی نظروں میں
یہ ہم جو سب کو خطرناک سے لگے ہوئے ہیں

اب اس سے آگے عجائب ہیں اور بھی کیا کیا
ذرے ذرے تری پوشاک سے لگے ہوئے ہیں

جہاں تہاں تری جاگیر ہے ابھی ، اے دوست!
یہ شاملات جو املاک سے لگے ہوئے ہیں

ہماری سادہ دلی ہے ابھی وہی کی وہی
اگرچہ اُس بُتِ چالاک سے لگے ہوئے ہیں

ہم اپنے پیٹ سے ہی سوچتے ہیں ، جانِ ظفر
کہ تین وقت کی خوراک سے لگے ہوئے ہیں

☆

کوئی چلن ، کوئی چارہ نہیں دکھائی دیا
کچھ انتظام ہمارا نہیں دکھائی دیا

جو ایک بار دکھائی دیا تھا منظرِ خواب
مجھے کبھی وہ دوبارہ نہیں دکھائی دیا

گماں ہے یہ بھی کہ اُس نے کہیں کیا ہی نہ ہو
مجھے جو اُس کا اشارہ نہیں دکھائی دیا

عجب تو یہ ہے کہ مدّت ہوئی ہے اس دل پہ
کچھ اختیار ہمارا نہیں دکھائی دیا

وہ دیکھتا تھا بہُت غور سے ، مگر ، اُس کو
ہمارے غم کا غبارہ نہیں دکھائی دیا

کبھی چلے تو سمندر نظر سے تھا غائب
اگر رُکے تو کنارہ نہیں دکھائی دیا

پلٹ کے آئے تو سب تھے اُسی طرح موجود
مگر ، وہ جان سے پیارا نہیں دکھائی دیا

دکانِ شوق چلی ہی نہیں ، مگر ، اُس میں
ہمیں تو کوئی خسارہ نہیں دکھائی دیا

کبھی تو گم ہوا گرداب میں سفینہ ظفر
کبھی سفر کا ستارہ نہیں دکھائی دیا

☆

وُہی تھے جو کبھی انجیل سے لگے ہُوئے تھے
صلیب پر وہ کسی کیل سے لگے ہُوئے تھے

عجب نہ ہو گا کہ تکمیل کوئی اور کرے
جو ہم نئی کسی تشکیل سے لگے ہُوئے تھے

بیان میں بھی وضاحت چھپی ہُوئی تھی وہاں
کُچھ اشتہار بھی تفصیل سے لگے ہُوئے تھے

بچے کُھچے کئی بے سُدھ ، نڈھال پروانے
کسی بُجھی ہُوئی قندیل سے لگے ہُوئے تھے

ہمارا کام بگڑنے کے سارے اندازے
ہماری اپنی ہی تعجیل سے لگے ہُوئے تھے

ہوا تھی ٹھہری ہُوئی ، اور ، ابر کے ٹکڑے
کسی پہاڑ ، کسی جھیل سے لگے ہُوئے تھے

چلی ہوا تو ہوا ہو گئے ہیں ساتھ ہی ساتھ
جو دیکھنے میں گرانڈیل سے لگے ہُوئے تھے

اب اُن سے تُو ہی بتا ، بازپُرس کیا کی جائے
جو تیرے پیچھے تری ڈھیل سے لگے ہُوئے تھے

کہیں پہنچ ہی نہیں پا رہی تھی پھر بھی ، ظفرؔ
سب اک طرف اُسی ترسیل سے لگے ہُوئے تھے

☆

ہمارے ساتھ وہ مجبور سے لگے ہُوئے تھے
قریب سے نہ کہ دُور سے لگے ہُوئے تھے

مکانِ خواب جو تعمیر ہو رہا تھا ، سو ہم
وہیں کہیں کوئی مزدور سے لگے ہُوئے تھے

تو ، یُوں ہُوا کہ سراپا نیاز تھے آخر
وہ دیکھنے میں جو مغرور سے لگے ہُوئے تھے

ہم اُس سے دُور تو خُوش کیا ہی بیٹھتے آخر
کُچھ اُس کے بعد بھی رنجور سے لگے ہُوئے تھے

ٹٹولنے سے بھی کیا مُستعد نظر آتے
جو دیکھنے میں ہی معذور سے لگے ہُوئے تھے

جو جی میں آئی تو آزاد کر دیے خُود ہی
ہمارے دل میں جو محصُور سے لگے ہُوئے تھے

پھر اُن کا نام و نشاں ہی نہ تھا کہیں باقی
جو داستان میں مذکور سے لگے ہُوئے تھے

جنھوں نے مار گرایا ہمیں کراچی میں
وہ پیچھے اپنے جبل پُور سے لگے ہُوئے تھے

وہ دسترس میں ہماری کہیں نہیں تھے ، ظفرؔ
جو شاخ شاخ پہ انگور سے لگے ہُوئے تھے

☆

بظاہر آپ جو موجود سے لگے ہوئے ہوں
تو اصل میں کسی نابود سے لگے ہوئے ہوں

بندھی ہوئی کوئی پیٹیوں پہ ہو گھڑی سب کے
بدن کسے ہوئے بارود سے لگے ہوئے ہوں

جو میری بیخ کنی پہ کیے گئے [illegible]
وہی یہاں مری بہبود سے لگے ہوئے ہوں

جُڑا ہوا کہیں بے وقت سے ارادۂ جاں
کہیں پہ کوششِ بے سُود سے لگے ہوئے ہوں

ہٹے ہوئے خس و خاشاک خُوں سے خیمۂ خواب
کسی شبِ سحر آلود سے لگے ہوئے ہوں

درخت پہ کوئی تصویر سی سرِ دیوار
جگہ جگہ کوئی امرُود سے لگے ہوئے ہوں

سفر ہماری بکھرتی ہوئی محبت کے
پھر ایک جادۂ مسدُود سے لگے ہوئے ہوں

یہ ہو بھی سکتا ہے ، اپنے وُجود کے باوصف
کبھی ہم آپ کے موجود سے لگے ہوئے ہوں

ظفرؔ کو چھوڑ نہ پائیں خیال و خواب ترے
اور ، آج بھی اسی مردُود سے لگے ہوئے ہوں

☆

ہمارے دل پہ جو تاخیر سے لگے ہوئے ہیں
یہ زخم بھی تری شمشیر سے لگے ہوئے ہیں

اگرچہ تُو نے گرفتار تو نہیں کیا ہے
ترے اسیر ہیں ، زنجیر سے لگے ہوئے ہیں

مذاق بھی نہیں لگتا تمھارے ساتھ کہ ہم
بڑی سمجھ ، بڑی تدبیر سے لگے ہوئے ہیں

کھڑے ہیں دیر سے ، دستک بھی دے نہیں سکتے
برونِ در یونہی تصویر سے لگے ہوئے ہیں

جو کر سکے تو کبھی رہزنی ہی کر آ کر
کہ تیری راہ پہ رہگیر سے لگے ہوئے ہیں

مَیں جانتا ہوں کہ اس میں ترا قصور نہیں
جو لاحقے مری تقدیر سے لگے ہوئے ہیں

جو آزما رہا ہوں اُن پہ گفتگو کا ہنر
ابھی تو ساتھ وہ تقریر سے لگے ہوئے ہیں

شکار ہیں ، ترے فتراک انتظار کے ساتھ
بندھے ہوئے سے ہیں ، نخچیر سے لگے ہوئے ہیں

دُہائی ہے ، سخنِ سادہ کے بجائے ، ظفرؔ
جو پھندنے تری تحریر سے لگے ہوئے ہیں

☆

ظفر، کسی کے طلسمات سے لگے ہوئے ہو
کہ طرح طرح کے باغات سے لگے ہوئے ہو

یہ شاخ شاخ ہے میرے ہی سامنے سرکش
شجر ہو، اور، مرے ساتھ سے لگے ہوئے ہو

ابھی وصال کا طوفاں ہے راستے میں کہیں
ابھی تو اس کی شروعات سے لگے ہوئے ہو

مزہ تو جب ہے کسی کام سے لگے ہوتے
تم اس کے ساتھ کسی بات سے لگے ہوئے ہو

کچھ اس کے حسنِ گریزاں کا سحر ہے تم پر
کچھ اپنے شوقِ ملاقات سے لگے ہوئے ہو

دل اپنے ساتھ ہی رکھتے ہو یعنی کاسہ بدست
جہاں بھی جاتے ہو، خیرات سے لگے ہوئے ہو

یہ بات بھول نہ جایا کرو کہ آخر تم
یہاں کسی کی عنایات سے لگے ہوئے ہو

ندیدہ پن ہے تمھارا، اب اور کیا کہیے
کہ بھوک بھی نہیں، اور، بھات سے لگے ہوئے ہو

ظفر، نیا ہے زمانہ، نئی ہوا، اور، تم
انھی پرانے خیالات سے لگے ہوئے ہو

☆

یہی نہیں کہ خد و خال سے لگی ہوئی ہے
یہ آنکھ تیرے زر و مال سے لگی ہوئی ہے

مَیں راستے میں ہی گر جاؤں گا پھڑکتا ہُوا
یہ شرط میرے پر و بال سے لگی ہوئی ہے

یہ فیصلہ مرے حق میں کرے گی پنچایت
اُمید سی کوئی چوپال سے لگی ہوئی ہے

دل اُس کے حسن سے ڈرتا بھی ہے کہ یہ مچھلی
ابھی پھنسی تو نہیں جال سے لگی ہوئی ہے

یہ شہر وہ ہے کہ دیوار و در کی ہر اُمید
رُکے ہوئے کسی بھونچال سے لگی ہوئی ہے

دن اور رات کا سنگم ہے، اور کیا کہیے
یہی جو زُلف ترے گال سے لگی ہوئی ہے

یہ کاروبار خسارے پہ ہے ابھی جس میں
رقم ہماری کئی سال سے لگی ہوئی ہے

کھلا ہُوا تھا گُلِ بوسہ شام سے، جس کی
مہک ابھی مرے رُومال سے لگی ہوئی ہے

یہ شاعری نہیں، کچھ اور ہو تو ہو یکسر
جو اس کی ضد ظفر اقبال سے لگی ہوئی ہے

☆

یہ ہم جو سلسلۂ خواب سے لگے ہوئے ہیں
سو، ایک وادیِ شاداب سے لگے ہوئے ہیں

کچھ اس طرح کی ہے اپنی بھی ہستیِ موہوم
اسی لیے کسی نایاب سے لگے ہوئے ہیں

نگاہ میں ہے کوئی برف جو پگھلتی نہیں
جو بند رہتا ہے، اُس باب سے لگے ہوئے ہیں

ملے سُراغ کچھ اندر کے گھور اندھیروں کا
ہم اس لیے بھی تب و تاب سے لگے ہوئے ہیں

کہیں زمین ہماری نہ آسماں ہے کوئی
خسِ خیال ہیں، سیلاب سے لگے ہوئے ہیں

نماز ہی ہمیں آتی ہے اور، نہ کوئی دُعا
گناہگار ہیں، محراب سے لگے ہوئے ہیں

چُرا سکوں کہیں تھوڑا سا رنگ و بُو اُس کا
یہ میرے پیچھے جو سُرخاب سے لگے ہوئے ہیں

یہاں سفینہ ہمارا انہی میں خوش ہے بہت
ہمارے ساتھ جو گرداب سے لگے ہوئے ہیں

وہ خود ہی صاف نظر آنا چاہتے ہیں ظفر
جبھی تو چلمنِ مہتاب سے لگے ہوئے ہیں

☆

جو ماہتاب ترے بام سے لگا ہوا ہے
یہ لگ رہا ہے کسی کام سے لگا ہوا ہے

مَیں خود بھی اُس کو مٹانے کی جدوجہد میں ہوں
جو نقشِ ناب مرے نام سے لگا ہوا ہے

مچا ہوا ہے جو ہر سُو یہاں، سو، رُک رُک کر
مرا بھی شور اُسی کہرام سے لگا ہوا ہے

ہُوا نہیں کوئی آغاز بھی ابھی یکسر
مگر، یہ دل کہیں انجام سے لگا ہوا ہے

اسیر کرنے پہ راضی نہیں ہے تُو ہر چند
پرندہ خود ہی ترے دام سے لگا ہوا ہے

خیال و خواب میں اک گھر جو بن رہا تھا کہیں
بنا نہیں ہے، کوئی شام سے لگا ہوا ہے

جو تھا اِک اور ستارہ ہماری قسمت کا
اک اور گردشِ ایّام سے لگا ہوا ہے

مَیں خوش تو ہوں ترے پیغام سے بہت، لیکن
کچھ اور بھی ترے پیغام سے لگا ہوا ہے

ظفر ہُوا ہے جو اِک طرزِ خاص کا مُوجد
دراصل اُسی روشِ عام سے لگا ہوا ہے

☆

تری ہی دی ہوئی تکرار سے لگا ہوا ہوں
وہ کام جس پہ لگاتار سے لگا ہوا ہوں

میں جا اور آ نہیں سکتا کہیں کہ تُو نے مجھے
لگا دیا ہے ، سو ، دیوار سے لگا ہوا ہوں

جو آستانۂ دل پر پڑا ہوں مدت سے
اسی تمہارے طلبگار سے لگا ہوا ہوں

شرر نکلنے کو ہے میری خاک سے کسی وقت
جو خار و خس کے اس انبار سے لگا ہوا ہوں

مری نظر ہے کہیں دوسرے کنارے پہ
یہیں ہوں ، اور ، کسی پار سے لگا ہوا ہوں

اب اور اس کے علاوہ میں کر بھی کیا سکتا
سبک ہوں ، اور ، گرانبار سے لگا ہوا ہوں

ابھی نہیں مجھے فرصت کچھ اور کرنے کی
ابھی تو اپنے ہی آثار سے لگا ہوا ہوں

وہی جو ٹھیک پہنچتا نہیں کسی جانب
اُسی طریقۂ اظہار سے لگا ہوا ہوں

کسی ہوائے خزانی کا منتظر ہوں ، ظفر
میں برگ برگ جو اشجار سے لگا ہوا ہوں

-☆-

ہر شے آنی جانی کر
چال ذرا مستانی کر

چلتا رہے یہ خرچہ بھی
کہیں کوئی اُستانی کر

بکرے تو مہنگے ہیں بہت
مُرغی ہی قربانی کر

رونا عورتوں کا ہے کام
بات کوئی مردانی کر

کچھ تو نتیجہ نکلے گا
پانی میں ہی مدھانی کر

مُشکل میں ہوں پھنسا ہوا
تُو ہی کوئی آسانی کر

آبادی بھی کبھی ہو گی
جہاں تہاں ویرانی کر

اور مسائل بھی ہیں بہت
ختم یہ رام کہانی کر

کبھی ، ظفر ، گھر میں بھی بیٹھ
اتنی خاک نہ چھانی کر

-☆-

بیٹھا ڈنڈ مچائی کر
کچھ تو حال دُہائی کر

باپ سے اُس کے مار نہ کھا
آگے اُس کا بھائی کر

چھوڑا کر گُم صُم رہنا
کوئی بات بنائی کر

مِل جائے گا دفینہ بھی
تھوڑی بہُت کھدائی کر

ٹکڑے بھی اُڑا لینا
پہلے ذرا کمائی کر

دُوسروں سے مت باندھ اُمید
اپنی آپ بڑائی کر

پہلے اپنا کام نِکال
پھر اُس کی رُسوائی کر

بچ اُس کے شر سے بھی پھر
جس کے ساتھ بھلائی کر

آگے بڑھنا ہے تو ، ظفر
تھوڑی سی پسپائی کر

☆

ساری کی نوائی کر
بات ختم اور جاتی کر

نرم خُوئی سمجھے گا کون
لہجے کو جذباتی کر

وار ڈھال پہ روک نہیں
سامنے اپنی چھاتی کر

اُلٹے ہاتھ سے کر پیڑا
سیدھے ہاتھ چپاتی کر

دن کا کیا ہے چڑھے نہ چڑھے
سب کچھ رات براتی کر

کافی کچھ کر بیٹھا ہے
اور نہیں بدذاتی کر

ڈاکو ، چور ، اُٹھائی گیر
سب کو اپنا ساتھی کر

جھوٹ مُوٹ کا مینہ برسا
موسم کو برساتی کر

رنج زیادہ جھیل ، ظفر
کم کم خوش اوقاتی کر

☆

خدمت کوئی بتایا کر
حکم ہمیں فرمایا کر

اتنا دُور نہیں رہتے
کبھی تو پاس بٹھایا کر

مانتے ہیں سردار تجھے
اپنی ہمیں رعایا کر

ساتھ ہمارے بِل اور کِھل
اور ، ساتھ مُرجھایا کر

دل ہے گیلی ریت ، اسے
ڈھایا ، اور ، بنایا کر

کُھلی ہوائیں ہیں کیا کیا
تُو بھی پھرا پھرایا کر

رہ رہ کر مت مار ہمیں
ایک ہی بار صفایا کر

نئے بکھیڑوں کو اب چھوڑ
پہلے کام بتایا کر

گھر ہی بیٹھا رہ نہ ، ظفرؔ
باہر جایا آیا کر

☆

مُلکِ حُسن کا والی کر
رُتبہ اپنا عالی کر

باغ بغیچے کر تاراج
سبزے کی پامالی کر

پڑ سکتا ہے مجھ سے کام
بات نہ میری ٹالی کر

اور تُو کیا کر سکتا ہے
اُٹھ ، اور سیٹ ہی خالی کر

چاروں کھونٹ ملے گی بھیک
دونوں ہاتھ سوالی کر

سالا کچھ تو ڈالے گا
آگے آگے تھالی کر

آدھی گھر والی کو پھانس
لے ہی مرے تو سالی کر

سیرت کے چکّر سے نکل
صُورت دیکھی بھالی کر

پیٹ جہاں سے بھرا ہے ، ظفرؔ
بیٹھ کے وہیں جُگالی کر

☆

خوشبو کا ایک رنگ مچلتا ہے اور بس
پانی سا پانیوں میں اُچھلتا ہے اور بس

ہونے کو پھر سے رات کی گہری گپھا میں گم
دن اک ذرا سی دیر نکلتا ہے اور بس

رہوارِ وقت میری گھڑی سے بندھا ہُوا
رُکتا نہیں ہے ، چال بدلتا ہے اور بس

ٹھوکر کے ساتھ کب سے ہے یہ دل جُڑا ہُوا
گرنے کی خاطر اب بھی سنبھلتا ہے اور بس

یہ عشق تو نہیں ہے ، مگر ، اُس کو دیکھ کر
آنکھوں میں اِک چراغ سا جلتا ہے اور بس

یہ بھی نہیں اُمید کہ ڈس لے کبھی مجھے
اک سانپ آستین میں پلتا ہے اور بس

ہونٹوں سے دُور دُور ہی رہتا ہے رات دن
آنکھوں میں کوئی آ کے ٹہلتا ہے اور بس

اُس گھر میں بُود و باش تھی اپنی جہاں پہ اب
کھڑکی سے اک دُھواں سا نکلتا ہے اور بس

ہُوں اس سے فیضیاب ، ظفر ، مَیں نہ کوئی اور
چشمہ سا میرے دل میں اُبلتا ہے اور بس

☆

دل سے خیال سا وہ گزرتا ہے اور بس
آتا ہے ، تھوڑی دیر ٹھہرتا ہے اور بس

ہوتے ہیں اب تو وقت سے پہلے ہی سارے کام
لگتا نہیں ہے زخم کہ بھرتا ہے اور بس

درکار مجھ کو اتنا ہی رہتا ہے رات بھر
اک خواب سیڑھیوں سے اُترتا ہے اور بس

اس سبزہ گاہِ دل میں وہ آہوئے خوش خرام
چلتا ہے دو گھڑی ، کہیں چرتا ہے اور بس

یُوں ہے کہ دونوں ایک ہی دہشت میں ہیں کہیں
مَیں اُس سے ، اور ، مجھ سے وہ ڈرتا ہے اور بس

ہر صبح یُوں ہی رات سمٹتی ہے دُور دُور
ہر سُو غبار کوئی بکھرتا ہے اور بس

آتا ہے اُس کے پاس ، نہ جاتا ہے وہ کہیں
ہر شام یُوں ہی بنتا سنورتا ہے اور بس

روئیدگی نہیں کوئی بارش کے بعد بھی
چہرہ ہی اس زمیں کا نکھرتا ہے اور بس

ڈوبا ہُوں دیر کا ، ظفر ، اب تو کبھی کبھی
بازو ہی پانیوں سے اُبھرتا ہے اور بس

☆

چھٹتا ہے اور نہ کھل کے برستا ہے اور بس
بادل خود اپنے حال پہ ہنستا ہے اور بس

تو آخر ان سے ہو کے گزرتا ہے رات دن
آنکھیں نہیں ہیں، یہ ترا رستہ ہے اور بس

صحرا تھا، مستقل جسے آباد کر لیا
گھر تو برائے نام ہی بستا ہے اور بس

ہیں کرچیاں سی بکھری ہوئی دور دور تک
آنکھوں میں ایک خوابِ شکستہ ہے اور بس

احوال آسمان و زمیں کیا بتائیں ہم
رنگِ خراب و صورتِ خستہ ہے اور بس

دل کو خرید لو نیا ہوتا ہی جان کر
اچھا ہے، پائدار ہے، سستا ہے اور بس

نابود ہو کے رہتے ہیں دونوں ہی ایک ساتھ
اک خواب سا خیال میں دھنستا ہے اور بس

کچھ گُتھنگی کے اپنے مسائل ہیں، کیا بتائیں
اب شعر اس مشین میں پھنستا ہے اور بس

خوش بھی نہیں ہے اُس کی ملاقات سے ظفر
ملتا ہے، اور، مزید ترستا ہے اور بس

☆

دنیا میں آئے ہیں تو یہ دنیا ہے اور بس
ہر کام دو گھڑی کا تماشا ہے اور بس

اُس کو بھی کچھ پتا نہیں، میں بھی ہوں بے خبر
اتنے ہجوم میں اُسے دیکھا ہے اور بس

اتنی بھی مختصر نہ ہوئی تھی کبھی یہ شام
تارا سا آسمان پہ چمکا ہے اور بس

اب کے بھی رائیگاں ہی چلا جائے گا یونہی
یہ انتظامِ خاص دوبارہ ہے اور بس

سر پیر ہی نہیں کوئی اس کا کسی طرح
کہنے کو دل میں اُس کی تمنا ہے اور بس

حالات ہی یہاں کوئی باقی نہیں رہے
حالات ہی کا یہ بھی تقاضا ہے اور بس

جس طرح وہ بھی ایک نتیجے کا تھا عمل
یہ بھی کسی عمل کا نتیجہ ہے اور بس

اس میں نہ ڈوبنا ہے نہ کرنا ہے پار اسے
ایسا ہمارے سامنے دریا ہے اور بس

آیا نہیں ذرا بھی سمجھ میں ہمیں، ظفر
ہم نے یہ کھیل اتنا ہی سمجھا ہے اور بس

☆

وہ بھی زیادہ تر تو بقایا ہے اور بس
اپنا ہی بوجھ ہم نے اُٹھایا ہے اور بس

اِس دشت میں درخت نہ دیوار ہے کوئی
سر پر ہمارے اپنا ہی سایہ ہے اور بس

اُنگلی کسی کی تھام کے چلنا ہے اب ہمیں
سر میں کوئی خیال سمایا ہے اور بس

باقی ہے جس سے ہم نے مدد کی کوئی اُمید
اُس نے بھی راستا ہی دکھایا ہے اور بس

اظہار ہم بھی اِس سے زیادہ نہ کر سکے
تھوڑا سا ہاتھ اُس کا دبایا ہے اور بس

حاصل وصول اور تو کچھ بھی نہیں ہُوا
پاس اپنے واپسی کا کرایہ ہے اور بس

ناچار زندگی نے ہمیں بھی اسی طرح
دوچار دن رُلایا ہنسایا ہے اور بس

اُکتا گئے تھے جلد ہی کچھ اہلِ انجمن
قصّہ یہ تھوڑی دیر سُنایا ہے اور بس

جس پر نظر ہماری زمانوں سے ہے، ظفر
سمجھو تو وہ بھی مال پرایا ہے اور بس

☆

اس رات کی رگوں سے گزارا ہے اور بس
یہ خواب جو ہمارا تمہارا ہے اور بس

ضائع ہُوا ہے پہلے ہی کافی ہمارا وقت
تھوڑا سا انتظار دوبارہ ہے اور بس

ہوتی ہے ختم خوابِ محبت کی حد یہاں
آگے تو اس سے اپنا کنارہ ہے اور بس

اِس شام کا شمار نہیں اس سے بیشتر
مجھ سے یہ ہمکلام ستارہ ہے اور بس

دیکھیں تو اپنے خرمنِ خاشاک خواب میں
وہ لعلِ لب ہی ایک شرارہ ہے اور بس

اپنے حُدود سے بہت آگے بھی تھا وہ حُسن
سمجھے ہُوئے تھے ہم یہی سارا ہے اور بس

اس کے سوا ہمارا اثاثہ کوئی نہیں
لے دے کے اُس کے نام کا نعرہ ہے اور بس

آغاز تو نہیں ہے سفر کا ابھی کوئی
فی الحال مَیں نے اُس کو پکارا ہے اور بس

کوشش میں ہیں اُسی کو سمجھنے کی، اے ظفر
مُبہم سا ایک اُس کا اشارہ ہے اور بس

☆

رنگ ایک دوسرے میں ملاتا ہوں اور بس
یہ ایک خواب سا ہی دکھاتا ہوں اور بس

چیزیں نئی پرانی بہت ساری جوڑ کر
میں اک نئی سی چیز بناتا ہوں اور بس

افسانہ ہے وہی، مگر، اپنے بیان میں
ہر روز اُسے گھٹاتا بڑھاتا ہوں اور بس

دیوار پہ جو نقش ہے پہلے بنا ہوا
ایک اور نقش اُس پہ جماتا ہوں اور بس

کچھ اتنا دوسروں پہ نہیں مجھ کو اعتبار
اپنی ہنسی میں آپ اڑاتا ہوں اور بس

اس پر عمل کرے نہ کرے وہ، ہے اور بات
پٹی سی اُس کو روز پڑھاتا ہوں اور بس

مقصد فسادِ خلق تو ہرگز نہیں، کہ میں
پردہ سا درمیاں سے ہٹاتا ہوں اور بس

پلے کسی کے پڑ نہ سکے جو زیادہ تر
ایسی ہی کوئی بات بتاتا ہوں اور بس

دولت کدے تک اُس کے پہنچتا نہیں، ظفر
گھر سے تو اپنے روز ہی جاتا ہوں اور بس

☆

منظر کوئی ہوا کا دکھاتے ہیں اور بس
کچھ خواب سے خیال میں آتے ہیں اور بس

دریا ہے کوئی اپنے کناروں کے درمیاں
پانی ہیں، اور، شور مچاتے ہیں اور بس

کچھ لوگ پھر خبر نہیں ملتی کدھر گئے
اُس محفلِ نیاز میں آتے ہیں اور بس

لاتے ہیں اپنے ساتھ اندھیرا سا ایک چاند
جلتا ہوا چراغ بجھاتے ہیں اور بس

پھر یوں ہی چھوڑ دیتے ہیں بے گانگی کے ساتھ
اِک چیز دوسری سے بناتے ہیں اور بس

حالات کو خراب ہی کرتے ہیں جب بھی وہ
ٹوٹی ہوئی اُمید بندھاتے ہیں اور بس

کرتے ہیں بعض وقت وہ مایوس اِس طرح
سمجھو کہ حوصلہ ہی بڑھاتے ہیں اور بس

کیا کچھ اُدھیڑ اُکھیڑ کے دن رات ہر جگہ
ایسی ہی بستیاں سی بساتے ہیں اور بس

کچھ رنگ مجھ سے دور دمکتے ہوئے، ظفر
رہ رہ کے اپنے پاس بلاتے ہیں اور بس

☆

اپنے ہی آپ سے یہ جھگڑتی ہے اور بس
بن کر ہماری بات بگڑتی ہے اور بس

ہتھیار ڈال دیتی ہے پھر اُس کے سامنے
قسمت کہ تھوڑی دیر ہی لڑتی ہے اور بس

روتا ہے کوئی دیر تو سوتا ہے کوئی دیر
یہ رات اسی طرح سے بچھڑتی ہے اور بس

ہوتی ہے دو گھڑی جو ہوا کے ہدف پہ شام
پتا سا میرے سامنے جھڑتی ہے اور بس

جب نیند مجھ کو گھیرتی ہے، اُس سے پیشتر
اک خواب آسمان میں جڑتی ہے اور بس

اک لہر بار بار کنارے کے آس پاس
کرتی ہے زور، اور، پچھڑتی ہے اور بس

آتے ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں اس کے لوگ
بستی تو ساتھ ساتھ اُجڑتی ہے اور بس

رہتی ہیں چھوٹی چھوٹی شکایات آئے دن
آخر کو بات اسی طرح بڑھتی ہے اور بس

مَیں موت کے سفر پہ روانہ ہوں، اے ظفرؔ
یہ زندگی بھی راہ میں پڑتی ہے اور بس

-☆-

پانے سے پہلے ہی اُسے کھوتا ہوں اور بس
چادر سی تان کر کوئی سوتا ہوں اور بس

ممکن ہے کوئی نقش اُبھر آئے کسی طرح
دیوارِ شہر ہے جسے دھوتا ہوں اور بس

دونوں ہی کام کرتا ہوں، اور، خوش بھی ہوں مگر
ہنستا ہوں اور بس، کبھی روتا ہوں اور بس

دھاگا کہیں سے مل گیا ہے رات کا مجھے
مَیں اس میں آسماں کو پروتا ہوں اور بس

ممکن ہے کوئی چیز کہیں دستیاب ہو
پانی کو بار بار بلوتا ہوں اور بس

اُگتا ہے آدمی کہ پنپتا ہے کوئی پیڑ
اک بیج اس زمین میں بوتا ہوں اور بس

رٹتا ہوں اس نے بات سکھائی تھی جو مجھے
پنجرے میں حُسن کے کوئی توتا ہوں اور بس

سُنیے کچھ اور دیر، نمٹ جاؤں گا ابھی
قصہ بھی ہوں تو آپ ہی کوتہ ہوں اور بس

اب اس میں اختیار ہے میرا بھی کیا، ظفرؔ
ہوتا ہوں اور کبھی نہیں ہوتا ہوں اور بس

-☆-

ماسی کر یا مامی کر
اُٹھ ، اور ، کام تمامی کر

خوب آرام کیا ہے ، اب
تھوڑی بے آرامی کر

کوئی مخالف کر پیدا
کسی کو اپنا حامی کر

خوبی یہاں نہیں مطلوب
دُور کہیں یہ خامی کر

آزادی سے کام چلا
پہلے کہیں غلامی کر

دو نمبر ہو جا ، خود کو
نامی اور گرامی کر

شربت کو شہ زور بنا
حلوے کو بادامی کر

اُلٹا چکّر کوئی چلا
کامی کو ناکامی کر

خاص نہیں چلنے کا ، ظفرؔ
لہجہ ذرا عوامی کر

☆

کرنا ہے جو آپی کر
بعد میں آپا دھاپی کر

دل کو نیکی بھی سِکھلا
پہلے اس کو پاپی کر

یہ روشن چہرے بھی چوم
خالی دُھوپ نہ تاپی کر

مزے سے پوری رات گزار
دن بھر مُٹھی چاپی کر

دانشور میں بُھولے سے
کبھی غزل بھی چھاپی کر

قابلِ دید تو ہے ، لیکن
چھاتی کُچھ تو ڈھانپی کر

کُچھ مالش کام آئے گی
کُچھ فزیوتھیراپی کر

حق حلال کمائی تھی
مُکر گیا وہ کھا پی کر

چوم ، ظفرؔ ، موئے زہار
خالی ناف نہ ناپی کر

☆

پوری کر یا آدھی کر
بات کوئی بنیادی کر

خالی ہے دل کا یہ مکاں
آ ، اس میں آبادی کر

بوسہ تھا یہ ہوائی سا
اس کو ذرا سوادی کر

شعلہ جنگل جنگل پھینک
شورش وادی وادی کر

جاری کر اس کا شیڈول
مُلاقات میعادی کر

ہوئی نہیں اپنی تعمیر
جگہ جگہ بربادی کر

اور جو کوئی کام نہیں
آگے بڑھ اور شادی کر

کوئی شگوفہ چھوڑ ایسا
سارا شہر فسادی کر

بات کو اُلجھا نہیں ، ظفر
سیدھی ، ساد مُرادی کر

-☆-

تازی کر یا باسی کر
جلدی جان خلاصی کر

لہجہ اچھا نہیں ابھی
اسے ذرا مدراسی کر

پاس کبھی تو بیٹھ ذرا
ساری دُور اُداسی کر

فوٹو نہیں بنے گا ٹھیک
شکل ذرا اِکواسی کر

کُچھ آرام مجھے پہنچا
یہ تکلیف ذرا سی کر

نہیں گھرانا یہ اچھا
اس کو شام چوراسی کو

یہ ہر بات فروعی ہے
کوئی کام اساسی کر

پھر بخشش کی مانگ دُعا
پہلے خُود کو عاصی کر

منزل پانی ہے تو ، ظفر
کوشش کر ، اور ، خاصی کر

-☆-

ہو سکتا ہوں، کبابی کر
پہلے مجھے شرابی کر

وقت نہیں باقی اتنا
سارا کام شتابی کر

اصلی وصل کرا اب تو
اور نہیں بدخوابی کر

اوپر ہے سارا پرشاد
نیچے ذرا رکابی کر

کپڑے ہی دُھلوائے ہیں
پالش تو مُرگابی کر

ساتھ بہا لے جا سب کچھ
ملاقات سیلابی کر

چہرہ کھول کے باہر آ
موسم ذرا گلابی کر

ٹخنے تو دکھلا پورے
لہنگا ذرا وہابی کر

چھوڑ زبانی بات، ظفر
کوئی کام کتابی کر

☆

بہت کوشش میں تھا قرآن سارا
مگر، حاوی ہوا شیطان سارا

جھلنگا ہو گئی ہے چارپائی
نکلتا جا رہا ہے بان سارا

یقیناً ہے کسی گرگٹ کی اولاد
بدل سکتا ہے وہ ہر آن سارا

خبر ہونے دو اُس کے بھائیوں کو
ہرن ہو جائے گا رومان سارا

کسی کو کوئی پروا ہی نہیں تھی
ہوا میں اُڑ گیا فیضان سارا

کوئی آہٹ نہیں آئی ہے اب تک
اُدھر کو ہی لگا ہے کان سارا

برامد کچھ نہیں ہونا ہے، جس دن
کھلا باندھا ہوا پیمان سارا

جھلک دیکھی جو اُس رنگِ بدن کی
اُڑن چھو ہو گیا وجدان سارا

ظفر، ہونے نہ ہونے کا رہا فرق
ہوا سب کچھ اِسی دوران سارا

☆

اُٹھا کر عشق میں نقصان سارا
کِیا خُود اُس نے ہی بھگتان سارا

جدھر بھی ہم رہے پھرتے پھراتے
تُمھاری ہی طرف تھا دھیان سارا

محبت کا بس اک ٹکڑا بہُت ہے
اُٹھا سکتے نہیں احسان سارا

جہاں سوئے تھے اُس کے ساتھ اک رات
وہیں حاصل ہُوا نروان سارا

کمی کیوں وصل کی سازش میں رہ جائے
جو مقصد ہے عظیم الشان سارا

عداوت بھی ہے اُس کے ساتھ، لیکن
اُسی کی سمت ہے میلان سارا

ذرا خُوبی سے دیکھو تو چھپا ہے
ہمارے کُفر میں ایمان سارا

اِسے چھپوائیں بھی جا کر کہیں سے
اکٹھا ہو گیا ہذیان سارا

ظفر، کمرے میں کیسے روشنی ہو
اگر کھولو نہ روشندان سارا

☆

منافع لے گئے حیوان سارا
خسارے میں رہا انسان سارا

ہُوا دل خواہشوں پر خرچ آخر
یہ کھانا کھا گئے مہمان سارا

کوئی کرنے کی نیت ہی نہیں تھی
وگرنہ کام تھا آسان سارا

رعایا میں ہُوئی شورش کُچھ ایسی
دھرا ہی رہ گیا فرمان سارا

بیاباں میں بھی خاک اُڑتی نہیں تھی
پڑا تھا باغ بھی ویران سارا

کُچھ اِس انداز سے بدلا ہے موسم
ہوا سے بھر گیا دالان سارا

مَیں چوروں کی طرح ہوں سب سے آگے
مرے پیچھے ہے پاکستان سارا

بساند اب تک وہاں سے اُٹھ رہی ہے
جلایا بھی جہاں لوبان سارا

ظفر، جانے کی جلدی تھی کُچھ اِتنی
کہ پیچھے رہ گیا سامان سارا

☆

کریڈٹ لے گئے تاوان سارا
بدل کر رکھ دیا رُجحان سارا

کبھی بل تو لیا کر آتے جاتے
ابھی کہنا نہ بے شک مان سارا

کہیں غائب ہیں گھوڑا اور گھوڑی
تبھی سُونا پڑا ہے تھان سارا

خریدیں تو نہ شاید اک گرہ بھی
مگر، کھلوا لیا ہے تھان سارا

اسی کے ساتھ بھاگی شاہزادی
جو ذمّے دار تھا دربان سارا

غضب تھی خواہشوں کی بے لباسی
سڑک پر گر کے بکھرا بھان سارا

سنبھل کر بیٹھیے تھوڑا، کہ باہر
نکل آنے کو ہے پستان سارا

ابھی کیا پوچھنا اور چاٹنا ہے
ابھی مُنہ میں بھرا ہے پان سارا

کبھی مردان میں ڈھونڈا ظفر کو
کبھی مُلتان مارا چھان سارا

-☆-

یہ سر میں شور، یہ ہیجان سارا
تمھارا ہی تھا میری جان سارا

سُنا اُس نے تسلّی سے کئی بار
ہماری موت کا اعلان سارا

وہاں پر گھاس تک باقی نہیں ہے
پڑا تھا جس جگہ گھمسان سارا

کبھی جی چاہتا ہے وہ بدن باغ
ہمارا ہو کسی عنوان سارا

کسی دن ختم ہو سکتا ہے پل میں
اگر چاہو تو یہ بحران سارا

مکاں تھے کُونکُو خالی، اندھیرے
بظاہر شہر تھا سُنجان سارا

ذرا نکلو کھلے موسم میں باہر
ہوا ہو جائے گا ہیجان سارا

سراسر آپ تو معصوم ٹھہرے
مرے ہی سر لگا بہتان سارا

عجب ہوں گے، ظفر، پھل پھول اس کے
جو یہ پودا چڑھے پروان سارا

-☆-

نکلتا ہی نہیں ارمان سارا
تو کیوں خالی کروں میدان سارا

رہا خرمستیوں میں وہ بھی شامل
بھرا میں نے ، مگر ، تاوان سارا

شمار بوسہ کر لیتے ہیں پھر سے
کہ گڑبڑ ہو گیا میزان سارا

ہمارا لمس تھا اُوپر ہی اُوپر
مزہ تو لے گئی بنیان سارا

اکیلے کھیت کو تم رو رہے ہو
جلا بیٹھا ہوں میں کھلیان سارا

جہالت کُوٹ کر بھر دی غزل میں
کہیں باہر رہا عرفان سارا

اِسے کُوڑے پہ جا کر پھینک آؤ
اِسی قابل ہے یہ دیوان سارا

اِسے آباد کرنا چاہیے ہے
تُمھارا جسم ہے سنسان سارا

ظفر، کیسا ہے رنگِ بے وفائی
وہ چہرہ دیکھ اور پہچان سارا

-☆-

اگرچہ مجھ سے نہ دریافت ہو سکی دُنیا
مرے گمان میں ہے کوئی دُوسری دُنیا

کسی کے حق میں مرا فیصلہ تو ہو کوئی
کہ میرے سامنے دل ہے تو ہے کبھی دُنیا

یہ واقعہ ہے کہ مڈبھیڑ مجھ سے ہو نہ سکی
اگرچہ ٹھیک مرے راستے میں تھی دُنیا

کبھی کبھی تو مجھے یہ گماں گزرتا ہے
کہ ہو نہ ہو یہی دُنیا ہے آخری دُنیا

یہیں پہ ختم ہیں ساری حدیں زمانے کی
جو تجھ کو دیکھ لیا ہے تو دیکھ لی دُنیا

اگرچہ جمع تھے اسباب تو سبھی ، لیکن
نہ پھر بھی مجھ سے بنائی گئی نئی دُنیا

نہیں ہے ، پھر بھی تعلق ہے اُن کا آپس میں
درخت ، دائرے ، دالان ، دوستی ، دُنیا

کیا ہے صاف جو گرد و غبار بارش نے
سو ، لگ رہی ہے یہ کیسی دُھلی دُھلی دُنیا

بھلا مجھے کوئی افسوس کیوں نہیں ہے ، ظفر
مَیں جا رہا ہوں اگر چھوڑ کر بھری دُنیا

-☆-

جو مجھ سے پوچھتا کوئی تو ہے عجب دنیا
کہ میرے سامنے رہتی ہے روز و شب دنیا

اگرچہ میں بھی کہاں اس کو گھاس ڈالتا ہوں
اسی طرح ، مجھے گردانتی ہے کب دنیا

گزر رہا تھا اسی کشمکش میں عرصۂ عمر
کہ بہتری کی طرف لوٹتی ہے اب دنیا

میں جاؤں گا کہاں اس کی نگاہ سے بچ کر
برا بھلا مرا پہچانتی ہے سب دنیا

یہ خود بھی چین سے رہتی نہیں کسی لمحے
مجھے ہر آن جو رکھتی ہے مضطرب دنیا

اسی کی طرح کا میں ہو جاؤں گا جہاں ، جس وقت
کسی قدر مجھے راس آئے گی یہ تب دنیا

میں بے ادب ہوں تو ہوں شرمسار بھی اس پر
وگرنہ مجھ سے زیادہ ہے بے ادب دنیا

مری رگوں میں رواں ہے اگر اسی کا لہو
تو پوچھتی ہے مرا کیا حسب نسب دنیا

میں اس گھڑی سے ، ظفر ، اس کی خیر مانگتا ہوں
دراصل میرے مخالف ہوئی ہے جب دنیا

☆

جو کام اپنے ہیں اتنے ، نبیڑتی دنیا
نہ میں اسے نہ یہ مجھ کو سہیڑتی دنیا

کئی دریچے کہیں کھولتی بھی جاتی ہے
اگرچہ ہے کوئی دروازہ بھیڑتی دنیا

نکالتی ہے کسی چیز کو کہیں سے یہاں
کہیں کہیں پہ کوئی شے گھسیڑتی دنیا

جہاں میں اہلِ سماعت کو مست رکھتی ہے
قدم قدم کوئی نغمہ سا چھیڑتی دنیا

ہے شاخ شاخ کو پروان بھی چڑھاتی ہوئی
مرے درخت کو جڑ سے اکھیڑتی دنیا

مٹے ہوئے کو اجاگر بھی پھر سے کرتی ہوئی
بنے ہوئے کو دوبارہ ادھیڑتی دنیا

کہیں ملاتے ہوئے جھوٹ سچ کو آپس میں
کہیں برے کو بھلے سے نکھیڑتی دنیا

ہم آپ سے کوئی بدلہ نہ لے رہی ہو کہیں
ہمارا آپ کا دامن لبیڑتی دنیا

میں خود تو کرتا کراتا نہیں ہوں کچھ بھی ، ظفر
مری مشین کو ہے آپ گیڑتی دنیا

☆

جو میرے ساتھ کوئی دن گزارتی دنیا
تو کوئی اور ہی سا روپ دھارتی دنیا

ہمیشہ میں نے تو رکھا ہے اپنے کام سے کام
مجھی کو چھیڑتی ہے یہ شرارتی دنیا

جو اپنے آپ پہ اک جبر تھا مرا ہونا
تو سب سے پہلے مرا قرض اتارتی دنیا

یہ میں جو اس کو اٹھائے پھرا ہوں کاندھے پر
تو بوجھ میرا بھی کچھ دن سہارتی دنیا

کہاں سے آئی ہے آخر، یہ کیا ہے، اور کیوں ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آئی نکھارتی دنیا

کوئی سنے نہ سنے ، یاد کرتی رہتی ہے
مثالِ مرگ یہ ہر دم پکارتی دنیا

بنائی ہو گی کوئی بگڑی بات میں نے بھی
مجھے جو تھوڑا بہت ہی سدھارتی دنیا

ہمارے منہ کا بھی کچھ ذائقہ بدل جاتا
کبھی جو دال ہماری بگھارتی دنیا

یہ میں ہوں اس کے جو پاتال میں پڑا ہوں، ظفر
کسی بہانے مجھے بھی ابھارتی دنیا

☆

ابھی تو دیکھ سکا ہوں یہ سرسری دنیا
ستارہ وار تمہاری ڈری ڈری دنیا

خزاں نہ آئے گی اس پر کسی بھی موسم میں
اسی طرح سے رہے گی ہری بھری دنیا

مجھے اڑائے لیے پھر رہی ہے ساتھ اپنے
فضاؤں اور خلاؤں میں یہ پری دنیا

کچھ اس کے حسن کی وحشت بھی ہے سبب اس کا
بچائے رکھتی ہے دل میں جو تھرتھری دنیا

مجھے جو فکر نہیں اوڑھنے بچھونے کی
بچھی ہوئی ہے مرے فرش پر دری دنیا

کبھی میں اس کے بیاباں کا ایک ذرۂ خاک
کبھی یہی ہے مرے ہاتھ پر دھری دنیا

اسے جو یوں نظرانداز ہی کیے رکھا
مری نگاہ میں تھی کوئی دوسری دنیا

یہی بہت ہے کہ اس شور و شر کی حالت میں
جو سن رہی ہے یہ میری نواگری دنیا

سوال یہ ہے کہ تم خود ہو کس طرح کے، ظفر
نہیں یہ بات کہ کھوٹی ہے یا کھری دنیا

☆

کہاں مرے لیے گھر ڈھونڈتی پھرے دُنیا
مَیں خود ہی خانہ بدر ہوں تو کیا کرے دُنیا

وہاں بھی خلد سے نکلے، یہاں بھی خوار ہُوئے
کہ راس آئی ہمیں تو نہ وہ نہ یہ دُنیا

بنا کے اُس نے اگر اس کو چھوڑ دینا تھا
تو پھر بتائے، بنائی تھی کس لیے دُنیا

ہے دُوسروں کا بھی میرے ہی جتنا حق اس پر
سو، شرط یہ ہے کہ مُجھ سے اگر بچے دُنیا

وہ میری چور تھی، اور، مُجھ سے شرمسار بھی تھی
بہُت دِنوں میں ہُوئی میرے سامنے دُنیا

یہی بہُت ہے کہ لُطف و کرم تو کیا کرتی
جو میرے حال پہ ہی مُجھ کو چھوڑ دے دُنیا

اگر مَیں خُود نہیں رہتا تو مُجھ سے کیا مطلب
کہ میرے بعد رہے یا نہیں رہے دُنیا

مَیں اس کے ساتھ سفر میں ہُوں، اور، ڈرتا ہُوں
نہ راستے میں کہیں مُجھ سے بھاگ لے دُنیا

زیادہ امن میں ہو گی، ظفر، تُمھارے بغیر
کرم کرو گے اگر چھوڑ جاؤ گے دُنیا

☆

چھپی رہے گی کہاں تک، نہ یوں چھپا دُنیا
مجھے بھی ایک دن اپنی کبھی دکھا دُنیا

نکل چلو کہ یہ مُہلت بسا غنیمت ہے
کبھی کبھار تو دیتی ہے راستا دُنیا

یہ اور کُچھ نہیں، اس پر نہ سر کھپاؤ بہُت
ہمارے آپ کے ہونے کی ہے سزا دُنیا

وہ میرے پانو میں چکر ہی ڈالتا کوئی
کہ دُوسروں کی طرح مَیں بھی دیکھتا دُنیا

یہ وقت ہے کہ اسے اب سمیٹ لے کوئی
بکھر رہی ہے جو اس طرح جابجا دُنیا

کہیں پہ اور بھی دُنیائیں منتظر ہیں مری
رہائی دے، کہیں آگے سے تو ہٹا دُنیا

مَیں دُوسروں سے اگر مختلف ہُوں تھوڑا بہُت
تو میرے واسطے ہوتی کوئی جُدا دُنیا

مَیں اُس کو یاد دلاؤں گا ایک دن جا کر
بنا کے بُھول گیا ہے اگر خُدا دُنیا

بگڑ چُکا ہے مرے مُنہ کا ذائقہ ہی، ظفر
وگرنہ تھی نہ کبھی اتنی بے مزہ دُنیا

☆

کھڑی ہے اپنے کسی اعتبار پر دُنیا
کہ جیسے ہو کوئی اُڑتی سی اک خبر دُنیا

یہی ہے دیکھیے تو اس کی منزلِ مقصود
جو کرتی آئی ہے یہ آج تک سفر دُنیا

دراصل ہے کوئی عیبوں کی پوٹلی یکسر
دکھاتی رہتی ہے کیا کیا، مگر، ہنر دُنیا

یہ اپنے آپ بنی ہے کہ ہے بنائی گئی
یہ بھید کھول بھی سکتی ہے خلق پر دُنیا

مجھے فضول اُتارا گیا ہے دُنیا میں
رہے گی یُوں ہی مرے بعد بھی اگر دُنیا

یہ بڑھ گئی ہے زیادہ ہی کچھ ضرورت سے
جو ہو سکے کسی صُورت یہ مختصر دُنیا

مٹا بھی دیتا ہوں میں آپ دن نکلتے ہی
جو اُس کے ساتھ بناتا ہوں رات بھر دُنیا

جو سچ کہوں تو خُود اپنی تلاش ہے اس کو
شبانہ روز جو پھرتی ہے دربدر دُنیا

ظفر، بنی ہی نہیں میری اُس کے ساتھ کبھی
میں اُس طرف نہ ہُوا ہو گئی جدھر دُنیا

☆

عجب نہیں جو ابھی خواب ہے، ابھی دُنیا
کہ یہ نہیں تو کوئی اور ہے مری دُنیا

کوئی بھی چیز یہاں مستقل نہیں یکسر
مرے لہُو سے گزرتی ہے سرسری دُنیا

کہیں بھی جاؤں، کوئی خاک اُڑتی رہتی ہے
کبھی تو سلسلۂ وحشت ہے، کبھی دُنیا

اگر میں اپنے لیے کم سمجھتا ہوں اس کو
تو ہے ضرور کہیں کوئی اور بھی دُنیا

مَیں آپ اس کو بناتا خُود اپنی مرضی سے
مجھے قبُول نہیں یہ بنی ہوئی دُنیا

کُچھ اور زاویے بھی ہوں گے تیری دُنیا کے
مرے لیے تو وُہی لوگ ہیں، وُہی دُنیا

وہ جس کو ڈھونڈتا پھرتا ہوں ایک مدّت سے
اسی پُرانی کے اندر ہے وہ نئی دُنیا

جو اور کُچھ بھی نہیں کر سکا تو پھر مُجھ کو
اُٹھا کے دے گیا وہ یہ گری پڑی دُنیا

ظفر، کوئی اثر آتا ہے خوف سا مُجھ پر
مَیں دیکھتا ہوں جو اُس کی ڈری ڈری دُنیا

☆

کبھی کبھار جو ہوتی ہے ڈوبڈو دنیا
یہ اصل بھی نہیں، اور، ہے بھی ہوبہو دنیا

یہ واقعہ ہے کہ میں یوں ہی گھٹ کے مر جاؤں
سُنا کرے نہ اگر میری گفتگو دنیا

میں اس کے وسط میں ہوں ایک ذرّۂ نایاب
یہ ہے جو پھیلی ہوئی میرے چار سُو دنیا

یہ ایک بات ہی رکھتی ہے کیا مجھے ششدر
کہاں سے آئی ہے لے کر یہ رنگ و بُو دنیا

دکھائی دیتے ہیں مجھ کو تمام رنگ اس کے
اسی سبب سے مرے واسطے ہے تُو دنیا

کسی کے ہاتھ میں جیسے یہ ایک آئنہ ہے
جہاں بھی چاہیے ہوتی ہے رُوبرُو دنیا

میں جانتا ہوں کہ آیا جب اس کے گھیرے میں
سلوک مجھ سے کرے گی جو نرم خُو دنیا

یہ میری جان کی دشمن ہے کس لیے آخر
ہمیشہ چاٹتی ہے کیوں مرا لہو دنیا

میں ایک نشے میں رہتا ہوں صبح و شام، ظفر
قدح قدح مرا دل ہے، سبُو سبُو دنیا

☆

یہاں جو بکھری ہوئی ہے جہاں تہاں دنیا
کبھی زمیں ہے، کسی لمحے آسماں دنیا

پڑاو ڈالتی ہے رات کے بیاباں میں
تو صبح بن کے نکلتی ہے کارواں دنیا

نکل کے جا کہاں سکتا ہوں اس کے چنگل سے
جہاں بھی جاؤں گا موجود ہے وہاں دنیا

یہ بجلیوں سے اگر چار دن بچی رہ جائے
مرے لیے ہے یہی شاخِ آشیاں دنیا

میں صرف اپنی زباں بولتا ہوں، اور، خوش ہوں
عجب نہیں جو نہیں میری ہمزباں دنیا

چراغ سا جو بُجھا ہوں تو ہے یہی صورت
کہ چارسُو کوئی دم ہے دھواں دھواں دنیا

میں اس کی قدر نہیں کر رہا اسی خاطر
مجھے ملی ہوئی ہے محض رائگاں دنیا

گزارہ کرتا ہوں، جیسی بھی ہے یہ، ساتھ اس کے
کہ حق تو یہ ہے کہاں میں ہوں اور کہاں دنیا

میں اپنے آپ کو حیرت سے دیکھتا ہوں، ظفر
بدلتی رہتی ہے کیا کیا مرا بیاں دنیا

☆

خوشبوئے گل بدن جو مرے اردگرد ہے
ہے جیسے اک چمن جو مرے اردگرد ہے

باعث ہے نقشِ نغمہ و نَے کا شبانہ روز
بانسوں کا ایک بن جو مرے اردگرد ہے

اک یاد ہے سُلگتی ہُوئی دل کے درمیاں
اک یاس حلقہ زن جو مرے اردگرد ہے

دشمن اُمید کا ہے ، عدو انتظار کا
سارا یہ سوءِ ظن جو مرے اردگرد ہے

میرے سوا بھی اس میں کئی اور ہیں شریک
یہ سازشِ سخن جو مرے اردگرد ہے

جیسی بھی ہے یہ اس کو مرا دُور سے سلام
ہر کاوشِ کُہن جو مرے اردگرد ہے

کرتے ہیں میرے عیب نمایاں کچھ اور بھی
انبوہِ اہلِ فن جو مرے اردگرد ہے

بے سمت روشنی کا جھمیلا ہے ، اور ، مَیں
سُورج کرن کرن جو مرے اردگرد ہے

دیتا ہے امتیاز مُجھے سب میں ، اے ظفر
میرا یہ بطلہ پن جو مرے اردگرد ہے

☆

کیسے کرے اثر جو مرے اردگرد ہے
آتا نہیں نظر جو مرے اردگرد ہے

خود کو کبھی کبھار دکھاتا ہے کوئی خواب
دیتا ہے کچھ خبر جو مرے اردگرد ہے

اے کاش کوئی پیش کرے میرے ایک رات
اس کو لپیٹ کر جو مرے اردگرد ہے

کافی تھا مَیں ہی ، کس لیے پھیلا دیا گیا
سارا یہ خشک و تر جو مرے اردگرد ہے

پھیلا ہُوا ہے میرے اشارے پہ ہی یہاں
سب کچھ اِدھر اُدھر جو مرے اردگرد ہے

رکھتا ہے کاروبارِ محبت رواں دواں
یہ نفع و ضرر جو مرے اردگرد ہے

اندر ہی میرے ہوتی ہے محسوس کیوں مجھے
یہ شام سربسر جو مرے اردگرد ہے

دیتی تو ہے سُنائی مُجھے دل کی ہا و ہُو
یہ شور و شر ، مگر ، جو مرے اردگرد ہے

دراصل ایک عرصۂ کم عیب ہے ، ظفر
یہ ہالۂ ہنر جو مرے اردگرد ہے

☆

اتنی یہ ہاؤ ہو جو مرے اردگرد ہے
ہے شور آرزو جو مرے اردگرد ہے

مجھ سے نہیں ہے کوئی تعلق بھی اس کا خاص
یہ ساری گفتگو جو مرے اردگرد ہے

گھیرے میں ہی مجھے لیے رکھتا ہے رات دن
وہ عکسِ رُوبرُو جو مرے اردگرد ہے

مجھ کو کہیں دکھائی تو دے، سامنے تو ہو
یہ صبح و شام تُو جو مرے اردگرد ہے

اچھا ہی تھا اگر مرے اندر سے پھُوٹتی
یہ خواہشِ نمو جو مرے اردگرد ہے

ہر پیش رفت میں یہ رُکاوٹ بنی رہی
اب تک یہ گومگو جو مرے اردگرد ہے

کس کی تلاش میں یہ بھٹکتا ہے رات دن
ہے کیا وہ جستجو جو مرے اردگرد ہے

وہ آپ تو نہیں ہے کہیں میرے چاروں سمت
ہے کون ہُوبہُو جو مرے اردگرد ہے

میرا نہیں تو میرے ہی جیسوں کا ہے، ظفر
بکھرا ہُوا لہُو جو مرے اردگرد ہے

☆

یہ ہالۂ ہوس جو مرے اردگرد ہے
کافی ہے مجھ کو بس جو مرے اردگرد ہے

میں گھوم پھر بھی سکتا ہوں اس میں یہاں وہاں
پھیلا ہُوا قفس جو مرے اردگرد ہے

اطراف سے بہت مجھے رکھتا ہے بے نیاز
میرا یہ پیش و پس جو مرے اردگرد ہے

یہ بھی نہیں رہے گا، اسے بھی بھگت چلوں
ماحول اس برس جو مرے اردگرد ہے

مدّت ہوئی کہ باندھ چکی میرے ہاتھ پانو
اُس کی یہ دسترس جو مرے اردگرد ہے

میں مطمئن ہوں اپنے یمین و یسار سے
ہوتا ہے ٹس سے مس جو مرے اردگرد ہے

اس کو ہٹایئے نہیں، یہ ہے مری شناخت
سارا یہ خاروخس جو مرے اردگرد ہے

ظاہر ہے اس سے ناقۂ جاں کی روانگی
آوازۂ جرس جو مرے اردگرد ہے

مجھ کو یہاں سے چلنے ہی دیتا نہیں، ظفر
اُس کا یہ رنگ رس جو مرے اردگرد ہے

☆

گردش میں گم زمیں جو مرے اردگرد ہے
ہے خواب اوّلیں جو مرے اردگرد ہے

خوشبو بھری وہ تازگیاں ڈھونڈتا ہے دل
یہ وہ ہوا نہیں جو مرے اردگرد ہے

ہوں گی اسی فضا میں وہ اصواتِ گم شدہ
شاید یہیں کہیں جو مرے اردگرد ہے

دائم بدلتا رہتا ہے اس کا بھی رنگ رُوپ
اک حسرتِ حزیں جو مرے اردگرد ہے

کس چشمِ نازنیں کے ہیں پیرائے سربسر
یہ رنگِ سُرمگیں جو مرے اردگرد ہے

دیتا ہے اک خزاں کی خبر میرے چار سُو
اک خواب سا مکیں جو مرے اردگرد ہے

یہ تازہ واردانِ تماشا بھی خُوب ہیں
لیکن وہ جاگزیں جو مرے اردگرد ہے

دروازہ ہُوں کوئی اسی دیوارِ سخت کا
اُسری ہُوئی یہیں جو مرے اردگرد ہے

مُجھ سے پُوچھ کر تو نہیں کی گئی، ظفرؔ
تقسیمِ آن و ایں جو مرے اردگرد ہے

-☆-

سب کچھ بہم کروں جو مرے اردگرد ہے
اور، دیکھتا رہُوں جو مرے اردگرد ہے

مُجھ میں بچا ہی کیا ہے، اور، اب چاہتی ہے کیا
شامِ شکست یُوں جو مرے اردگرد ہے

منظر یہ مَیں نے پہلے تو دیکھے نہ تھے کبھی
یہ صبر اور سکُوں جو مرے اردگرد ہے

کُچھ میرا واسطہ ہی نہیں یُوں تو اس کے ساتھ
شامل بھی اس میں ہُوں جو مرے اردگرد ہے

حیران ہوتا رہتا ہُوں مَیں دیکھ دیکھ کر
اک فُرصت و فسُوں جو مرے اردگرد ہے

دل سے نکل کے پھیل گیا ہے جہاں تہاں
خواب و خمارِ خُوں جو مرے اردگرد ہے

لے جائے گی کہاں مُجھے مٹی کی یہ مہک
پہلے سے بھی فزوں جو مرے اردگرد ہے

میرے ہی جسم و جاں کا یہ حِصّہ ہے سربسر
کس طرح چھوڑ دُوں جو مرے اردگرد ہے

مُجھ کو تو کُچھ نظر ہی نہیں آ رہا، ظفرؔ
دیکھوں تو کُچھ کہوں جو مرے اردگرد ہے

-☆-

طومارِ بیش و کم جو مرے اردگرد ہے
کیسے ہُوا بہم جو مرے اردگرد ہے

آئے ہیں جیسے گھر سے پکڑنے کو آئے ہوں
یہ دستکِ ستم جو مرے اردگرد ہے

اپنی ہی میری سوچ کا پرتو ہو جس طرح
راہوں کا پیچ و خم جو مرے اردگرد ہے

میرا ہی جمگھٹا ہے مرے گھر کے باہر آج
یہ بھیڑ ایک دم جو مرے اردگرد ہے

پہلے بھی تھا، مگر، نظر آتا نہیں تھا صاف
پھیلا غبارِ غم جو مرے اردگرد ہے

تھا بھی اگر تو جیسے مرے پیش و پس میں تھا
اب یہ ہوا میں نم جو مرے اردگرد ہے

صورت بدل بدل کے جو آتے ہیں سامنے
صوفی ہیں یا صنم جو مرے اردگرد ہے

ہے نیند کا نشہ کہ ابھی جاگتا ہوں میں
لہروں کا زیر و بم جو مرے اردگرد ہے

جیسے بہت ہی دور سے آیا ہو، اے ظفر
یہ خوابِ خوش قدم جو مرے اردگرد ہے

☆

انبارِ این و آں جو مرے اردگرد ہے
لے جاؤں اب کہاں جو مرے اردگرد ہے

جاتا ہوں سانس لینے کی خاطر برونِ شہر
پھیلا ہوا دھواں جو مرے اردگرد ہے

کس طرح کی زمیں ہے جو ہے میرے آس پاس
کیسا ہے آسماں جو مرے اردگرد ہے

پینے کو ایک قطرہ نہیں اس میں دستیاب
یہ بحرِ بےکراں جو مرے اردگرد ہے

اپنی ہی میری شامتِ اعمال ہے تمام
جو کچھ بھی ہے یہاں، جو مرے اردگرد ہے

آرام سے یہ بیٹھنے دیتی نہیں مجھے
اک حسرتِ بیاں جو مرے اردگرد ہے

جیسے کہ اس کو اوڑھ کے بیٹھا ہوا ہوں میں
یہ مختصر مکاں جو مرے اردگرد ہے

آیندگاں کا عکس بھی ہے اُس کے درمیاں
وہ رنجِ رفتگاں جو مرے اردگرد ہے

اک شامِ شیشہ جو مرے اندر ہے، اے ظفر
اک شہرِ بے اماں جو مرے اردگرد ہے

☆

تاریک روشنی جو مرے اردگرد ہے
کیا ہے یہ زندگی جو مرے اردگرد ہے

تصویر کیا ہو کل ، مجھے اس سے غرض نہیں
منظر تو ہے ابھی جو مرے اردگرد ہے

کیا ہوگا اس کے بعد یہ سب جانتا ہوں میں
دو دن کی چاندنی جو مرے اردگرد ہے

سچ پوچھیے تو اس کا نشانہ ہے میرا گھر
یہ آگ لگ رہی جو مرے اردگرد ہے

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ بیش و کم
میں آپ ہوں وہی جو مرے اردگرد ہے

ملتی ہے اس کو اب مرے اندر سے ہی سزا
یہ شور و شر بھی جو مرے اردگرد ہے

نیکی میں اور بدی میں تفاوت نہیں کوئی
ہے سب ملی جلی جو مرے اردگرد ہے

سمجھو تو اک بنائے عداوت ہے سرسری
یہ خواب دوستی جو مرے اردگرد ہے

بس کاٹتا ہوں گھاس تو میں آپ ہی ، ظفر
ہے اصل شاعری جو مرے اردگرد ہے

☆

ہلچل یہ جابجا جو مرے اردگرد ہے
ہے کون سی ہوا جو مرے اردگرد ہے

گنجائش ایک مور کی بھی شاید اس میں ہو
جنگل ہرا بھرا جو مرے اردگرد ہے

اچھی مجھے تو یہ بھی نہیں لگ رہی بہت
رونق سی یہ ذرا جو مرے اردگرد ہے

کب سے پڑا ہوں اس کے بکھرنے کا منتظر
یہ ایک خواب سا جو مرے اردگرد ہے

اس میں بھی کوئی شہر بسا لیں گے اہلِ زر
صحرا بچا کھچا جو مرے اردگرد ہے

دیتا رہا یہی مجھے ترغیب زندگی
یہ عرصۂ فنا جو مرے اردگرد ہے

سیارہ کوئی اور ہے آئی تھی جس سے یہ
ٹوٹی ہوئی صدا جو مرے اردگرد ہے

یہ بھی مرا فریب ہے شاید نیا کوئی
میلا سا اک لگا جو مرے اردگرد ہے

میں اس میں ڈوبنے کو ترس جاؤں گا ، ظفر
پانی کھڑا ہوا جو مرے اردگرد ہے

☆

نا آشنا ازل سے ، ابد کے بغیر ہے
ہستی ہواؤں کی کسی حد کے بغیر ہے

اس بار تو یہ عرضِ تمنا ، یقین کر
معصوم ، اور ، نیتِ بد کے بغیر ہے

گمراہ بھی ہوئے ہیں تو ہم اپنے آپ ہی
یہ کام بھی کسی کی مدد کے بغیر ہے

سیدھے منہ اُس کی بات ہی سُنتا نہیں کوئی
جو بھی یہاں پہ چوب و لگد کے بغیر ہے

کب تک چلایئے گا محبت کا یہ نظام
اتنی طلب ہے ، اور ، رسد کے بغیر ہے

تاثیر اسی کے شعر میں ہوتی ہے بیش و کم
جو عجز خُو ہے ، اور ، حسد کے بغیر ہے

واقع ہی اس طرح سے ہُوئے ہیں کہ اپنا آپ
ہر گاہ طول و عرضِ بلد کے بغیر ہے

ہم نے تو کچھ حساب ہی رکھا نہیں کبھی
ہے یا کسی شمار و عدد کے بغیر ہے

لاتے بھی ہم کہاں سے جواز اس کا ، اے ظفر
سارا کلام ہی جو سند کے بغیر ہے

☆

لالچ سے ماورا نہ گنہ کے بغیر تھے
اپنے تئیں جو شک و شبہ کے بغیر تھے

بزمِ ہوس میں اہلِ قناعت بھی تھے کئی
بیٹھے ہُوئے تھے ، اور ، جگہ کے بغیر تھے

آخر یہ کیوں ہُوا کہ بچے ہیں فقط وہی
وہ لوگ جو تُمھاری پنہ کے بغیر تھے

اُن کی خبر ہمیں بھی بہت دیر سے ہُوئی
الطاف تو جو اُس کی نگہ کے بغیر تھے

راتیں عجیب تھیں کہ ستاروں کے قافلے
گرد و غبار ہالۂ مہ کے بغیر تھے

ہونے لگے زیادہ سہولت سے طے وہی
جو فاصلے فراخیٔ رہ کے بغیر تھے

تھا اور بوسہ ہائے بدن کا وہ ذائقہ
جو ہر طرح کے ردّ و قدح کے بغیر تھے

اپنا بدن ہی ڈھال تھا اُن کے لیے وہاں
میدانِ جنگ میں جو زرہ کے بغیر تھے

آتا رہا ہمیشہ اُنہی میں مزہ ، ظفر
جو کام بھی اجازتِ شہ کے بغیر تھے

☆

معجز نمائی جسم کی جاں کے بغیر تھی
طاقت یہاں پہ تاب و تواں کے بغیر تھی

دل سے نکال دی تھی جو لب تشنہ آرزو
موجود تھی وہیں پہ جہاں کے بغیر تھی

اُس رُوئے خُوش نُما سے تعارف ہُوا تھا جب
رنگت سب اُس کی رنگِ جہاں کے بغیر تھی

اک رغبتِ عُمدہ تھی ہوس کی ہوا سے دُور
اک دعوتِ نماز اذاں کے بغیر تھی

اشجار کی قطار تھی دریا کے ساتھ ساتھ
اور ، زرد پوش خوفِ خزاں کے بغیر تھی

جب اُس کے ساتھ اپنی شراکت ہُوئی شروع
پہلے پہل تو سُود و زیاں کے بغیر تھی

اک شائبہ سا تھا کوئی خواب و خیال کا
ہستی ہماری نام و نشاں کے بغیر تھی

آخر یہی نتیجہ نکلتا تھا سربسر
صحبت ہماری اہلِ زباں کے بغیر تھی

چلتا تھا سارا کام اشاروں سے ہی ، ظفرؔ
جب شاعری زبان و بیاں کے بغیر تھی

☆

کوئی اقرار سا انکار کے آگے پیچھے
در کہیں تھا اسی دیوار کے آگے پیچھے

شام تک شور تو رہتا تھا پرندوں کا یہاں
اب ہوا بھی نہیں اشجار کے آگے پیچھے

مختصر کیوں نہ ہو یہ لمحہ نیرنگ نشاں
دھوپ ہے ابرِ گراں بار کے آگے پیچھے

زندگی موت سے اک فاصلے پر ہے بے شک
کشتیاں رہتی ہیں منجدھار کے آگے پیچھے

غور سے دیکھ سکیں تو نظر آئے شاید
اور بھی کُچھ مرے اطوار کے آگے پیچھے

کوئی شے اور بھی مطلوب تھی شاید ہم کو
ڈھونڈتے ہیں ابھی دیدار کے آگے پیچھے

یُوں تو وافر تھی مری ہمتِ دُشوار پسند
کئی کُہسار تھے کُہسار کے آگے پیچھے

مال کی بہتری پر کوئی توجہ ہی نہیں
محو ہوتے ہیں خریدار کے آگے پیچھے

خواب سی کوئی خرابی تھی ، ظفرؔ ، اس کے سوا
کُچھ نہیں تھا مرے آثار کے آگے پیچھے

☆

خامشی کیوں نہیں کہرام کے آگے پیچھے
نہ ہی آغاز ہے انجام کے آگے پیچھے

اب تو خود کو بھی سُجھائی نہیں دیتا ہے کہ ہے
گرد وہ گردشِ ایام کے آگے پیچھے

کچھ مُلاقات کی صُورت جو نکل سکتی ہو
وقت بے وقت کہیں شام کے آگے پیچھے

اُس نے بھی ہم کو گرفتار نہ کرنا چاہا
ہم بھی پھرتے رہے کچھ دام کے آگے پیچھے

کیسے موسم تھے وہاں چھائے ہُوئے ہر جانب
کیا ہوائیں تھیں گُل اندام کے آگے پیچھے

مِل بھی سکتا ہے کوئی وقفۂ آرام مگر
کُلفتیں ہیں بہت آرام کے آگے پیچھے

کُچھ سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ ہے اصل میں کیا
نام تھے اور بھی اُس نام کے آگے پیچھے

کبھی مُہلت ہی نہ دی کارِ محبت نے کوئی
کام ہی کام تھے جب کام کے آگے پیچھے

فاصلہ رکھ نہیں پائے کوئی اتنا بھی ، ظفر
کہ رہے ہم روشِ عام کے آگے پیچھے

مچھلیاں جیسے ہوں تالاب کے اندر باہر
خواب تھے اور کئی خواب کے اندر باہر

کیا یہاں سے کوئی ایمان سلامت لے جائے
اتنے بُت خانے ہیں محراب کے اندر باہر

ہم تو کچھ اور سمجھتے رہے خود کو ، لیکن
تذکرے اور ہیں احباب کے اندر باہر

دیکھ پایا نہیں میں اُس کو بھی جی بھر کے یہاں
تھا جو نظارہ مری تاب کے اندر باہر

کشمکش تھی کہیں دل اور دریچے کو محیط
امتحاں تھا کوئی اعصاب کے اندر باہر

زور پانی کا ہی تنہا نہیں دُور و نزدیک
شور میرا بھی ہے سیلاب کے اندر باہر

بے سبب تو کسی صُورت بھی تڑپتا نہیں دل
کچھ تو ہے پارۂ سیماب کے اندر باہر

کس کی پرچھائیں سی چمکی ہے نظر کے پس و پیش
کون ہے کھلتے ہُوئے باب کے اندر باہر

خط سے کیا آئے ، ظفر ، اُس کی محبت کا یقیں
شک ہیں بکھرے ہُوئے القاب کے اندر باہر

واہ کے ایک طرف، آہ کے اُتر دکھن
کیا مویشی ہیں چراگاہ کے اُتر دکھن

زندہ رکھے ہُوئے تھی ماں کی دُعا ہی اُس کو
ورنہ دُشمن تھے بہُت شاہ کے اُتر دکھن

یعنی تنخواہ تو اک نکتۂ موہُوم ہے اب
اصل تو مال ہے تنخواہ کے اُتر دکھن

کوئی تعریف بھی کرتا نہیں مطلب کے بغیر
غور سے دیکھیے مدّاح کے اُتر دکھن

اب جو پانی ہے تو خُود ناؤ کے اندر ہے کہیں
کوئی دریا نہیں ملاح کے اُتر دکھن

بات کُچھ ہو تو نکلتی ہے کسی جانب سے
سچ بھی ہو سکتا ہے افواہ کے اُتر دکھن

ان ہی اطراف میں ہے سیر تماشا ممکن
دیکھنا چاہییں سیاح کے اُتر دکھن

ایک ہی سمت میں مرتی ہے محبت ہر بار
کبھی ہو سکتے نہیں چاہ کے اُتر دکھن

ایک ہی راہ پہ چلنے پہ ہیں مجبور، ظفر
راستہ کوئی نہیں راہ کے اُتر دکھن

☆

جب سے خالی ہُوئے بھرپُور کے پُورب پچھم
خُود قریب آتے گئے دُور کے پُورب پچھم

وصل کی آب و ہوا پھیلتی ہے رات گئے
رفتہ رفتہ دلِ مہجُور کے پُورب پچھم

ایک ہی سمت سے ہے سِلسِلۂ نان و نمک
ہو بھی کیا سکتے ہیں مزدُور کے پُورب پچھم

وہ تو بوچھار محبت کی جدھر سے آ جائے
پُوچھتے کیا ہو شرابور کے پُورب پچھم

اپنی قسمت میں اگر ہے تو شتابی سے ملے
ہم نہ پُوچھیں گے کبھی حُور کے پُورب پچھم

اپنے اجداد ہی تھے اس کے ہوا کیا کہیے
ہم کو معلوم ہیں لنگُور کے پُورب پچھم

نام کی ہوتی ہے اپنی بھی جو تاثیر کوئی
تھیں صدائیں سی کھڑک پُور کے پُورب پچھم

خُود سے بنتی ہیں تصوّر ہی میں تصویریں سی
جلوے ہی جلوے ہیں مستُور کے پُورب پچھم

اُس کے در سے کہیں جا بھی نہیں سکتا ہے ظفر
اِتنے محدُود ہیں معذُور کے پُورب پچھم

☆

لے کے آ جائے گی پھر گھوم کے اندر باہر
بے سُراغی ہے جو معلوم کے اندر باہر

ایک جھلکی سی دکھا جاتی ہے اب بھی کسی وقت
زندگی خواہشِ مرحوم کے اندر باہر

دل کا خلیہ ہی بدلنے پہ ہُوئے تھے مامُور
جُرم چھپتے ہُوئے معصوم کے اندر باہر

مُدتیں ہو گئیں ، پانی نہیں اُترا اب تک
ابر برسا تھا کوئی ہُجوم کے اندر باہر

مل ہی جائے گا کہیں پر تو غُبارِ ہستی
ڈھونڈتا پھرتا ہُوں معدُوم کے اندر باہر

زاویہ ٹھیک نہیں اپنی نظر کا ، ورنہ
بھی موجود ہے موہُوم کے اندر باہر

ایک تُہمت ہے لگائی ہُوئی لوگوں کی فقط
کچھ نہیں لازم و ملزوم کے اندر باہر

آخرِ کار ہُوا سارا سُخن بے معنی
اتنے مفہوم تھے مفہوم کے اندر باہر

زردیاں چھائی ہیں رُخ پر جو اُداسی کی ، ظفر
سُرخرو ہوں گے اُسے چُوم کے اندر باہر

☆

خامشی جیسے کسی بات کے آلے دوالے
خواب ہے کوئی مری ذات کے آلے دوالے

اُس کے موسم رہے کچھ اپنی سمجھ سے باہر
باغ ہی باغ تھے باغات کے آلے دوالے

شُبہ سا ہے جو سنے اُس کے رویّے پہ مجھے
یعنی کیا کچھ ہے عنایات کے آلے دوالے

پھر بھی اک چیز چمکتی تھی کہیں رہ رہ کر
تھا اندھیرا مرے ذرّات کے آلے دوالے

یہ سیاہی نہ سفیدی ہے کسی طرح سے بھی
اور ہی کچھ ہے مری رات کے آلے دوالے

وہ بھی دن تھے کہیں سائل نہیں ملتا تھا ، اور ، اب
ہاتھ ہی ہاتھ ہیں خیرات کے آلے دوالے

ہے سبھی کچھ تو نظر کیوں نہیں آیا ، اور ، کیوں
قحط برپا ہے یہ بہتات کے آلے دوالے

ہے یہی وجہ کہ رُکتا ہی نہیں ہے پانی
کوئی برسات ہے برسات کے آلے دوالے

معرکے اپنے کچھ ایسی ہی طرح کے تھے ، ظفر
تھی ہزیمت بھی فتوحات کے آلے دوالے

☆

سب کچھ اس نے بھی کیا آن کے اوپر نیچے
رہا میں بھی کسی امکان کے اوپر نیچے

اس کہانی کا لگائے کوئی اندازہ تو کیا
درج کچھ بھی نہیں عنوان کے اوپر نیچے

نہیں پایا ہے کسی نے بھی کہیں اس کا سراغ
آئے ہیں خاک بہت چھان کے اوپر نیچے

اذن ہی آپ کی جانب سے نہیں ہے، اور، ہم
رائگاں ہوتے ہیں دربان کے اوپر نیچے

آفتاب اور زمیں پہلے تو ہوتے رہے خود
آج انھیں میں نے کیا جان کے اوپر نیچے

اوڑھ لیں گے کہ بچھائیں گے، غنیمت ہے یہی
ہو رہیں آپ کے احسان کے اوپر نیچے

ابتلا یہ بھی گزر جائے گی آخر اک دن
دن ہوا کرتے ہیں انسان کے اوپر نیچے

اس نے جو ترکِ مراسم کا کیا ہے اظہار
بات ہے اور اس اعلان کے اوپر نیچے

ورد کرتے ہوئے اس اسمِ گرامی کا، ظفر
ہو گئے ہیں اسی گردان کے اوپر نیچے

-☆-

عکس کیوں کر نہ ہو تصویر کے اوپر نیچے
سلسلے ہیں تری زنجیر کے، اوپر نیچے

ہم سے کچھ خوابِ سخن بھی رہا زورا زوری
اور، ہم بھی رہے تعبیر کے اوپر نیچے

دل کا احوال تو تھا دیر سے ہی زیر و زبر
اور، ہم بھی ہوئے تاخیر کے اوپر نیچے

دشمنوں سے تو میں بچتا رہا، لیکن، مجھ پر
کئی حملے ہوئے تقدیر کے، اوپر نیچے

دیومالاؤں میں رہتی ہے مری آمیزش
کبھی ہوتا ہوں اساطیر کے اوپر نیچے

بے خطا اب بھی نشانہ تو ہمارا تھا، مگر
ہوتے جاتے تھے ہدف تیر کے اوپر نیچے

کچھ بتدریج بڑھا دی گئی تاخیر بہت
کچھ اضافے ہوئے تعزیر کے اوپر نیچے

کچھ مطالب تو ہوئے آپ کی تشریح کی نذر
کچھ معانی ہوئے تفسیر کے اوپر نیچے

کلیاتِ اپنا بھی کیا ہم نے سجایا ہے، ظفر
غالب و میر تقی میر کے اوپر نیچے

-☆-

شعبدے تھے مرے اعجاز کے آس پاس
رنگ رکھے ہوئے تھے راز کے آس پاس

بکریاں شیر سے اٹکھیلیاں کرتی ہوئیں سب
قمریاں بیٹھی ہوئیں باز کے آس پاس

غدر تھا دائرۂ وصل کے اندر باہر
غل غپاڑا سا تگ و تاز کے آس پاس

سادگی اس کے رگ و پے میں رواں تھی، لیکن
تھے کئی رنگ ہر انداز کے آس پاس

خواب سا ہے کوئی، اور، وہ بھی پریشاں کیا کیا
اور کچھ بھی نہیں آغاز کے آس پاس

سخت اندھیرا تھا وہاں اس کے نشانات کے گرد
اور، کچھ روشنیاں بعض کے آس پاس

پر تو سب رہ گئے تھے کنج قفس میں ہی کہیں
صرف میں آپ تھا پرواز کے آس پاس

تتلیاں کرتی ہیں جس طرح سے پھولوں کا طواف
بوسے اڑتے ہیں لب ناز کے آس پاس

سخن سرخ کی جھلکاری سی ہر سمت، ظفر
آئنے سے مری آواز کے آس پاس

-☆-

لاکھ ڈھونڈا کیے بے سود کے دائیں بائیں
کچھ ملا ہی نہیں مفقود کے دائیں بائیں

کبھی ہونا یہاں مشروط نہ ہونے سے ہوا
رونقیں ہیں وہی نابود کے دائیں بائیں

رات بھر وہ مرے ذرّوں کا چمکنا ہر دم
دور تک سلسلۂ دود کے دائیں بائیں

اور تو کچھ کسی جانب سے نہ تھی گنجائش
پھیلتا جاتا ہوں محدود کے دائیں بائیں

خود تو میں آنکھ بچا کر نکل آیا ہوں، مگر
زندگی رہ گئی بارود کے دائیں بائیں

کھینچ ہی لائیں مجھے دور سے اپنی جانب
خوشبوئیں تھیں بہت امرود کے دائیں بائیں

میں جو حیران کھڑا تھا کہیں اثنائے سفر
راستے تھے کبھی مسدود کے دائیں بائیں

منتظر پہلے ہی سے جیسے کہیں گھات میں تھی
اک تباہی مری بہبود کے دائیں بائیں

دل سے اب آپ بھی میں بچ کے گزرتا ہوں، ظفر
کچھ بھی ہو سکتا ہے مردود کے دائیں بائیں

-☆-

اُلجھا ہُوا جو دل سے اُمنگ انتظار تھا
کیا سادگی میں رنگ برنگ انتظار تھا

خوشبو سی اُس کے آنے کی جس دم اُڑی خبر
حیران تھی اُمید تو دنگ انتظار تھا

پھیلا ہُوا جو طشتِ تصوّر تھا سامنے
کتنا کشادگی میں بھی تنگ انتظار تھا

کُچھ خوف کا خُمار بھی تھا شش جہات میں
جیسے دبا ہُوا تہِ سنگ انتظار تھا

وہ آئے گا تو ٹھیک، نہ آئے گا تو بھی ٹھیک
اس بار تو کُچھ ایسا ملنگ انتظار تھا

کیسی رواں تھی موج مسرّت گُھلی ڈُلی
اس طرح کا بھی تنگ دھڑنگ انتظار تھا

دم بھر میں سرسراتی ہُوئی آسماں کی سمت
ایسے تھا جیسے کوئی پتنگ انتظار تھا

جس کے سرے پہ تھی فقط اک روشنی کی بُوند
اس طرح کا سیاہ سُرنگ انتظار تھا

وہ رنگ تھے کہ کُچھ نظر آتا نہ تھا، ظفر
آئینۂ نگاہ پہ زنگ انتظار تھا

-☆-

میرا جواب تھا کہ سوال انتظار تھا
دیکھا تو ایک خواب و خیال انتظار تھا

دیکھا تو وہ ہوا و ہوس تھی عُروج کی
الفاظ میں جو زہر زوال انتظار تھا

بُجھتی ہوئی کہیں نفس و نغمہ آس تھی
مِٹتا ہُوا کوئی خدوخال انتظار تھا

نقشِ نظر تھے جال فضا میں بچھے ہُوئے
اُڑنے سے پیشتر پر و بال انتظار تھا

آنکھوں میں اُس کی عکسِ غبارِ آب و تاب تھی
چہرے پہ اُس کے گردِ ملال انتظار تھا

آنا نہیں تھا اُس نے تو یہ شور و شر تھا کیوں
سو طرح کا یہ ہجر و وصال انتظار تھا

اُس کے عجائبات رواں تھے مری طرف
اب کیا کہیں وہ کیا زر و مال انتظار تھا

ایک آرزو کا بوجھ تھا کاندھوں پہ روز و شب
اُوپر سے میرے سر پہ وبال انتظار تھا

اپنی بھی مَیں تو بُھولنے والا تھا، اے ظفر
کوّا تھا، اور، ہنس کی چال انتظار تھا

-☆-

کیا سُرخیاں تھیں ، کیسا گُلاب انتظار تھا
آنکھوں کے آئنوں میں جو خواب انتظار تھا

پانی کی آہٹیں تھیں گُماں در گُماں کہیں
حالاں کہ دُور دُور سراب انتظار تھا

دراصل اس قفس میں ہوا دیر تک رہی
ورنہ تو دیکھنے میں حباب انتظار تھا

دل کے سیاہ خانۂ تاریک تر میں بھی
اِک عُمر تک عجب تب و تاب انتظار تھا

نیّت میں کچھ فتور تھا ، ورنہ کسی طرح
ہم خُود خراب تھے نہ خراب انتظار تھا

اعداد وصل میں ہی کہیں جھول تھا کوئی
ورنہ تو ٹھیک ٹھاک حساب انتظار تھا

مَیں نے بھی صفحہ صفحہ لکھی تھی وہ داستاں
اُس کو بھی میری طرح کتاب انتظار تھا

سب کچھ بھلا دیا تھا محبت کی موج میں
مُشترکہ ہی گُناہ و ثواب انتظار تھا

اس کا کبھی پتا ہی نہیں چل سکا ، ظفر
میرا سوال تھا کہ جواب انتظار تھا

☆

سچ پوچھیے تو صبح سے شام انتظار تھا
آنکھوں میں خواب خواب دوام انتظار تھا

گھر انتظار گاہ گُماں تھا جہاں تہاں
ایسا ہی کوئی وہ در و بام انتظار تھا

کچھ شوق سے کیا تو کبھی بے دلی سے بھی
بیگار تھی کہیں ، کوئی کام انتظار تھا

اب کوئی اُس سے بچ کے نکلتا بھی کس طرح
پھیلا ہُوا جو راہ میں دام انتظار تھا

بزمِ صدا میں طرّۂ خاموش تھی اُمید
باغِ ہوا میں طرزِ خرام انتظار تھا

منصب مِلا تھا چشمِ براہی کا خاص کر
دربارِ دل میں ایک مقام انتظار تھا

نکلا نہیں تھا کوئی نتیجہ کسی بھی طور
بنتا تو سب پیام و سلام انتظار تھا

پردہ وہ جیسے اُٹھنے ہی والا ہو اب کہیں
اُس جلوہ گاہ خاص میں عام انتظار تھا

پہچان تھی اُسی سے مری سربسر ، ظفر
میرا نشان تھا ، مرا نام انتظار تھا

☆

ایسا وہ بے شمار و قطار انتظار تھا
پہلی ہی بار دُوسری بار انتظار تھا

خاموشیِ خزاں تھی چمن در چمن تمام
شاخ و شجر میں شورِ بہار انتظار تھا

دیکھا تو خلوتِ خس و خاشاکِ خواب میں
روشن کوئی چراغِ شرار انتظار تھا

باہر بھی گردِ اُمید کی اُڑتی تھی دُور دُور
اندر بھی چاروں سمت غبار انتظار تھا

پھیلے ہُوئے وہ گھاس کے تختے نہ تھے وہاں
دراصل ایک سِلسِلہ وار انتظار تھا

کوئی خبر تھی آمد و امکانِ صبح کی
اور، اُس کے اِردگرد حصار انتظار تھا

کس کے گمان میں تھے نئے موسموں کے رنگ
کس کا مرے سوا سروکار انتظار تھا

اُمڈا ہوا ہجومِ تماشا تھا دائیں بائیں
تنہا تھی آنکھیں، اور، ہزار انتظار تھا

چکّر تھا پانو میں کوئی شام و سحر، ظفر
اُوپر سے میرے سر پہ سوار انتظار تھا

-☆-

یُوں بھی نہیں کہ شام و سحر انتظار تھا
کہتے نہیں تھے مُنہ سے، مگر، انتظار تھا

مُدّت کے بعد پُھول کی صُورت کِھلا تھا دل
شبنم کی طرح تازہ و تر انتظار تھا

بالوں میں دُھول، پانو میں چھالے نہ تھے، مگر
پھر بھی کُچھ ایک رنجِ سفر انتظار تھا

کوئی خبر تھی اُس کی پرندوں کے شور میں
رنگِ ہوا میں شاخ و شجر انتظار تھا

یُوں تھی جواہراتِ لب و چشم کی جھلک
جیسے یہ کوئی لعل و گُہر انتظار تھا

دالان و در میں ایک توقّع تھی موج موج
دیوار و بام تھے کہ بھنور انتظار تھا

ایسے میں اعتبار کسی پر نہ تھا مجھے
تھا مَیں بھی ساتھ ساتھ، جدھر انتظار تھا

آنکھیں تھیں خشک خشک تو دل بھی تھا بند بند
کُھل ہی نہیں رہا تھا کدھر انتظار تھا

مایُوس ہونے والے نہ تھے ہم بھی، اے ظفر
آیا نہ وہ تو بارِ دگر انتظار تھا

-☆-

ہر وہم انتظار ، گمان انتظار تھا
جو ٹوٹتی نہیں تھی وہ تان انتظار تھا

ممکن تھا کچھ بھی ہونا یہاں پر کسی بھی وقت
سب ڈر رہے تھے ، اور ، ہر آن انتظار تھا

دھنستا گیا ہوں اپنے ہی اندر جو ایک دم
یہ کوئی آرزو کی اُٹھان انتظار تھا

بے وجہ ہی نماز محبت قضا ہُوئی
یُوں بھی نہیں کہ مجھ کو اذان انتظار تھا

سودے سلف سے ہاتھ مرا تنگ تھا بہت
دن رات میرے آگے دُکان انتظار تھا

بے وقت کی ہماری محبت تھی اس دفعہ
اور ، اس طرح سے اُس کا لگان انتظار تھا

دل میں جو دائرے سے بناتا رہا ہوں رات
کچھ اس کی وجہ سے بھی تکان انتظار تھا

وہ شیر شاعری نہیں گزرا ادھر سے پھر
آنکھیں تھیں اپنی ، اور ، مچان انتظار تھا

اتنا طویل عرصہ جو میں چپ رہا ، ظفر
سچ پُوچھیے تو مجھ کو زبان انتظار تھا

-☆-

جیسا عدوئے صبر و سکوں انتظار تھا
آنا نہیں تھا اُس نے تو کیوں انتظار تھا

کیسی پھڑک رہی تھی مری آنکھ صبح سے
اس وجہ سے اُمید تھی ، یُوں انتظار تھا

میں خود جُدا خراب ہُوا وہمِ وصل سے
اور ، میرے ساتھ خوار و زبوں انتظار تھا

پہلے جو انتظار اُٹھانا پڑا مجھے
اس مرتبہ تو اُس سے فزوں انتظار تھا

وہ قصرِ خواب جس میں بٹھایا گیا مجھے
اُس میں کوئی ستوں بہ ستوں انتظار تھا

شکلیں بدلنے والی تھیں چیزوں کی ہر طرف
اب کے جو انتظار فسوں انتظار تھا

پھیلا ہُوا دہکتے لرزتے نواح میں
دل میں نہیں تھا اس سے بروں انتظار تھا

اندر ہی اندر اس کی عجب کوئی کاٹ تھی
چلتا ہُوا جو خنجرِ خوں انتظار تھا

میں اُس سے ہو ہی سکتا نہیں تھا الگ ، ظفر
مجھ سے جُدا ہُوا وہ جنوں انتظار تھا

-☆-

موسم کی طرح چھایا ہُوا انتظار تھا
جیسے یہاں کی آب و ہوا انتظار تھا

اک طرف وشت و در کی رہی کیفیت وُہی
اک دھوپ چھانو تھی کہ سدا انتظار تھا

کھلتے نہیں تھے پُھول یہاں دیر دیر تک
جس طرح کوئی خوابِ صبا انتظار تھا

پھیلا ہُوا تھا یُوں تو بہُت کاروبارِ شوق
جو کُچھ ہمیں یہاں سے بچا ، انتظار تھا

اک شور سا لہُو میں رہا سارا سارا دن
جیسے وہ ایک صوت و صدا انتظار تھا

مایُوسیاں گُندھی ہُوئی اُمّید و دید میں
پہلے کے ساتھ ساتھ ہرا انتظار تھا

مُہلت شکو کے رہ گئی تھی اور مختصر
چھوٹی تھی شام ، اور ، بڑا انتظار تھا

اُس کے ورودِ ناز کے آثار ہی نہ تھے
اور ، کیا وہ اضطراب تھا ، کیا انتظار تھا

ایسا ہی خوش خرام خزاں تھا کوئی ، ظفرؔ
گلشن میں آب و رنگ نہ تھا انتظار تھا

-☆-

لینے کو یُوں تو سارا جہاں انتظار تھا
مَیں خُود جہاں نہیں تھا وہاں انتظار تھا

بس خواب میرے پاس تھے ، اُس کی خبر نہ تھی
کیسی تھی پیشوائی ، کہاں انتظار تھا

مایُوس ہو کے بیٹھ گئے تھے ہم اک طرف
رفتہ ہی رفتہ بعدازاں انتظار تھا

سڑکوں پہ کِھل رہے تھے لہُو کے گُلاب سے
ظاہر میں تو وہ امن و اماں انتظار تھا

سب کی ضرُورتیں تھیں ، مسائل تھے سب کے ہی
سارے گھروں میں پیر و جواں انتظار تھا

دالان و در ، دریچہ و دالان ، سقف و بام
لگتا تھا جیسے سارا مکاں انتظار تھا

دونوں میں کوئی فرق زیادہ نہیں تھا اب
روشن چراغ تھے تو دُھواں انتظار تھا

اک فاصلے کی فصل اُگائے ہوئے تھا وہ
خُود اور تھا کہیں وہ ، جہاں انتظار تھا

جس کو بیاں سمجھتے رہے عُمر بھر ، ظفرؔ
دیکھا تو ایک رنگِ بیاں انتظار تھا

-☆-

[illegible] انتظار مکان انتظار تھا
سچ پُوچھیے تو سارا جہان انتظار تھا

ہر چیز التوا میں رہی اس طرح کہ پھر
ہر وہم انتظار ، گمان انتظار تھا

سوئے ہُوؤں کو خواب دکھاتا ہوا کہیں
کھوئے ہُوؤں کو ایک امان انتظار تھا

جُرمانہ وفا تھا کبھی واجب الادا
اور ، اُس کے ساتھ ساتھ لگان انتظار تھا

سکّے جو لفظ کے تھے وہ کھوٹے ہُوئے تمام
اور ، شہر بھر میں سب کو ، زبان انتظار تھا

اپنی تو راہ دیکھتے گزری تمام عمر
آغاز ہی سے اپنی اُٹھان انتظار تھا

جنگل کا پیڑ پیڑ تھا خاموش ، دم بخود
گزرا نہیں تھا شیر ، مچان انتظار تھا

ہر سُو نماز فجر قضا ہونے والی تھی
اور ، شہر بھر میں سب کو اذان انتظار تھا

مَیں نے وہ بات روک رکھی تھی کہیں ، ظفر
اس طرح سے کہ میرا بیان انتظار تھا

☆

چڑھتی ہُوئی ندی سا رواں انتظار تھا
مَیں خُود وہاں نہیں تھا جہاں انتظار تھا

کس کا وُرود ہونے کو تھا بر سرِ زمیں
یہ بھی خبر نہیں تھی کہاں انتظار تھا

بوجھل تھا بیکلی سے دل اُس کا بھی اور ، کچھ
اپنے لیے بھی کاہشِ جاں انتظار تھا

اب کے بھلا بُھلا ہی رہا کاروبار شوق
اِک سرخوشی میں آہ و فغاں انتظار تھا

کوئی مُطابقت ہی نہ تھی درمیان میں
بُوڑھا تھا مَیں تو اور جواں انتظار تھا

ایک اور کیفیت کا تماشا تھا سربسر
دراصل تو یہاں نہ وہاں انتظار تھا

بیٹھے ہُوئے تھے لوگ بظاہر تو مطمئن
آنکھوں میں سب کی صاف عیاں انتظار تھا

بے تاب تھا نکلنے کو مَیں تیر کی مثال
جیسے کھنچی ہوئی وہ کماں انتظار تھا

آنا تھا جس نے ، یاد بھی اُس کو نہ تھا ، ظفر
تیاریاں تھیں ، اور ، یہاں انتظار تھا

☆

وہ عرض انتظار کہ طولِ انتظار تھا
بے فائدہ تھا ، اور ، فضول انتظار تھا

کانٹے تھے اور دھوپ کی دھجی نہ تھی کہیں
سوکھا سڑا سا کوئی ببول انتظار تھا

ہر سمت ایک طرزِ تامّل تھا روبرو
ہر بار ایک ردّ و قبول انتظار تھا

یاد آ رہا ہے کوئی بھلیکھا تھی آرزو
نادان تھا یہ دل ، کوئی بھول انتظار تھا

صبح و صبا کی کوئی توجّہ نہ تھی اِدھر
غنچہ سا بند ہی رہا ، پھول انتظار تھا

کچھ اور ہو گئی تھی جھلنگا سی چارپائی
کوئی غلط ٹھکی ہوئی چول انتظار تھا

فوجِ فلک میں اُس کا شمول انتظار تھا
دنیائے دیں پہ اُس کا نزول انتظار تھا

آنکھوں میں اک خلیجِ خدا انتظار تھی
سینوں میں ایک رازِ رسول انتظار تھا

سانسوں میں اک اُمیدِ سفر تھی کوئی ، ظفر
سر میں پڑی ہوئی کوئی دھول انتظار تھا

☆



رات کا رنگ ہے پانی جیسا
اور ، پانی ہے روانی جیسا

روز میں اس کو سنا دیتا ہوں
واقعہ کوئی کہانی جیسا

جسمِ پُرآب میں لکھا ہوا ہے
موسمِ خواب زبانی جیسا

دوستی کوئی نہیں اُس جیسی
اور ، ہے دشمنِ جانی جیسا

آج بازار میں بیٹھا ہوا تھا
پھر کوئی بھوت گرانی جیسا

ہے رہائش میں بھی پورا اب تو
ذائقہ نقل مکانی جیسا

کبھی آ جاتا ہے بھولے بھٹکے
ایک جھونکا سا جوانی جیسا

کچھ مرے حالِ پریشاں کی طرح
کچھ مری ہستیِ فانی جیسا

مل سکا کوئی نمونہ نہ ظفر
تیری آشفتہ بیانی جیسا

☆

بے وفا ، اور ، کمینہ جیسا
اہلِ دُنیا میں ہُوں دُنیا جیسا

کُھلتے جاتے ہیں ہُنر پانی کے
ڈوبتا جاتا ہُوں جیسا جیسا

ہے جو پوشیدہ ہر اک جانب سے
لگ رہا ہے وہ ہویدا کیسا

ہر طرف ہے وہی پانی کی چمک
میرا صحرا بھی ہے دریا جیسا

ڈوب مرنے کی نہیں گنجائش
ورنہ پانی تو ہے گہرا جیسا

ریت کا بوجھ ہے سینے پہ تمام
حوصلہ چاہیے صحرا جیسا

لوگ ہیں ، لفظ ہیں ، اور لمحے ہیں
نظر آتا ہے تماشا جیسا

عرصۂ خواب گزرتا نہیں جو
ہے مری عمر بقایا جیسا

کھیتی باڑی بھی عجب شے ہے ، ظفر
کچھ نہیں پیشہ آیا جیسا

☆

نیا نکور نرالے جیسا
چاند کان کے بالے جیسا

بھرے پُرے دریا کا پانی
باہر وار اُچھالے جیسا

ٹھوکر ایک اچانک جیسی
گرتے سار سنبھالے جیسا

ملاقات بھر مُنہ نہیں کھولی
بند رہ گیا تالے جیسا

ایسا ہی مانوس اجنبی
تھا کوئی دیکھے بھالے جیسا

پھول پھول بکھرا بیٹھا ہُوں
ہار گلے میں ڈالے جیسا

جگہ سے اپنی ہلا نہیں وہ
پڑا رہا پرنالے جیسا

پیاس بڑھا دیتا ہے یکسر
پانی ایک پیالے جیسا

یہاں ظفر سڑکوں، گلیوں میں
وہی ہے دیس نکالے جیسا

☆

جھلملاتے ہوئے تارے جیسا
تھوڑا تھوڑا نہیں ، سارے جیسا

یہ بھنور اور طرح کا ہے کوئی
جہاں پانی ہے کنارے جیسا

ذائقہ ہے کوئی اندر باہر
ایک ہی بار دوبارے جیسا

نیند پتھر کی طرح سخت رہی
خواب تھا نرم نظارے جیسا

حُسن بھی کوئی حجاب آگیں ہے
میں بھی ہوں شرم کے مارے جیسا

ہم نے آخر کو بڑھائی ہے دکاں
نفع تھا یہ بھی خسارے جیسا

بہت اُونچا نہیں معیار اب کے
چاہیے کوئی گزارے جیسا

انتظار اور ابھی کر دیکھو
شعر چمکے گا شرارے جیسا

ہم نے سمجھا نہیں پہلے تو ، ظفر
کام تھا کوئی اشارے جیسا

☆

تھا کوئی خواب پُرانے جیسا
کسی تاریک زمانے جیسا

اعتبار اس پہ اگر کر سکتے
واقعہ ہے جو فسانے جیسا

جانے اس بار لگا ہے مجھے کیوں
تیرا آنا ترے جانے جیسا

یہاں پانا بھی ہے کھونا یکسر
اور ، کھونا کسی پانے جیسا

دُور سے ہاتھ ہلانے میں بھی ہے
ذائقہ ہاتھ ملانے جیسا

اور ، کبھی بات چھپانے میں بھی ہے
اک مزہ بات بتانے جیسا

ایک بستر سا بچھانے کے بعد
ایک پردہ سا گرانے جیسا

کچھ بھروسہ اگر اُس ذات پہ ہو
خرچ کرنا ہے بچانے جیسا

پھیرتا رہتا ہوں دن رات ، ظفر
دل ہے تسبیح کے دانے جیسا

☆

ہم تو ہو کر بہم رُکے ہُوئے ہیں
وہ اگر بیش و کم رُکے ہُوئے ہیں

خلق ساری رواں دواں ہے ، مگر
دہر میں ایک ہم رُکے ہُوئے ہیں

کارواں ہیں قیام پر اپنے
راستے خم بہ خم رُکے ہُوئے ہیں

یہ سفر یوں ہی طے نہیں ہوتا
خُود رواں ہیں ، قدم رُکے ہُوئے ہیں

پہلے رُکتے تھے دیر دیر کے بعد
اور ، اب ایک دم رُکے ہُوئے ہیں

کُچھ نہیں سُوجھتا ہے رُکنے کو
طبع جاری ، قلم رُکے ہُوئے ہیں

ابھی کُچھ اور دیکھ بھال کریں
ابھی اُس کے ستم رُکے ہُوئے ہیں

سارے وعدے وعید ہیں موقوف
اور ، قول و قسم رُکے ہُوئے ہیں

ہے فقیروں کو انتظار ، ظفر
کہیں اہلِ کرم رُکے ہُوئے ہیں

-☆-

دم بہ دم جا بہ جا رُکی ہُوئی ہے
اُس کی آواز پا رُکی ہُوئی ہے

مَیں روانہ ہُوں اک زمانے سے
اور ، میری صدا رُکی ہُوئی ہے

طبع کی کچھ نہیں خبر ہم کو
یہ روانہ ہے یا رُکی ہُوئی ہے

خُوں الگ سے قیام پر ہے یہاں
نبضِ ہستی جُدا رُکی ہُوئی ہے

اب مجھے صبر آ گیا شاید
میری آہ و بکا رُکی ہُوئی ہے

یہ ٹلی تو نہیں ابھی شاید
میرے سر پر بلا رُکی ہُوئی ہے

پیڑ ہیں تر بتر پسینے میں
جانے کب سے ہوا رُکی ہُوئی ہے

کون جانے کہ اتنی اشیا میں
کیا رواں ، اور ، کیا رُکی ہُوئی ہے

پُھول کِھلنے کے منتظر ہیں ، ظفر
راستے میں صبا رُکی ہُوئی ہے

-☆-

راستا اور گھر رکا ہوا ہے
یعنی سارا سفر رکا ہوا ہے

دل دھڑکتا تھا پہلے بھی کم کم
آج تو سربسر رکا ہوا ہے

آپ دریا چلا ہوا ہے کدھر
اور، نجانے کدھر رکا ہوا ہے

شُبہ سا کیوں ہے چلتے رہنے کا
اصل میں کام اگر رکا ہوا ہے

دستکِ خواب اب نہیں ہوتی
سلسلہ دربدر رکا ہوا ہے

انتظار اُس کا ہے زمانوں سے
جو کہیں راہ پر رکا ہوا ہے

ہے رواں یہ ہوا یہاں کب سے
اور، کب سے شجر رکا ہوا ہے

بہت آگے ہے شاعری، لیکن
کہیں پیچھے اثر رکا ہوا ہے

قافلہ کتنی مدّتوں سے، ظفر
چل رہا ہے، مگر، رکا ہوا ہے

☆

سمجھ لو کہ سوتے ہوئے تھک گیا ہوں
میں دراصل ہوتے ہوئے تھک گیا ہوں

نہیں ہے ابھی وقت ہنسنے کا میرا
ابھی تو میں روتے ہوئے تھک گیا ہوں

رکا ہوں کہ مکھن نکلنا ہے اس سے
کہ پانی بلوتے ہوئے تھک گیا ہوں

کوئی فصل اُگنی نہیں ہے یہاں پر
بہت بیج بوتے ہوئے تھک گیا ہوں

نہانا تو قسمت میں شاید نہیں ہے
جو کپڑے ہی دھوتے ہوئے تھک گیا ہوں

گرانا تھا جو راستے میں کسی دن
وہی بوجھ ڈھوتے ہوئے تھک گیا ہوں

وہی سامنے ڈھیر ہے کنکروں کا
یہ موتی پروتے ہوئے تھک گیا ہوں

مجھے ڈھونڈنے کے لیے کوئی نکلے
کہ میں خود کو کھوتے ہوئے تھک گیا ہوں

ظفر، کوئی صورت نکالوں گا اب کیا
کہ مٹی ہی گوتے ہوئے تھک گیا ہوں

☆

بگڑے سنورتے ہوئے تھک گیا ہوں
غلط کام کرتے ہوئے تھک گیا ہوں

سفر پر روانہ ہوں اور راستے میں
بھٹکتے ٹھہرتے ہوئے تھک گیا ہوں

مجھے ڈوبنے دو کہ ان پانیوں میں
میں ناحق ابھرتے ہوئے تھک گیا ہوں

مجھے کام اچھے بھی کرنا ہیں کوئی
کہ تاوان بھرتے ہوئے تھک گیا ہوں

چڑھائی تو مشکل نہیں تھی کچھ اتنی
مگر، میں اترتے ہوئے تھک گیا ہوں

کہیں سبزہ گاہ اور بھی کوئی ہو گی
یہاں چگتے چرتے ہوئے تھک گیا ہوں

نکالوں کوئی اپنے اندر سے سورج
کہ شب بھر ٹھٹھرتے ہوئے تھک گیا ہوں

مجھے لے چلو زندگی میں ہی واپس
کہ میں اب تو مرتے ہوئے تھک گیا ہوں

ظفرؔ، شاید اب کے پلٹ جائے بازی
میں ہر بار ہرتے ہوئے تھک گیا ہوں

☆

---

نہیں یہ کہ چلتے ہوئے تھک گیا ہوں
میں رستے بدلتے ہوئے تھک گیا ہوں

کھلے میں کہیں مجھ کو پھیلاؤ جا کر
کہ خود میں اُبلتے ہوئے تھک گیا ہوں

سُرنگ اب یہی ہو گی میرا ٹھکانہ
میں باہر نکلتے ہوئے تھک گیا ہوں

مجھے برف ہونے سے روکے نہ کوئی
جو آتش اُگلتے ہوئے تھک گیا ہوں

پشیماں نہیں ہوں کسی بات پر میں
بہت ہاتھ ملتے ہوئے تھک گیا ہوں

ہے یہ وقفہ آرام کا بھی ضروری
کہ گرتے سنبھلتے ہوئے تھک گیا ہوں

کھلونے مرے کام کے اب نہیں ہیں
میں ان سے بہلتے ہوئے تھک گیا ہوں

کوئی اور بھی باغ ہو گا یہاں پر
میں اس میں ٹہلتے ہوئے تھک گیا ہوں

ظفرؔ، چاند اونچا بہت ہے سخن کا
میں ناحق اُچھلتے ہوئے تھک گیا ہوں

☆

تری سمت جاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں
کبھی واپس آتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

ہُوا ہے یہی اکثر اوقات ، خُود بھی
کسی کو تھکاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

تھکا ہُوں مَیں کارِ محبت میں کیسا
یہ سب کو بتاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

کوئی تازہ تعمیر مجھ سے نہ ہو گی
کہ ملبہ اُٹھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

سفر کے نہیں میں رہا اب جو قابل
تو رستہ سُجھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

کبھی کوئی مجلس ، کبھی کوئی جلسہ
سو ، دریاں بچھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

مجھے اب تو بننا ہے خُود ہی تماشہ
تماشہ دِکھاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

ذرا دیر رونے کی مُہلت عطا ہو
بہُت دیر گاتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

خوشامد میں پہنچا ہُوں اس حال کو مَیں
ظفرؔ ، مسکراتے ہُوئے تھک گیا ہُوں

☆

# پاکستانی غزل

یہاں کسی کو بھی کچھ حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تُو نہ ملا

ظفر اقبال قیامِ پاکستان کے بعد نُمایاں ہونے والے اُردو غزل گو شعرا میں غالباً سب سے اہم شاعر ہیں۔ یہاں مَیں نے غالباً کا لفظ ان کے متنازع شعری تجربات، مخصوص قسم کے تغزل کو پسند کرنے والے غزل کے سنجیدہ قاری اور مخصوص شاعروں کو سندِ فضیلت عطا کرنے والے تاثراتی ورومانوی نقادوں کی سہولت کے لیے لکھا ہے ورنہ ظفر اقبال کی شاعری کا سنجیدہ، معروضی اور تفصیلی مُطالعہ مندرجہ بالا رائے کی توثیق کرسکتا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ایک رائے جب قائم کر لی جاتی ہے تو اس سے رجوع کرنا ضروری خیال نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک فیض احمد فیض کو رومانوی حقیقت پسندی، ناصر کاظمی کو اداسی کی تہذیب اور منیر نیازی کو تحیر کے بنے بنائے سانچوں سے ہٹ کر سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہی دیوار ظفر اقبال کے سامنے بھی ہے۔ انھیں ''آبِ رواں'' اور ''گلافتاب'' کی اشاعتوں کے بعد بننے والی اس رائے سے باہر نکل کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی گئی کہ ''آبِ رواں'' اعلیٰ شعری تجربات کا اظہار ہے جسے شاعر نے لسانی تشکیلاتی تجربات کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ظفر اقبال جن اعلیٰ شعری امکانات کو دریافت کر سکتے ہیں، انھیں اُنھوں نے لسانی تجربات کی نذر کر دیا۔ تنقیدی حوالے سے ان آرا کی حیثیت ذاتی تاثرات اور تاثرات کی تکرار سے زیادہ نہیں ہے۔ ظفر اقبال کے ان اچھے شعروں کی تعداد جن کی وجہ سے انھیں ''آبِ رواں'' کی اشاعت کے بعد ایک طاقتور شاعر کے طور پر قبول کر لیا گیا تھا، اتنی زیادہ

[illegible] پاکستانی شاعر کے کل کلام سے زیادہ ہے۔ اس لیے ظفر اقبال کی شاعری پر بات کرتے ہوئے غیر ذمہ دارانہ بیانات سے احتراز کرنا چاہیے۔ آپ ان کے لسانی تشکیلاتی تجربے سے متفق نہیں ہیں، نہ سہی! ان کے سہل اسلوب اظہار فن کو بے معنی سمجھتے ہیں، سمجھیں، لیکن تغزل کے کسی بھی معیار پر اعلیٰ شعروں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جن میں بہر حال ''آبِ رواں'' کے بعد تعداد اور معیار دونوں حوالوں سے بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔

اعلیٰ درجے کی شاعری کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ شاعری جو روایت کے تسلسل میں اضافہ کرتے ہوئے تخلیق ہوئی اور دوسری وہ جو مستحکم روایت کی تکرار سے پیدا ہوئی۔ ظفر اقبال کا تعلق پہلی قسم کے شاعروں سے ہے جنھوں نے اپنے دور کی شعری روایت کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے وہ ولی، میر، آتش، غالب، اقبال، یگانہ اور سلیم احمد کی روایت شعر میں اگلا قدم رکھنے والے شاعر ہیں۔ اردو شاعری کے اسالیت میں ولی سے یگانہ تک جو ارتقائی سلسلہ نظر آتا ہے، ظفر اقبال اُسی کی توسیع ہیں۔

ظفر اقبال کے ہاں تین طرح کے شعر ملتے ہیں۔ ایک وہ جو اُنھوں نے کلاسیکی روایت کی توسیع میں کہے۔ دوسرے وہ شعر ہیں جو اُنھوں نے اسلوب کو سہل بناتے ہوئے کہے اور جنھیں عام طور پر معنویت سے تہی قرار دیا جاتا ہے۔ ظفر اقبال جس اسلوب شعر میں قطعاً غیر متنازع ہیں اور جس کے حوالے سے اُنھیں اہم شاعر قرار دیا جاتا ہے، ایسے اشعار ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ یہ شعر ظفر اقبال نے روایت سے منسلک رہتے ہوئے اپنے مخصوص تخلیقی اسلوب میں کہے ہیں۔ ان شعروں کا نہ صرف اسلوب اُن کے باطنی تجربے سے متشکل ہوا ہے بلکہ ان میں زندگی کو دیکھنے کا زاویہ بھی ظفر اقبال سے مخصوص ہے۔ اُنھوں نے زندگی کے محدود اور طے شدہ موضوعات کو اختیار نہیں کیا بلکہ حیات و کائنات کے متنوع پہلوؤں کو گرفت میں لیا ہے۔

جدید عہد کی ٹوٹتی بکھرتی زندگی کو اُردو کے چار جدید شاعروں اقبال، یگانہ، سلیم احمد اور ظفر اقبال نے اپنے اپنے اسلوب تخلیق میں بیان کیا ہے۔ ان چاروں کے ہاں موجود بے اطمینانی اور اس پر غصہ ان کے لب و لہجے کی تشکیل میں اہم ہیں۔ اقبال کے غصے میں حکمت اور جلال، یگانہ کے ہاں تلخی، سلیم احمد کے ہاں طنز اور ظفر اقبال کا غصہ طنزیہ شگفتگی میں ظاہر ہوا ہے۔ وہ زندگی کے بے ڈھنگے پن کو نمایاں کرتے ہیں اور اسے ہنسی میں اُڑا دیتے ہیں۔ اُن کی ہنسی میں درد کی دبی



لہر صاف جھلکتی ہے۔ وہ معاشرے اور زندگی پر ہی نہیں، خود پر بھی ہنس سکتے ہیں۔

ظفر اقبال کم درجے کے قاری کی گرفت میں آنے والا شاعر نہیں ہے۔ اس کی موضوعاتی وسعت اور فنی تجربات کا تنوع عام قاری کے لیے پریشان کن ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ کلیات غیر تربیت یافتہ قاری سے لے کر عام پسند تربیت یافتہ قاری اور زندگی و ادب کو اس کی رنگا رنگی میں پہچان سکنے والے خاص قاری تک ہر قسم کے قاری کے لیے باعثِ کشش ہے۔ ایک طرف اس کے بیسیوں شعر ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور ہر کس و ناکس کے حافظے کا حصہ ہیں تو دوسری طرف کلاسیکی شاعری کے مخصوص تربیت یافتہ قاری کے لیے بھی اس کے کلیات میں شعروں کا وافر ذخیرہ موجود ہے۔

روایت کی تشکیل کرنے والا شاعر تخلیقی تجربات کے اظہار میں بے باک ہوتا ہے۔ وہ اپنے ذہن میں کسی مخصوص قاری کو رکھ کر شعر نہیں کہتا۔ مخصوص شعر کہہ کر رہ جاتا ہے۔ وہ تخلیقی طاقت جو اعلیٰ سے اعلیٰ اور ادنیٰ سے ادنیٰ موضوع اور اظہار دونوں پر قادر ہوتی ہے، بڑے شاعر کو ورثے میں ملتی ہے۔ وہ ہر قاری سے اعتراف عظمت کا متقاضی بھی نہیں ہوتا۔ ہر قاری کلیت میں اُس کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کا اہل بھی نہیں ہوتا۔ اب ظفر اقبال کو ہی لیجیے۔ اُن کی شاعری کے ایک حصے کی مداحی لسانی توڑ پھوڑ اور تجربات پسند قاری کے حصے میں آئی، ایک حصے کو جدیدیت پسندوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک حصہ تک کلاسیکی اسلوب پسندوں کو رسائی حاصل ہوئی۔ ایسے عالم میں قاری اپنی مخصوص پسندیدگی کے حوالے سے ظفر اقبال کو اپنی شاعری کے انتخاب کا مشورہ دیتا ہے۔ یہی صورت آج سے دو سو سال پہلے بھی نظر آتی ہے جب میر کے بہتر نشتروں کی بات کی گئی۔ آج تک یہ بات طے نہیں ہو سکی کہ یہ بہتر نشتر کتنے سو یا کتنے ہزار میں اور کون سے ہیں۔ آج تک میر کے بیسیوں انتخاب ہوئے اور کوئی سے دو انتخاب بھی آپس میں نہیں ملتے۔

آج سے کچھ عرصہ قبل راقم الحروف نے بھی ظفر اقبال کو یہی مشورہ دیا تھا لیکن غور کرنے پر پتا چلا کہ یہ مشورہ ظفر اقبال کو نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ مشورہ خود قاری کے لیے ہے کہ وہ اپنے مخصوص مزاج اور شعری تربیت کے مطابق کلیات ظفر اقبال سے اپنی پسند کے شعر منتخب کر لے۔

ظفر اقبال کے بارے میں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ کرافٹ کا شاعر ہے اور اس کے پاس موضوع نہیں ہے۔ اس غلط فہمی کے پس منظر میں کئی عناصر کارفرما ہیں۔ ایک عنصر تو وہ

شاعر ہیں جنھوں نے کسی مربوط فکر یا نظریے کے حوالے سے شاعری کی۔ اس سلسلے کا پہلا شاعر اقبال ہے اور پھر ترقی پسند شاعروں نے اس روایت کی توسیع میں کردار ادا کیا۔ دوسرا عنصر ظفر اقبال کے وہ شعر ہیں جو کرافٹ کا اظہار ہیں اور جن میں کوئی بڑی معنویت نہیں ہے۔ تیسرا عنصر ظفر اقبال کے وہ شعر ہیں جن میں بعض لمحاتی کیفیات یا ذہنی حالتوں کو گرفت میں لیا گیا ہے۔ چوتھا عنصر ظفر اقبال کے شعر ہیں جن پر فحاشی کا الزام لگایا جاتا ہے اور جو فحاشی سے زیادہ زندگی کے بعض ایسے ناگزیر تجربات کا اظہار ہیں جو اس سے قبل غزل کی شاعری میں کم کم نظر آتا ہے۔

جہاں تک پہلے عنصر کا تعلق ہے، نظریاتی بنیاد پر اعلیٰ شاعری کی اُردو میں واحد مثال اقبال کی شاعری ہے۔ کسی خاص فکر یا نظریے کو پیش نظر رکھ کر شعر کہنا مشکل ترین تجربہ ہے اور کسی ایسے شاعر کے حصے میں آ سکتا ہے جو اس نظریے سے پوری زندگی کو دیکھنے کی اہلیت رکھتا ہو اور وہ نظریہ اُس کی مُعاشرتی اور تخلیقی شخصیت میں یکساں قوت سے شامل ہو۔ دیگر عناصر ایسے قارئین میں التباس پیدا کر سکتے ہیں جنھوں نے ظفر اقبال اور اس سے قبل کی اعلیٰ شاعری کا کلی مُطالعہ نہ کر رکھا ہو ورنہ ہر اعلیٰ درجے کا شاعر زندگی کی رنگا رنگی سے اسلوبیاتی و موضوعاتی تنوع کشید کرتا ہے۔ ظفر اقبال پہلے شاعر نہیں ہیں جنھوں نے اپنے عہد کی زندگی کو کلیت میں موضوع بنایا ہو بلکہ اُن سے پہلے بھی تمام اعلیٰ شاعر یہی کام کرتے رہے ہیں۔ اُن کی شاعری سے کوئی خاص موضوع یا موضوعات برآمد کرنا اس لیے کارلاحاصل ہے کہ کسی خاص موضوع یا موضوعات میں تخصیص پیدا کرنے کے بجائے اپنے عہد کی زندگی کے ہر پہلو اور گوشے پر اُن کی نظر جاتی ہے اور وہ ہر بات کو شعر بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ موجودہ زندگی کے ساتھ ساتھ اُن کے پاس ایسے اشعار کی بھی ایک بڑی تعداد ہے جو کسی خاص عہد کی زندگی کے بجائے انسان کے آفاقی مسائل و مُعاملات کو موضوع بناتے ہیں۔

ظفر اقبال کے بارے میں ایک بات یہ بھی کی جاتی ہے کہ وہ تجربات کے شاعر ہیں۔ اُن کے سروکار شاعری سے زیادہ تجربات اور پھر ان تجربات سے کنارہ کش ہو کر دوسرے تجربات کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور اپنے گزشتہ کام کی طرف پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔ اگر یہ بات ہو بھی تو ظفر اقبال کی خامی نہیں بنتی کیوں کہ کسی بھی شاعر کو مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اپنے ہر تجربے کو ہمیشہ سینے سے لگائے رکھے۔ ظفر اقبال کے سارے ہی تجربے اسلوب کے حوالے سے ہیں اور کم از کم

اُردو شاعری کے پس منظر میں تو یہ بات تیقن سے کی جا سکتی ہے کہ اسلوب کی تشکیل و جستجو میں شعرا نے جو کاوشیں کی ہیں، وہ ہمیشہ کسی نہ کسی طور پر اور کسی نہ کسی سطح پر اُن کی شاعری سے جھلکتی رہی ہیں۔ یہی صورت ظفر اقبال کے اسلوب کے ساتھ بھی ہے۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ظفر اقبال نے نئی لسانی تشکیل کا کام گلافتاب میں کیا اور پھر اگلے مجموعوں میں پلٹ کر بھی اس تجربے کی طرف نہیں دیکھا۔ اس پر ظفر اقبال کا "اب تک" کی ترکیب میں گلافتاب کے ان تجربات سے انحراف مستزاد ہے۔ افسوس کہ ظفر اقبال کے بارے میں دی جانے والی یہ رائے بھی سرسری اور اُن کی شاعری کے کلی مُطالعے کے بغیر قائم کی گئی ہے۔ اُن کی شاعری کا کوئی بھی سنجیدہ قاری مثالوں کے ساتھ یہ بات بتا سکتا ہے کہ نہ تو یہ کام گلافتاب سے آغاز ہوا اور نہ ہی اس کا بعد ختم ہو گیا۔ نئی لسانی مُسافتوں کی تلاش ظفر اقبال کے شعری مزاج کا لازمی حصہ ہے جس کی جھلکیاں اُن کے تمام ہی مجموعوں میں مل جاتی ہیں۔ ایسے معترضین کی آسانی کے لیے مَیں نے اُن کے چند مجموعوں سے صرف ایک ایک شعر منتخب کیا ہے۔ ان چند اشعار میں بھی لسانی مُسافتوں کی کوئی ایک شکل نہیں ہے بلکہ اس میں بھی تنوع ہے۔ ظفر اقبال کا اصل مسئلہ زبان کو وسعت دینے کا ہے تاکہ موضوع کے اظہار میں کوئی رُکاوٹ باقی نہ رہے۔ اُنھوں نے اپنے بیان کے لیے ہر ممکن وسعت کی جستجو کی ہے۔

سخن سرائی تماشا ہے، شعر بندر ہے
شکم کی مار ہے، شاعر نہیں، مچھندر ہے
(آبِ رواں)

جنگل میں جاگنے لگی خشبوئی خراب کی
جھاڑاں گلاب تھی گئے کیکر صندل ہوئے
(گلافتاب)

پالتو ہیں کہ فالتو، مت پوچھ
مَیں کبوتر، چکور، کتا، بھینس
(رطب و یابس)

کچھ اور بھی سپوت تھے حق دار تھے ظفر
میں اپنے آپ اُٹھ کے خزانے سے آ گیا
(غبار آلود سمتوں کا سُراغ)

جھنڈیاں بھی منتظر، بینر بھی تھے سب فرشِ راہ
دیر سے آیا سہی، وہ بے حیا آیا تو ہے
(سرِ عام)

کہاں تک مُفت میں رُسوایئے گا
کسی دن تو بغل گیرایئے گا
(عیب و ہنر)

یہاں سوال کامیابی اور ناکامی کا نہیں، کامیابی اور ناکامی سے ظفر اقبال جیسے شاعروں کو سروکار کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ یہاں اصل بات گھسے پٹے اسالیب سے آگے جا کر نئے اسالیب کی تلاش ہے۔ ویسے بھی ظفر اقبال جیسا سنجیدہ شاعر جب کوئی تجربہ کرتا ہے تو اس کی ناکامی بھی کامیابی ہوتی ہے کیوں کہ ایسا تجربہ بعد میں آنے والوں کے لیے کسی اور تجربے کی بنیاد فراہم کر سکتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ نئے تجربات کے بارے میں کوئی مثبت رائے شاعر کے عہد میں قائم نہیں ہو سکتی کیوں کہ شاعر کا عہد اپنے مخصوص مزاج کے مُطابق اسلوب کا تقاضا کرتا ہے اور نیا اسلوبیاتی تجربہ اس عہد سے زیادہ آنے والے ادوار کی ضرورتوں کو پُورا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میر تک کی پُوری شاعری کو ان کے عہد نے قبول نہیں کیا اور انھیں بہتر نشتر والا شاعر بنا کر رکھ دیا۔ اُن کے بہُت سے تجربوں کو اُن کے بعد کے ادوار نے دریافت کیا اور اُن کی تحسین کی۔ ظفر اقبال کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ کوئی اُنھیں نئی لسانی مُسافتوں کا شاعر سمجھتا ہے، کوئی کرافٹ کا اور کوئی کلاسیکی اسلوب کا اور باقی سرمایے کو رطب و یابس۔ میرے خیال میں اُن کے اس "رطب و یابس" پر آنے والے زمانوں کی نظر ہے اور ظفر اقبال کو اس بات کا احساس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر طرح کی مخالفانہ آرا کے باوصف مُسلسل اپنے کام میں مُنہمک ہیں۔۔۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مخالفانہ رائے کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔

ظفر اقبال ہمارے عہد کے سب سے زندہ شاعر ہیں۔ وہ نہ صرف خود مُسلسل زیرِ بحث رہے ہیں بلکہ اُنھوں نے غزل کو بھی ہمارے ادبی منظر نامے کا حصّہ بنائے رکھا۔ شاعری کے حوالے سے دیکھا جائے تو جدید دور نظم کا دور ہے۔ اس دور میں خالص غزل کے دو ایک شاعر ہی ملتے ہیں۔ ظفر اقبال کا نام ایسے شاعروں میں سرِ فہرست ہے جنھوں نے اس صنفِ سُخن کو جدید عہد میں زندہ رہنے کے لیے خُونِ دل فراہم کیا۔ وہ ایسے شاعر ہیں جن پر بات نہ کسی ایک مضمون میں مُکمل ہو سکتی ہے اور نہ کوئی ایک نقاد اُن پر حرفِ آخر لکھ سکتا ہے۔ مختلف شعر فہم مختلف اوقات اور مختلف زمانوں میں ان پر بات کرتے رہیں گے اور اُن کی شاعری کے مختلف گوشوں تک قاری کی رسائی ممکن بناتے رہیں گے۔

ڈاکٹر ضیاءُالحسن

-☆-

ظفر اقبال ایسا شاعر نہیں جس کے کلام کا ایک سرا پکڑ کر آپ چلتے جائیں اور اختتام تک پہنچ کر کوئی حتمی رائے دیے ہوئے چلتے بنیں۔ وہ اُلجھا دینے والا شاعر ہے۔ اپنے کلام کی مقدار کے حوالے سے بھی اور اس میں موجود رنگا رنگی کے سبب بھی۔ میں اُن کا مداح ہوں اور سنجیدہ قاری بھی۔ 'گلافتاب' سے میری شناسائی پہلے اور "آبِ رواں" سے بعد میں ہوئی۔

'گلافتاب' کی غزل حیران کن حد تک منفرد اور شاندار تھی۔ امیجری اور لفظوں کے ساتھ ظفر اقبال کا برتاو اس قدر انوکھا تھا کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اُردو غزل میں ایک مختلف اور انقلابی شاعر ظاہر ہو چکا ہے۔ بعد میں جب 'عیب و ہنر' شائع ہوئی اور مجھے اس پر مضمون لکھنے کو کہا گیا تو پہلی مرتبہ میں نے قدرے مربوط انداز سے اُن کی شاعری کا مطالعہ بھی کیا اور اس پر غور بھی۔ 'عیب و ہنر' میں نہ آبِ رواں والی روایت کی آب و تاب تھی، نہ گلافتاب والی تازہ دم چمک۔ یہ شاعری ایک طرح کا آمیزہ تھا۔ دونوں ذائقوں کا لیکن غالب ذائقہ آبِ رواں کی غزل کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے شاعر گومگو کی کیفیت میں مبتلا ہے یا پھر اپنے پاس موجود شعری عناصر اور ہنر کو ملا جلا کر دیکھ رہا ہے۔ خود شاعر نے لکھا کہ 'عیب و ہنر' مرتب کرتے وقت وہ انتخاب کے مرحلے سے نہیں گزرے۔ یعنی جو کچھ لکھ دیا، انھوں نے اسے شامل کر دیا، غور کرنے کا معاملہ انھوں نے قاری پر چھوڑ دیا۔ انتخاب کے حوالے سے بعد کے تمام شعری مجموعے مرتب کرتے وقت انھوں نے یہی طرزِ عمل اپنائے رکھا۔ اب جب اُن کا تقریباً سارا "اب تک" کلام یک جا ہو کر سامنے آ رہا ہے، تو اُن کے کلام پر بات کرنا اور بھی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

کچھ باتیں تو بالکل صاف ہیں یعنی قدرتِ کلام میں وہ بے مثال ہیں۔ زبان اور شاعری کی فنی اور ادبی اقدار کے حوالے سے تقریباً بالکل بے عیب۔ مقدار میں اُن کا کوئی ثانی نہیں۔ روانیِ طبع میں ان جیسا کوئی شاعر نہ اُن کے معاصرین، نہ بعد میں آنے والوں میں کوئی دکھائی دیتا ہے۔ تجربات کا انبار انھوں نے لگا دیا ہے، اور غزل کے امکانات کے آخری کناروں تک وہ سفر کر چکے ہیں۔ اُن کا تخلیقی سرچشمہ آج بھی وہی ہے جس کے انکار سے انھوں نے ابتدا کی تھی۔ انھوں نے آبِ رواں میں جو مختلف اور منفرد وراثت روایت کے باطن سے اپنے لیے تلاش کیا تھا، وہ دراصل

دیوسائی دنیا کا بلند ترین مقام ہے۔ میلوں لمبا اور کوسوں چوڑا۔ جولائی اور اگست میں یہاں پھول کھلتے ہیں۔ فرسنگ در فرسنگ ہر رنگ کے پھولوں کے قالین بچھ جاتے ہیں۔ اس میدان میں ندیاں ہیں اور جھیلیں، خوب صورت پرندے ہیں اور لپکتے ہوئے نیلے، ہواؤں کے تخت ہیں اور بادلوں کے محل، آسمان پر در بیچے ہیں اور فضا میں ان دیکھے دیاروں کی خوشبو اور ہر طرف دل گیر آہنیں...... بس یہی ظفر اقبال کی شاعری ہے! اور جب وہ کہتا ہے کہ دھند لکے اور دُھندلا ہٹیں اور ابر آلود تصویریں اور اُلجھے سیدھے مناظر اس نے ہواؤں پر لکھے ہوئے دیکھے ہیں اور دوسروں کو دکھانے چلا ہے تو اصل بات ہی یہ ہے کہ دکھانے کی اس مہم میں جو جان جوکھوں کا کام تھا، وہ سراسر کامیاب ہے۔

بہت سوں نے شعری سفر اس کے ساتھ شروع کیا اور اب وہ متروکاتِ سخن کی طرح تاریخِ ادب کا حصہ ہیں۔ بہت سے اس کے بعد آئے اور اُن کا کہیں نشان نہیں نظر آتا۔ لیکن ظفر اقبال پیش منظر پر اُسی طرح چھایا ہوا ہے جس طرح کہ تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے اور کر رہا ہے، اور مقدار کا یہ عالم ہے کہ اس کا کیسہ بھرا ہوا ہے، اس قدر کہ ہم عصر اُردو شاعر میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ اس گئے گزرے دور میں اس نے نظامی، جامی اور خسرو کے خمسوں اور رومی اور بیدل کے دواوین کی یاد تازہ کر دی ہے۔

"آبِ رواں" پہلی محبت کی طرح ہے۔ بعد کی محبتیں جتنی بھی ہنگامہ خیز ہوں، پہلی محبت کی تازگی، مٹھاس اور کسک ہوں کی توں رہتی ہے۔ "آبِ رواں" کے کتنے ہی اشعار ضرب المثل بن چکے ہیں۔ آغاز اور پختگی کا یہ سنگم اُردو شاعری سے پیار کرنے والوں کے دلوں میں جاگزیں ہے:

ناچیز ہے صد مُہرِ سلیماں مرے نزدیک
بلقیس کے ہونٹوں کا نگیں ہے مرے دل میں

-☆☆-

رونق لگا رکھی ہے، اس عنصر کا بیان خوبی ہے، عیب یا نقص نہیں اور ظفر اقبال کے کلام کا ایک نمایاں پہلو بھی ہے۔ اب اگر بھونڈی نقالی کرتے ہوئے ہمارے کم مایہ شعرا زبان اور مضمون میں "الذکا پن" ڈال کر اس میں جنس کی "چاشنی" مختلف نظر آنے کے لیے ڈال دیتے ہیں تو یہ ان کا بحران ہے، اور اس میں ظفر اقبال کا کیا قصور ہے؟ اور کیا نظریہ ساز ظفر اقبال محض یہی ہے، اور کیا High Seriousness والا کلام اتنی مقدار اور معیار کے باوجود ان کا امتیازی نشان اور لائق تقلید عنصر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مذکورہ بالا عنصر ان کی شعری شخصیت کا محض ایک پہلو ہے، سب کچھ بہر حال نہیں۔ دراصل وہ انحراف اور شرارت کے باوجود اپنی زمین نہیں چھوڑتے یعنی غزل کی روایت کی زمین۔ وہ ہمیشہ اپنے اس مورچے پر ڈٹے رہے ہیں۔ بظاہر غیر سنجیدہ موضوعات کو انھوں نے ہنر مندی اور سنجیدگی سے استعمال کرتے ہوئے، اپنی غزل کو، غزل کی غالب رو سے الگ اور منفرد کیا ہے۔ یہ ان کی قادر الکلامی تو ہے ہی، اس میں تھوڑا اچالاکی کا عنصر بھی دکھائی دیتا ہے۔ اگر مجھ سے پوچھا جائے تو میں کہوں گا کہ بطور نظریہ ساز اور عمل طراز، ان کی حیثیت ایمانی کہیں زیادہ ہے۔ یوں بھی ہمیں اپنی عاقبت کی فکر رہتی ہے اور ظفر اقبال کا کلام بھی گواہی دیتا ہے کہ اپنا ایمان انھیں بہت عزیز رہا ہے۔

ظفر اقبال کیفیت کے شاعر نہیں ہیں۔ کیفیت کی شاعری میں داخل ہونا، اس سے حظ اٹھانا جتنا آسان اور فرحت بخش ہے، اس کے اثرات سے نکل جانا بھی اتنا ہی سہل ہوا کرتا ہے۔ ناصر کاظمی کی غزل دیکھ لیجیے۔ اداسی کی کیفیت تو آخر سے موجود ملے گی۔ اور ہم آسانی سے ان کو سمجھتے چلے جائیں گے۔ اور جب اس کیفیت سے باہر نکل جائیں تو یہ شاعری آپ کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہے۔ اسی طرح منیر نیازی کی شاعری میں موجود اسرار اور خوف و حیرت کی فضا آسانی سے آپ کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور اپنے باطن میں موجود سیدھی راہ سے ادھر ادھر نہیں جانے دیتی۔ ظفر اقبال سیدھی راہ کے شاعر سرے سے ہیں ہی نہیں۔ ان کی بہت کم غزلیں ٹرانس کی غزلیں ہیں۔ ان کا ہر شعری مجموعہ دوسرے سے مختلف اور بعض اوقات متضاد رجحانات کا حامل ہے۔ اس لیے ظفر اقبال کی شاعری میں داخل ہونا دشوار ہے اور داخل ہو کر نکلنا اس سے بھی زیادہ مشکل۔ ظفر اقبال کا کلام، قاری سے محنت اور زیادہ ارتکاز کا تقاضا کرتا ہے۔ تبھی آپ ان کے اصل جوہر تک رسائی بھی حاصل کر سکتے ہیں اور اس سے فیض یاب بھی ہو سکتے ہیں۔ اسی نوع،

اسی پر استقامت سے چپکے رہے ہیں۔ انحراف کے ادوار میں بھی وہ اسی جانب لوٹتے رہے ہیں لیکن دیکھنے والوں کو ان کا یہ عمل بھی شاید ذرا مشکل ہی سے دکھائی دے کیوں کہ تجرباتی کلام میں چمک ہمیشہ زیادہ ہوا کرتی ہے۔ نتیجے کے طور پر ظفر اقبال کی تجرباتی شاعری کو ہی ان کی واحد پہچان گردانا گیا جو صرف جزوی صداقت تھی۔ اور اسی کی تعریف و تقلید کو ان کی پیروی قرار دیا گیا۔ اس غلط فہمی کا بڑے بڑے نامور نقاد بھی شکار ہوئے ہیں اور نئے پرانے لکھنے والے بھی۔ ان کے اسی اسلوب کے جھانسے میں آ کر بہت سوں نے اپنی عاقبت خراب کر لی کیوں کہ ایسے لوگ محض چکالی تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اصل تجربے کا کریڈٹ ظفر اقبال ہی کے پاس رہا۔ جن عناصر کی پیروی عام طور پر کی گئی، انھیں محمد خالد نے روایت کے فانی عناصر قرار دیا ہے۔

> "ظفر اقبال یقیناً روایت کے ابدی اور فانی دونوں قسم کے عناصر کی شناخت رکھتے ہیں اور ان معنوں میں روایت شکن ہیں کہ روایت کے غیر ابدی اور فانی عناصر پر وار کرتے ہیں۔ غیر ابدی عناصر کو گرفت میں لا کر آپ وقتی طور پر تو پذیرائی حاصل کر سکتے ہیں لیکن پذیرائی کا تسلسل آپ کے نصیب میں نہیں آ سکتا۔ وہ تسلسل جسے ظفر اقبال نے حاصل کیا ہے۔"

(محمد خالد۔ فلیپ 'وہم و گمان')

انھی غیر ابدی عناصر کے پجاریوں نے ظفر اقبال کے پیروکاروں کو خراب کیا اور ظفر اقبال کو سرخرو۔ اس نوع کے انحراف کی بابت شمس الرحمٰن فاروقی نے بہت مزے دار بات لکھی ہے:

> "غزل کے مثالی نظریہ ساز اور عمل طراز کا رتبہ ایک حد تک ظفر اقبال کو ملا لیکن ان کی نظریہ سازی اور عمل طرازی کو شیطانی حیثیت حاصل ہوئی، ایمانی نہیں۔"

(شمس الرحمٰن فاروقی: دیباچہ، اب تک، جلد اوّل)

اکثر نئے پرانے شعرا نے اپنی غزل کا ناتا ان 'شیطانی' عناصر سے ہی جوڑا۔ حال آں کہ یہ محض ایک حصہ ہے ظفر اقبال کے کلام کا۔ حقیقت تو یہی ہے کہ ایمانی اور شیطانی عناصر سے ہی فطرت انسانی تشکیل پاتی ہے۔ زندگی کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی اس شیطانی عنصر نے خاصی

# عرضِ ناشر

بہت سے لوگ صاف جھوٹ بولتے ہوئے بار بار "دروغ برگردنِ راوی" کا کلمہ پڑھتے ہیں۔ اور سچ بھی یہی ہے کہ دروغ گوئی کوئی اچھی عادت نہیں، حال آں کہ میرے تئیں اکثر و بیشتر جھوٹ کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ میں کبھی ذاتی منفعت یا خود غرضی کی خاطر کذب یا بہتان کو بروئے کار نہیں لایا، فقط میرا یقین ہے کہ فساد ڈالنے والے سچ سے وہ جھوٹ بہتر ہے جس سے فساد رک جائے، یعنی دروغِ مصلحت آمیز بہ از راستیِ فتنہ انگیز۔ دراصل مجھے کئی قصے بے باق کرنے کی خاطر اس قدر وضاحت کرنی پڑ رہی ہے۔ لگ بھگ دو برس قبل جب میں نے "اب تک" کے عنوان سے تین جلدوں میں کلیاتِ ظفر اقبال شائع کرنے کا اعلان کیا تو میرے نام نہاد دوستوں نے جہاں دل میں بہت ہی بُرا منایا، وہاں میرے منہ پر ٹھٹھا اُڑایا کہ دعوائے باطل ثابت ہوگا، چوں کہ ظفر اقبال کے تو غالباً دس مجموعہ ہائے کلام ہی بمشکل ہوں گے، تو پھر ہر جلد میں چھے چھے مجموعہ ہائے کلام کیوں کر ترتیب پائیں گے، تب اپنے تمام تر وثوق کے باوجود کبھی کبھار میں بھی ان کی تالیفِ قلبی کے لیے اُنھی کے سے انداز میں مضحکہ خیز ہنسی ہنس دیا کرتا، جیسے میں نے واقعی جھوٹ بولا تھا اور کھسیانہ سا ہو گیا ہوں۔ پہلی جلد کی اشاعت کے موقع پر چند ایک کے منہ لٹک گئے اور وہ حسبِ معمول جناب ظفر اقبال کے سامنے ان کی تعریفیں کرتے نہ تھکتے، جب کہ مجھے میرے روبرو کوستے...... لیکن جب دوسری جلد زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی تو بہت سوں کو سچ مچ سانپ ہی سونگھ گیا، وہ جوں ہی تلخ لمحے پر ہوش میں آتے، مجھ پر پھبتی کستے: "چلو اس جلد میں آخری دو مطبوعہ کتب ہی چھپی ہیں، کیوں کہ ہمیں پتا ہے، ظفر اقبال تو خود کو بھی مزید نہیں دہرا سکتے؟" میں ان کی طرف خالی نظروں سے ایسے دیکھتا، جیسے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوں۔ لیکن مجھے بخوبی علم تھا کہ یہ بے چارے عدداً یا وزناً شاعری کے زعم میں اس لیے مبتلا ہیں کہ انھیں اپنے سوا کسی دوسرے کے شاعر ہونے کا وہم تک نہیں۔ تاہم ان میں سے کئی ایک نے جناب ظفر اقبال کے خلاف مدرسانہ تنقید و تنقیص لکھی اور کچھ نے تو نہ چاہتے ہوئے بھی تحسینی و تعریفی مضمون لکھ کر منافقانہ بیعت بھی کر ڈالی۔

البتہ میں نے بطور ناشر اردو ادب کے قارئین و ناقدین و محققین سے جو وعدہ کیا تھا، اس سے بڑھ کر پورا کر دیا ہے، یقیناً میرے نام نہاد دوستوں کے لیے یہ ایک ناقابلِ یقین دعویٰ تھا۔ اور ان کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ دروغ گو را حافظہ نباشد۔ بہر حال مجھے بجا طور پر فخر اور خوشی ہے کہ "اب تک" کی اس تیسری جلد کے ساتھ ہی جناب ظفر اقبال کے چھے مزید غیر مطبوعہ مجموعہ ہائے کلام منصۂ شہود پر آ چکے ہیں،

تجربات کی رنگارنگی نے ظفر اقبال کی غزل کے حوالے سے غزل کو بطور صنف بھی زندہ رکھا ہے۔ اس حقیقت سے انکار شاید ہی کوئی کر سکے کہ غزل کو زندگی بخشنے، اسے مباحث کا موضوع بنائے رکھنے کے لیے جو کام ظفر اقبال نے کیا، بے مثال ہے۔ 60ء کی دہائی میں جب لسانی تشکیلات کا شور بلند ہوا تو نظریہ سازوں میں کوئی غزل گو نہیں تھا بلکہ غزل کو بطور صنف دقیانوسی قرار دے کر رد کر دیا گیا۔ ماڈرن ادیب غزل کو ترک کر دینے کے مفت مشورے ابھی تک دیے جا رہے ہیں۔ اور اس کے جواب میں نئے غزل گو متواتر اپنی تخلیقی توانائیوں سمیت ڈٹے ہوئے ہیں۔ لیکن اوروں کے کام کو ایک طرف رکھ بھی دیں تو اکیلے ظفر اقبال کی غزل ان اعتراضات کا تسلی بخش اور منہ توڑ جواب ہے۔ اور مجھے قطعاً حیرت نہیں ہوتی جب ہمارے یہی ماڈرن ادیب غزل کو تو حقارت سے رد کر دیتے ہیں لیکن ظفر اقبال کو قبول کرنے کے سوا ان کے پاس کوئی چارہ نہیں کیوں کہ ان کی غزل میں وہ مصالحہ وافر مقدار میں موجود ہے، جن کا ہمارے ان معترضین کو چسکا پڑا ہوا ہے۔

ظفر اقبال کے موضوعات کی بات طول کھینچ جائے گی۔ پھر بھی یہاں یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ ان کے موضوعات اتنے ہی متنوع ہیں، جتنی ہماری یہ زندگی۔ اُلجھی ہوئی، پیچیدہ اور کہیں اُداس و پریشان کرتی ہوئی، کہیں مسکراتی ہوئی۔ کہیں وہ ایک ذمہ دار شہری ہیں جسے اس کے اپنے ہی وطن میں بے دست و پا کر دیا گیا۔ کہیں وہ ہوس کے بندے ہیں، تو کہیں نرے عاشق۔ سیاسی، سماجی اور معاشی ناہمواریوں پر کڑھتے، ان پر طنز کرتے ہوئے ظفر اقبال کے ہاں موضوعاتی سطح پر حیرت انگیز ورائٹی موجود ہے۔

موجودہ عہد میں انتخاب کی جتنی ضرورت ظفر اقبال کے کلام کو ہے، شاید ہی کسی اور کو ہو۔ یہ کام شاعر نے خود نہیں کیا تو ظاہر ہے کسی اور ہی کو کرنا پڑے گا۔ لیکن اس کے بغیر بھی، محض سرسری نظر ڈالنے سے بھی یہ نتیجہ نکالنا قطعاً مشکل نہیں ہے کہ ان کے کلام میں جتنی کانٹ چھانٹ بھی کر لی جائے، وہ اتنا پھر بھی ضرور بچ جاتا ہے کہ ان کے معاصرین اور بعد میں آنے والوں میں سے ایک آدھ کو چھوڑ کر شاید ہی کوئی اور شاعر ان کی گرد تک کو بھی پہنچتا ہو!

ابرار احمد

☆

جن میں "مجید"، "اقویم"، "مستقبل"، "تجاوز"، "نوادر" اور "سابقے" شامل ہیں۔ ماضی میں بھی میرے تمام
نہاد دوستوں کو ہی مجھ سے گلہ تھا یا جناب ظفر اقبال کے خفیہ دشمنوں کو مجھ سے شکوہ تھا اور امکان واثق ہے
کہ ایسا مستقبل میں بھی ہوگا، کیوں کہ جلد ہی "اب تک" کی جلد چہارم بھی شائع کر دی جائے گی مگر اس
سے بھی پہلے جناب ظفر اقبال کے ادبی تنقیدی مضامین اور کالموں کی کلیات بعنوان "حالاعرباشنو" کی جلد
اوّل شائع کی جا رہی ہے۔ اور پھر ظفر اقبال کے یہ اٹھارہ مجموعہ ہائے کلام الگ الگ کتب کی صورت میں
بھی طبع ہونے ہیں۔ فقط حسبِ سابق ضرورت اس امر کی ہے کہ میرا یہ جھوٹ بھی از خود سچائی کا روپ دھار
لے، ان شاءاللہ تعالیٰ۔

ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ برصغیر کے دو جید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی اور گوپی چند نارنگ، اپنے
شدید باہمی اختلافات کے باوجود بیک زبان یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس وقت ظفر اقبال ہی برصغیر کا سب
سے بڑا غزل گو ہے۔ لیکن جناب ظفر اقبال کو پھر بھی اصرار ہے کہ ان کا، بلکہ کسی بھی شاعر کا معاصر بوجوہ اس
کے عیب و ہنر کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے جو لوگ اس بات میں دلچسپی رکھتے ہیں، انھیں
انتظار اور طویل انتظار کرنا ہوگا، کیوں کہ ظفر اقبال ابھی شعر کہہ رہے ہیں۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ
بتکرار اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ وہ اپنی شاعری سے ہرگز ہرگز مطمئن نہیں ہیں۔ اور اگر کل کلاں وہ
اپنے سارے کلام ہی کو منسوخ قرار دے ڈالیں تو ناقدین اور ہم آپ ان کا کیا بگاڑ لیں گے؟

میں یہ امید بھی کرتا ہوں کہ جس طرح جناب ظفر اقبال نے ہمیشہ نئے شعرا کی حوصلہ افزائی کی، اب
وہ بھی ان کی تخلیقی قدرت کا اعتراف بہر طور کریں۔ کیوں کہ نہ تو تخلیقی شاعر ہونا سہل ہے اور نہ ہی خیال و الفاظ
کا شعر بن جانا آسان ہے۔ شاید مدرسانہ تنقید سننے یا کرنے والے اس بات کو سہولت سے نہ سمجھ سکیں۔ مجھے
تو ان سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اپنے کسی شعر پر ہی وہ اتنی محنت کر لیا کریں، جتنی کہ وہ ظفر اقبال جیسے نابغۂ
روزگار شعرا کے خلاف ہرزہ سرائی کے دوران کرتے ہیں۔ کم از کم ادب کے دعوے داروں کو غیر ادبی
سرگرمیوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ میری طرح انھیں بھی پتا ہوگا کہ انسان آخر ایک آدھ شعر تو
غلطی سے بھی کہہ ہی لیتا ہے اور بیش تر شعرا سے تو ساری زندگی ایسی کوئی بھی غلطی سرزد نہیں ہوئی، اور بوجوہ نہ
ہی اس کا کوئی آئندہ امکان ہے۔ جیسا کہ ظفر اقبال نے کہہ رکھا ہے:

لگاتے اینٹ ایک آدھ اپنی بھی تعمیر میں کوئی
وہ جن کی عمر گزری ہے مجھے مسمار کرتے میں

میرے خیال میں جناب ظفر اقبال نے تو ہمیشہ تنقید کو خوش آمدید کہا کہ تنقید و تنقیص ایک وقت میں
برابر ہو جاتی ہے اور وہ تو بہت پہلے ہی اس مرحلے سے بھی گزر چکے ہیں۔ خوش رہیے اور پڑھتے لکھتے
رہیے۔

اظہر غوری

ظفر اقبال موجودہ عہد میں اردو غزل کا ایسا دستخط ہے جس کے بغیر اس عہد کی پہچان
ممکن نہیں۔ اردو غزل کے منظر نامے پر ظفر اقبال کے ظہور [illegible]
پڑنے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے جس کی شرر افشانی بعد میں بھی جاری رہی۔ جب چنگاریاں اڑ
رہی ہوں تو تنقید کا دامن جھلس بھی سکتا ہے۔ ظفر اقبال کے معاملے میں یہی ہوا۔ غزل
کی روایت اردو میں فارسی کے بعد بہت قدیم ہے لیکن اس کا آسمان کیسے کیسے چاند ستاروں سے
[illegible]

گوپی چند نارنگ